تعارف اسلام

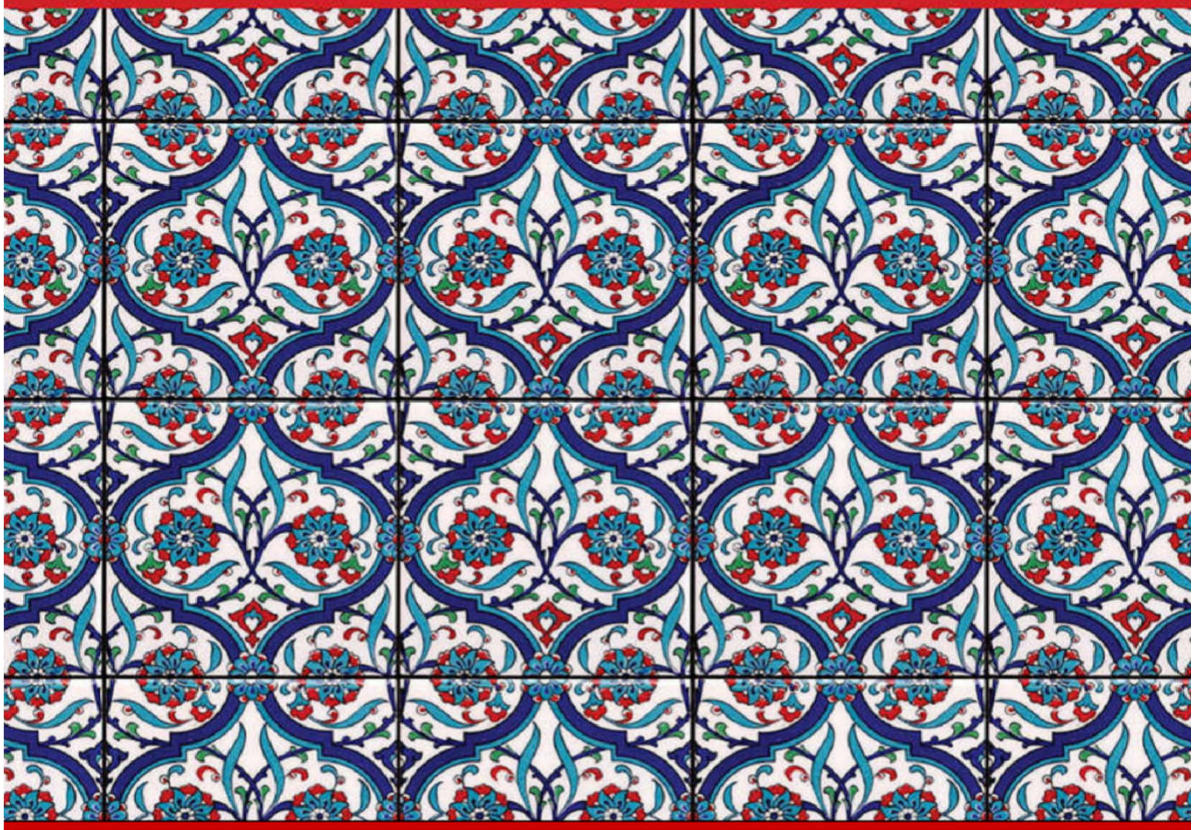

ماجد رشید

حرفِ آغاز

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ اما بعد : فان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الھدی ھدی محمد ﷺ ، شر الامور محدثاتھا و کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار۔

اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کو وجود بخشا اور انسانیت کے وجود کا مقصد اپنی بندگی کو قرار دیا: ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ(الزاریات:56)

ہم نے جنوں اور انسانوں کو اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا۔

لیکن انسان دنیا کی رنگ رنگینیوں اور اپنی نفسانی خواہشات اور شیطانی خیالات میں لگ کر اپنے رب سے غافل ہو گیا اور غیر کو اپنا اور اپنے کو غیر سمجھنے لگ گیا۔ لوگوں کی اسی غفلت کو ختم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ شروع کیا۔ جو مخلوق کو خالق سے ملانے کا ذریعہ بنے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر چلتا رہا، سب سے آخر میں آخری نبی و رسول بن کر آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور انسانیت کو جہنم کے کنارے سے بچا کر جنت کی طرف لے جانا شروع کر دیا۔ آپ ﷺ نے اس مقصد کا حق ادا کیا، بالآخر دنیا میں آپ ﷺ کا مقررہ وقت اختتام پذیر ہوا اور آپ ﷺ کی ختم نبوت کے صدقے آپ ﷺ کا مقصد حیات اور کام ہمارے ذمے لگا۔ اور یہی کام ہماری عظمت اور شان کی روشن دلیل بنا۔

لیکن دنیا کی رنگینیوں اور خوبصورتی نے ہمیں بھی غفلت کی دلدل میں دھکیلنا شروع کر دیا اور ہم مقصد حیات اور اپنی ذمہ داری کو بھول گئے تو دین ہماری زندگیوں اور بالخصوص نوجوان نسل سے نکلنا شروع ہو گیا۔ حتی کہ بات یہاں تک پہنچی کہ ہماری نوجوان نسل کے لئے اچھائی اور برائی میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ مجھے اس بات کا زیادہ اندازہ اس وقت ہوا جب مجھے جوان نسل کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور وقت گزارنے کا موقع ملا۔ میرے خیال میں جوان نسل کے دین سے دور ہونے کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ بے ادبی اور اخلاقی خوبیوں کا فقدان ہے۔ اس لئے میرے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے جوان نسل اس بے دینی کی دلدل سے باہر آسکے۔ اس کام کے لئے اسباق کے دوران ان کی اخلاقی تربیت اور انسانیت کی خدمت اور عظمت کو اجاگر کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ سوچا انسانیت کے لئے کوئی اصلاحی و تحریری کام کیا جائے جس سے عوام الناس کو بالعموم اور جوانوں کو بالخصوص فائدہ ہو۔ پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ تحریری کام کس عنوان اور کس میدان سے شروع کیا جائے۔ تھوڑا وقت گزرنے کے بعد دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ سب سے پہلے بی ایس اور بی بی اے وغیرہ کے طلبہ وطالبات جنہوں نے اپنے نصاب کو تو پڑھنا ہی ہے، اس لئے ایچ ای سی کی آوٹ لائن کے مطابق مختلف کتب کی مدد سے ایک کتاب تیار کی جائے، جو طلبہ کرام کی تعلیم میں ترقی کے ساتھ ساتھ انہیں یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دے کہ ہمیں باعمل مسلمان بننا چاہیے اور ہمیں اپنی عظمت رفتہ کے عود کے لئے اپنا کردار ادا کرنا ہے۔

سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور شانوں والی ذاتِ پاک کی تعریف بجالا تا ہوں جس نے مجھ بندہ ناچیز سے کام لیا اور اللہ تعالیٰ سے میری یہی دعا ہے کہ مجھے ہر کام میں اپنی رضا نصیب کرے اور مجھ سے انسانیت کی اصلاح کا کوئی ایسا کام لے لے، جس سے وہ اور اس کا محبوب ﷺ راضی ہو جائیں۔

میں اس کتاب کی تیاری میں سب سے پہلے اپنے دوست اور بھائی رانا محمد انور فاروق صاحب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، جو اس کتاب کی تیاری میں میرا دایاں بازو بنے رہے، مسلسل مجھے مختلف مشوروں سے نوازتے رہے اور میری مدد کرتے رہے، اللہ تعالیٰ ان کے والد مرحوم کی بخشش فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے، ان کی والدہ صاحبہ کا سایہ تادیر ان کے سر پر قائم دائم رکھے اور ان کی اولاد کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

میں اپنے اہل خانہ اور بچوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جو میری خدمت میں مگن رہے اور وہ وقت جو ان کا حصہ بنتا تھا وہ میری اس کتاب کی تیاری کی نذر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو میرے لیے صدقہ جاریہ بنائے، اللہ تعالیٰ میری والدہ مرحومہ اور ساس مرحومہ کی بخش فرمائے اور میری اس کتاب کو ان دونوں کے لئے صدقہ جاریہ بنائے اور ان کو اپنی رضا عطا فرمائے ۔ بالخصوص اپنے والد محترم رشید احمد ظفر صاحب کا ممنون ہوں جو میری ہر علمی میدان میں حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں، میرے سسر صاحب اور میرے بھائی عابد رشید (جو تقریباً 30 سال سے فالج کے عارضے میں مبتلا ہیں) کو شفائے کاملہ نصیب فرمائے۔ آمین

آخر میں اپنے تمام قارئین سے گزارش کروں گا کہ اس کتاب کو پڑھتے وقت مجھے اپنے جیسا انسان ہی سمجھیے گا۔ میری غلطیوں سے درگزر کر کے ان کی اصلاح کا ذریعہ بنیے گا اور مجھے میری غلطیوں سے آپ ﷺ کے اس فرمان (المؤمن مرآۃ المومن) کی روشنی میں باخبر کیجیے گا، تاکہ میں اپنی اصلاح کر سکوں۔

شکریہ

ماجد رشید

لیکچرر اسلامک سٹڈی، ڈیپارٹمنٹ: ہومینیٹیز اینڈ سوشیل سائنسس

خواجہ فرید یونیورسٹی انفارمیشن اینڈ ٹیکنالوجی، رحیم یار خان، پاکستان

فون نمبر: 0334-6988639

ای میل ایڈریس: majid.rashid444@gmail.com

فہرست

۔1۔ قرآن مجید کا تعارف اور اہم مباحث

۔2۔ منتخب قرآنی آیات مبارکہ

۔3۔ حدیث کا تعارف اور حدیث سے متعلقہ مختلف مباحث

۔4۔ منتخب احادیث

۔5۔ حضور ﷺ کی مکی زندگی اور اس کی خصوصیات

۔6۔ حضور ﷺ کی مدنی زندگی اور اس کے واقعات

۔7۔ خلافت راشدہ اور ان کی خصوصیات اور دورِ بنو امیہ اور بنو عباس

۔8۔ اسلامی فقہ اور فرقہ واریت

۔9۔ اسلامی تہذیب و ثقافت

۔10۔ اسلام کا معاشی نظام اور سود

۔11۔ اسلام کا معاشرتی نظام اور اس کی خصوصیات

۔12۔ اسلام اور سیاست

۔13۔اسلام اور سائنس

۔14۔حوالہ جاتی کتب

سبق نمبر 1

قرآن مجید کا تعارف اور اہم مباحث

وحی

وحی کا لفظی معنی چھپی ہوئی، راز کی بات، خفیہ اور سریع اشارہ کرنا ہے۔ شرعی اصطلاح میں وحی سے مراد وہ کلام الٰہی ہے جو انبیاء ورسل پر نازل ہوتا ہے۔

وحی کی اقسام

وحی متلو:۔ وحی متلو سے مراد قرآن مجید ہے، جس کے الفاظ، مضامین اور معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم3،4)۔

اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے۔ یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔

وحی غیر متلو:۔ وحی غیر متلو سے مراد حدیث رسول ﷺ ہے یعنی الفاظ تو نبی کریم ﷺ کی طرف سے ہوں لیکن مضامین اور معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوں۔

نزول وحی کی صورتیں

۔1۔ القاء فی القلب

القاء فی القلب یعنی دل میں کسی بات کا ڈال دینا اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی شان میں ہے:۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ(سورۃالشوری: 51)۔

اور کسی انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ اس سے (روبرو) بات کرے۔ سوائے اس کے کہ وہ وحی کے ذریعے ہو، یا کسی پردے کے پیچھے سے، یا پھر وہ کوئی پیغام لانے والا (فرشتہ) بھیج دے، اور وہ اس کے حکم سے جو وہ چاہے وحی کا پیغام پہنچا دے۔ یقیناً وہ بہت اونچی شان والا، بڑی حکمت کا مالک ہے۔

۔2۔ سچے خواب

نبیوں آنے والے خواب سچے ہوتے ہیں اور وحی کا حکم رکھتے ہیں۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُـؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (الصفت 102) ۔

پھر جب وہ لڑکا ابراہیم کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو انہوں نے کہا: بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں، اب سوچ کر بتاؤ، تمہاری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے کہا: ابا جان! آپ وہی کیجیے جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ پر وحی کی ابتداء رؤیا صالحہ یعنی سچے خوابوں سے ہوئی، آپ ﷺ جو خواب بھی دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح حقیقت پر مبنی ہوتا (فتح الباری) ۔

۔3۔ فرشتے کا انسانی صورت میں آنا

اس کی دلیل حدیث جبرائیل ہے جو اس بات پر شاہد ہے کہ جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل میں دینی مسائل سکھانے کے لئے آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے تھے۔ کیونکہ جبرئیل علیہ السلام کے باہر جانے کے بعد آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے سوال کیا، اے صحابہ کی جماعت! یہ بتاؤ کہ یہ کون تھے؟ تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ۔

" یہ جبرئیل علیہ السلام تھے جو تمہیں دین کے احکام سیکھانے کے لئے آئے تھے"۔

۔4۔ پس پردہ گفتگو

بعض دفعہ اللہ تعالیٰ نبیوں سے پردے کے پیچھے سے کلام فرماتے ہیں۔ جس طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر جاتے تھے تو اللہ تعالیٰ پردے کے پیچھے سے موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوا کرتے تھے۔

۔5۔ فرشتے کا اپنی اصلی صورت میں آنا

وحی کی یہ صورت معراج کی رات سدرۃ المنتہی کے پاس جبرئیل علیہ السلام کے اپنی صورت میں آنے سے ثابت ہوئی۔ جس موقع پر جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اگر میں نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو جل کر راکھ ہو جاؤں گا۔

۔6۔ گھنٹی کی آواز (جدید دور میں ٹیلی گرام):۔

حدیث عائشہ بخاری شریف میں وحی کی اس صورت کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جس حدیث مبارکہ میں وحی کی مختلف صورتوں کو بیان کیا گیا ہے۔

۔7۔ براہ راست اللہ تعالیٰ کا ہم کلام ہونا

جس طرح معراج کی رات میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کے بارے میں بعض صحابہ کرامؓ کا قول منقول ہے کہ اس موقع پر حضور ﷺ نے براہ راست اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا اور براہ راست اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ سے ہم کلام ہوئے۔

الہامی کتب

۔1۔تورات توریت کا معنی قانون دراصل توریت اس کتاب کا ایک جز ہے، یہودی حضرت موسیٰ علیہ اسلام کی طرف پانچ کتابیں منسوب کرتے ہیں(کتاب پیدائش، کتاب خروج، کتاب قانون، کتاب اعداد وشمار، کتاب تثنیہ) ۔

۔2۔انجیل انجیل کا معنی خوشخبری ہمارے پاس عیسائیوں کے توسط سے جو انجیلیں پہنچیں ہیں وہ ایک نہیں بلکہ چار ہیں۔(انجیل یوحنا، مرقس، لوقا، متی)۔

۔3۔زبور: تورات کے بعد عام طور پر مسلمانوں میں زبور کا نام لیا جاتا ہے۔عہد نامہ عتیق میں جو چیز حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اور جس کو وہ سام یا زبور کے نام سے موسوم کرتے ہیں، وہ کوئی مستقل کتاب نہیں ہے اس میں صرف نظمیں ہیں اور کوئی نیا حکم نہیں ہے۔ نیز جو سرگزشت توریت کی رہی، وہی زبور کی بھی رہی ہے۔

۔4۔قرآن مجید

قرآن مجید کا تعارف

لغوی معنی: ۔قرآن عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بہت پڑھی جانے والی کتاب ہے قرآن کا مادہ " قرء" ہے جسے معنی پڑھنا۔

قرآن کریم کی اصطلاحی تعریف

(الف)ھو کلام اللہ المعجز المنزل علی خاتم الانبیاء والمرسلینﷺ بواسطۃ جبرائیل امین ،المکتوب فی المصاحف المنقول الینا بالتواتر۔

یہ اللہ تعالیٰ کی معجز کتاب ہے، جو خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ پر جبرئیل امین علیہ السلام کے واسطے نازل ہوئی ہے، جو مصاحف میں مکتوب ہے اور تواتر سے ہمیں منقول ہوئی ہے۔

(ب) القرآن هو كتاب الله المنزل على الرسول ﷺ المكتوب فی المصاحف المنقول عنه نجماً نجماً نقلاً متواتراً بلا شبهه فی نقله۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی منزل کتاب ہے جو رسول اکرم ﷺ پر نازل ہوئی ہے اور مصاحف میں مکتوب ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھوڑا تھوڑا منقول ہوئی ہے، اس کے نقل کرنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے (الخیر الکثیر فی مقدمۃ التفسیر از مولانا نور الہادی شاہ منصوری: ۲۳، ۲۴)۔

قرآن مجید کا نزول

قرآن مجید کا زمانہ نزول تقریباً 23 سال ہے، قرآن مجید کا نزول لیلۃ القدر کی رات میں شروع ہوا، سارا قرآن پاک لیلۃ القدر کی رات میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہوا پھر آسمان دنیا سے آپ ﷺ کے قلب اطہر پر ضرورت کے مطابق نجماً نجماً نازل ہوا۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ نے اپنے جلیل القدر نبی حضرت محمد ﷺ پر حضرت جبرائیل کے ذریعے نازل کیا۔

قرآنی سورتوں کی تقسیم بلحاظ نزول (مکی، مدنی):۔

مکی سورتیں: ۔ مکی سورتیں وہ ہیں جن کا نزول ہجرت مدینہ سے پہلے ہوا۔

مدنی سورتیں: ۔ مدنی سورتیں وہ ہیں جن کا نزول ہجرت مدینہ کے بعد ہوا۔

قرآن مجید کی تقسیم بلحاظ ترتیب

قرآن مجید کی دو ترتیبیں ہیں: ۔

۔1۔ ترتیب نزولی

۔2۔ ترتیب توقیفی

جس ترتیب سے قرآن مجید نازل ہوا اسے ترتیب نزولی ہے جیسے ترتیب نزولی میں پہلے سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات کا نزول ہوا۔

قرآن مجید کی موجودہ ترتیب جس کے مطابق اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی کریم ﷺ نے سورتیں اور آیات کو ترتیب دینے کا حکم دیا اسے ترتیب توقیفی کہتے ہیں۔ ترتیب توقیفی میں پہلی سورت سورۃ الفاتحہ ہے اور آخری سورت سورۃ الناس ہے۔

قرآن کریم کے بنیادی مضامین

جمہور کے نزدیک قرآن کریم کے تین بنیادی مضامین ہیں: ۔

۔1۔ توحید

۔2۔ رسالت

۔3۔ آخرت

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے الفوز الکبیر میں قرآن کریم کے مضامین کے بارے میں بیان کیا ہے کہ قرآن کریم کا خلاصہ پانچ مضامین میں منحصر ہے: ۔

۔1۔ علم الاحکام

۔2۔ علم مخاصمہ

۔3۔ علم تذکیر بآلاء اللہ

۔4۔ علم تذکیر بایام اللہ

۔5۔ علم تذکیر بالموت وبما بعد الموت

۔1۔ علم الاحکام

احکام دو قسموں پر مبنی ہیں: پہلے وہ جن کے کرنے کا حکم ہے جیسے فرض، واجب، سنت وغیرہ اور دوسرے وہ جن کے کرنے سے روکا گیا ہے جیسے حرام، ناجائز، مکروہ وغیرہ، چاہے ان دونوں کا تعلق عبادات یا معاملات یا تدبیر منزل اور یا ملکی سیاست سے ہو اور یہ ذمہ داری فقہاء کرام کی ہے کہ وہ حکم کی کیفیت کو بیان کریں گے۔

۔2۔ علم المخاصمہ (علم المناظرہ)۔

قرآن کریم میں جن گروہوں کا رد کیا گیا ہے یا ان سے مناظرہ کیا گیا ہے وہ چار گروہ ہیں: یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافقین۔ یہ کام متکلمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ باطل نظریات کا دلائل کے ذریعے رد کریں۔

۔3۔ علم تذکیر بآلاء اللہ

اس علم میں انسانوں کی اللہ تعالیٰ کی مخلوقات بالخصوص زمین و آسمان کی طرف توجہ مبذول کی گئی ہے اور غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے تاکہ انسان کو یہ یقین کامل حاصل ہو جائے کہ تمام مخلوقات، زمین و آسمان وغیرہ ہر چیز کا خالق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ہر چیز اسی کے حکم کی محتاج ہے۔

۔4۔ علم تذکیر بایام اللہ

قرآن کریم میں دو قسم کے گروہوں کے واقعات کا ذکر ہے ایک ماننے والے اور دوسرے نافرمان۔ جب بھی تاریخ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب آیا تو ماننے والوں کو بچا لیا گیا اور نہ ماننے والے عذاب اور سزا میں گرفتار ہو گئے ہیں اور ان کو صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیا گیا ہے۔ جیسے نا ماننے والوں میں قوم ثمود، لوط، ہود اور قوم نوح وغیرہ کا ذکر اور ماننے والوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ وغیرہ کا ذکر اور ان حضرات کو ماننے والوں کا ذکر کہ وہ عتاب اور سزا سے بچ گئے۔

۔5۔ علم التذکیر بالموت ومابعدہ

اس سے مراد موت اور موت کے بعد پیش آنے والے واقعات ہیں جیسے موت، عالم برزخ، قبر، حشر نشر، قیامت، حساب و کتاب، جزا سزا اور جنت و جہنم کا ذکر ملتا ہے۔

قرآن مجید کی حفاظت

قرآن پاک سے قبل جتنی بھی آسمانی کتابیں نازل ہوئیں تھیں وہ اس وقت اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہیں۔ قرآن کریم ان سب آسمانی کتابوں اور صحیفوں میں آخری کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا، جس طرح سلسلہ نبوت کے آپ ﷺ آخری فرد ہیں اسی طرح قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب، دائمی اور ابدی کتاب ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ص لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (سورة الكهف:27) ۔

(اور (اے پیغمبر) تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے وحی کے ذریعے جو کتاب بھیجی گئی ہے، اسے پڑھ کر سنادو۔ کوئی نہیں ہے جو اس کی باتوں کو بدل سکے، اور اسے چھوڑ کر تمہیں ہرگز پناہ کی جگہ نہیں مل سکتی۔

اس کتاب کا ہر لفظ ہر نقطہ اور ہر زبر زیر 1400 سال گزرنے کے باوجود اپنی اصلی حالات میں محفوظ ہے حالانکہ اس میں تغیر و تبدل کی کوششیں کی گئیں لیکن سب کی سب کامیاب نہ ہو سکیں۔

حفاظتِ قرآن اللہ تعالیٰ کا وعدہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے علاوہ کسی کتاب کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ساتھ ساتھ اس کی زبان اور تعلیمات کو زندہ جاوید بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجر آیت نمبر 9 میں ارشاد فرمایا:۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون (یہ ذکر ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)۔

جمع وتدوین قرآن

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں جمع وتدوین

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں جمع وتدوین

حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں جمع وتدوین

چوتھا اور پانچواں دور (اعراب اور رموزاوقاف کا دور)۔

"قرآن مجید" اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، جو آخری نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی ہے، قیامت تک کوئی اور کتاب نازل نہ ہوگی، یہ زندگی کا وہی دستورِ کہن ہے جو ہمارے آبائے اولین کو ملا تھا، اس میں اصولاً اسی کا اعادہ اور عہد کی تجدید ہے، یہ خدائی عطیہ، ہمارا مشترکہ روحانی ترکہ ہے، جو منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے، اسے دوسری آسمانی کتابوں کا آخری اور دائمی ایڈیشن بھی کہا جاسکتا ہے۔ ابتدائے نزول سے آج تک بلا کسی ادنیٰ تغیر و تبدل کے باقی ہے، اس میں سرِ مو کوئی فرق نہیں آیا، ایک لمحہ کے لیے نہ تو قرآن مسلمانوں سے جدا ہوا اور نہ مسلمان قرآن سے جدا ہوئے، اس میں باطل کے در آنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی کی تائید فرمان باری تعالیٰ سے ہوتی ہے:۔

"لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ "(حم سجدہ)۔

قرآن مجید میں باطل نہ تو سامنے سے آسکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے۔

صرف الفاظ نہیں؛ بلکہ معانی و مطالب کی تشریح و توضیح کی ذمہ داری بھی خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:۔

"ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" پھر ہم پر ہی اس کا بیان (بھی) ہے۔

پہلا دور: عہد نبوی ﷺ میں جمع قرآن

سرور عالم ﷺ نے حفاظت قرآن کے لئے دو ہدایات دیں: ۔۱۔اسے حفظ کیا جائے۔۲۔اس کو لکھا جائے۔

حفظ: وحی کے آغاز سے ہی آپ ﷺ کو قرآن مجید یاد ہونا شروع ہو گیا کیونکہ آپ ﷺ کو یہ تسلی دی گئی: ۔

" سَنُقْرِؤُکَ فَلَا تَنسَی " (سورۃ الاعلیٰ:٦)"ہم آپ کو پڑھوا دیں گے کہ آپ نہیں بھولیں گے"۔

اسے آپ ﷺ کے قلب اطہر پر اتار کر محفوظ کر دیا گیا۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ (القیامۃ: ١٧)۔

"یقیناً اسے جمع کرنا اور اسے پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے"۔

ہر سال جبریل امین کے ساتھ آپ ﷺ نازل شدہ حصے کا باقاعدہ دور بھی کرتے۔ حدیث میں ہے: ۔

أَنَّ جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلاَمُ ـكَانَ يُعَارِضُ النَّبِيَّ ﷺ بِالْقُرآنِ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةٍ، فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الَّذِيْ قُبِضَ فِيْهِ عَارَضَهُ مَرَّتَيْنِ(صحیح بخاری: ۴۹۹۸)۔

جبریل امین ہر سال آپ ﷺ کے ساتھ قرآن مجید کا ایک مرتبہ دور کیا کرتے۔ جس سال آپ ﷺ کا انتقال ہوا، جبریل امین نے آپ ﷺ کے ساتھ دو مرتبہ دور کیا۔

آپ ﷺ نے اس دو مرتبہ دور کے بارے میں فرمایا:۔

إِنَّ جِبْرِيْلَ كَانَ يُعَارِضُنِيْ الْقُرْآنَ فِي كُلِّ سَنَةٍ مَرَّةً، وَإِنَّهُ عَارَضَنِي الْعَامَ مَرَّتَيْنِ، وَلاَ أُرَاهُ إِلاَّ حَضَرَ أَجَلِيْ۔

جبرائیل میرے ساتھ ہر سال قرآن کریم کا ایک مرتبہ دور فرمایا کرتے، اس سال انہوں نے مجھ سے دو مرتبہ دور کیا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ میری موت آنے والی ہے(مسند احمد ٦/٢٨٢، صحیح بخاری: ٣٤٢٦)۔

قرآن مجید کا نزول ضرورت وحاجت کے مطابق تھوڑا تھوڑا ہوتا رہا، کبھی ایک آیت کبھی چند آیتیں نازل ہوتی رہیں، نزول کی ترتیب موجودہ ترتیب سے بالکل الگ تھی، یہ سلسلہ پورے عہد نبوی کو محیط رہا؛ بلکہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری لمحات تک جاری رہا۔ اس لیے آپ ﷺ کے سامنے آج کی طرح کتابی شکل میں منصہ شہود پر آنا مشکل؛ بلکہ ناممکن تھا، ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ ہر آیت کے نازل ہوتے ہی آپ ﷺ لکھوا لیتے تھے اور زمانہ کے لحاظ سے نہایت ہی پائدار چیز پر لکھواتے تھے۔ چنانچہ پورا قرآن مجید بلا کسی کم وکاست کے لکھا ہوا، آپ ﷺ کے حجرۂ مبارکہ میں موجود تھا، اس میں نہ تو کوئی آیت لکھنے سے رہ گئی تھی اور نہ ہی کسی کی ترتیب میں کوئی کمی تھی؛ البتہ سب سورتیں الگ الگ تھیں، اور متعدد چیزوں پر لکھی ہوئی تھیں، کتابی شکل میں جلد سازی اور شیرازہ بندی نہیں ہوئی تھی: ۔

قد كان القرآنُ كُلُّه مكتوباً في عَهْدِه صلى الله عليه وسلم لكن غيرَ مجموعٍ في مَوضِعٍ واحدٍ۔ (الکتابی ج۲ ص۳۸۴ بحوالہ تدوینِ قرآن ص۴۳)۔

پورا قرآن مجید رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں لکھا ہوا تھا، لیکن ایک جگہ جمع نہیں تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کتابی شکل میں جمع کرایا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کی محقق نقلیں تیار کر کے ہر طرف پھیلایا۔ بلکہ پوری امت کو اس پر جمع کیا۔ آج تک قرآن مجید اسی کے مطابق موجود ہے۔

دوسرا دور: عہد صدیقی میں تدوینِ قرآن مجید

ایک موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: ۔

" أعظمُ النّاسِ في المصاحب أجراً أبوبكرٍ، رحمُ الله على أبي بكر، هو أوّلُ مَنْ جَمَعَ كتابَ الله" (الاتقان فی علوم القرآن ۱/۷۶)۔

قرآن مجید کی خدمت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اجر وثواب کے مستحق ابو بکر صدیقؓ ہیں، اللہ تعالیٰ ابو بکر پر رحم فرمائیں کہ وہ اولین شخصیت ہیں، جنہوں نے، جمعِ قرآن کا (مایہ ناز) کارنامہ انجام دیا۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کے زمانے میں مکمل قرآن مجید مختلف چیزوں پر لکھا ہوا تھا، سارے اجزا الگ

الگ تھے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کروانے کا کام حکومتی اور اجماعی طور پر انجام دیا؛ چنانچہ ایسا نسخہ مرتب ہو گیا جس کو سارے صحابہ کرامؓ کی اجماعی تصدیق حاصل ہوئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی خدمت کو حکومت کی طرف سے انجام دینے کا مطالبہ کر رہے تھے، وہ چاہتے تھے کہ خلافت و حکومت اس مہم کو اپنے ہاتھ میں لے اور اپنی نگرانی میں اس کو مکمل کرائے، تاکہ قرآن مجید ضائع ہونے سے بچ جائے اور بعد میں کتاب اللہ میں اختلاف پیدا نہ ہو۔

حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت امام بخاریؒ نے نقل فرمائی ہے، فرماتے ہیں کہ: "جنگ یمامہ" کے فوراً بعد صدیق اکبرؓ نے میرے پاس بلاوا بھیجا، میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں حضرت عمر فاروقؓ بھی موجود تھے، حضرت ابو بکرؓ مجھ سے مخاطب ہوئے کہ: عمرؓ نے ابھی آکر مجھ سے کہا کہ جنگِ یمامہ میں حفاظِ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی ہے، اگر آئندہ لڑائیوں میں بھی اسی طرح حفاظ شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے! لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن مجید جمع کرنے کا حکم دے دیں، میں نے کہا کہ جو کام رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا ہے، وہ ہم کیسے کریں؟ عمرؓ نے جواب دیا کہ بہ خدا! یہ کام بہتر ہے، اس کے بعد عمرؓ بار بار مجھ سے یہ کہتے رہے۔ یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرحِ صدر ہو گیا، اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمرؓ کی ہے۔

"إِنَّکَ رجلٌ شابٌّ عاقلٌ، لا نتَّهِمُکَ، وقد کُنْتَ کتبتَ الوحيَ لرسولِ الله صلى الله عليه وسلم، فَتَتَبَّعِ القرآنَ فاجمعْهُ"۔

واقعہ یہ ہے کہ تم نوجوان، سمجھ دار آدمی ہو، ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، اور تم رسول اللہ ﷺ کے لیے کتابتِ وحی کی خدمت بھی کر چکے ہو اس لیے تم قرآن کریم کو تلاش کر کے جمع کرو۔

حضرت زیدؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے پہاڑ منتقل کرنے کا حکم دیتے تو مجھے اتنا مشکل نہ ہوتا، جتنا جمعِ قرآن کا بار ہوا، میں نے کہا بھی کہ آپ حضرات ایسا کام کیوں کر رہے ہیں، جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا تھا؟ اس پر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ: خدا کی قسم یہ کام بہتر ہے، اور حضرت ابو بکرؓ بار بار یہی دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اس کام کے لیے کھول دیا، جس کام کے لیے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو شرحِ صدر عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ میں نے کھجور کی شاخوں، پتھر کی باریک تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن مجید تلاش کر کے جمع کرنا شروع

کر دیا۔ یہاں تک کہ سورۃ التوبہ کی آیت ''لقد جاء کم رسولٌ مِنْ انفسِکم'' اخیر سورہ تک میں نے صرف حضرت ابو خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس پائی، ان کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں پایا، ان کی تنہا شہادت کو رسول اللہ ﷺ نے دو آدمی کی شہادت کے قائم مقام قرار دیا تھا(صحیح بخاری ۲/ ۷۴۵،۷۴۶)۔

جمعِ قرآن میں حضرت زید بن ثابتؓ کا طریقہ کار

حضرت ابو بکر و عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سب حافظِ قرآن تھے، ان کے علاوہ بھی صحابہ کرامؓ میں حفاظ کی کمی نہیں تھی، اگر حضرت زیدؓ چاہتے تو اپنے حافظہ سے پورا قرآن مجید لکھ دیتے، یا حافظ صحابہ کرامؓ کو اکٹھا کر کے محض ان کے حافظے کی مدد سے بھی قرآن مجید لکھا جا سکتا تھا، اسی طرح محض رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کی لکھی ہوئی آیتوں سے بھی قرآن مجید لکھا جا سکتا تھا۔ لیکن حضرت ابو بکرؓ نے بیک وقت سارے وسائل کو بر روئے کار لانے کا حکم فرمایا، خود بھی شریک رہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی حضرت زیدؓ کے ساتھ لگایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا کہ جن لوگوں نے جو کچھ بھی آیت رسول اللہ ﷺ سے لکھی ہو، وہ سب لے کر آئیں۔ (فتح الباری ۱۷/ ۹) چنانچہ جب کوئی لکھی ہوئی آیت آتی تو بلا چوں و چرا قبول نہ کی جاتی تھی بلکہ اس پر دو گواہی طلب کی جاتی تھی: ۔

''وکان لا یَقْبَلُ مِنْ أحدٍ شیئاً حتی یَشْہَدَ شَاہِدَان''(الاتقان ۱/ ۷۷)۔

اور کسی سے بھی کوئی آیت اس وقت تک قبول نہ کی جاتی تھی جب تک کہ اس پر دو گواہ گواہی نہ دے دیتے (کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھی گئی اور آپ ﷺ کی طرف سے اس کی تصدیق ہو چکی ہے کہ یہ واقعتاً آیتِ الٰہی ہے)۔

نسخۂ صدیق کی خصوصیت

دوسرے صحابہ کرامؓ کے پاس بھی قرآن مجید لکھا ہوا تھا لیکن جن خصوصیات کا حامل حضرت ابو بکر صدیقؓ والا اجماعی نسخہ تھا، ان سے دوسرے سارے نسخے خالی تھے، اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ کے درمیان اُسے '' اُم'' کہا جاتا تھا، اس کی خصوصیات درج ذیل ہیں: ۔

۔۱۔ ہر سورت کو الگ الگ لکھا گیا تھا لیکن ترتیب بعینہ وہی تھی، جو سرکارِ دوعالم ﷺ نے بتائی تھی (فتح الباری ۲۲/۹)۔

۔۲۔ اس نسخہ میں ساتوں حروف جمع تھے، جن پر قرآن مجید کا نزول ہوا (مناہل العرفان ۲۴۶/۱، ۲۴۷) ۔

۔۳۔ یہ نسخہ خط "حِیَرِی" میں لکھا گیا تھا (تاریخ القرآن از مولانا عبد الصمد صارم، ص ۴۳) ۔

۔۴۔ اس میں صرف وہ آیات لکھی گئی تھیں، جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی۔

۔۵۔ اس کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام امت کی "اجماعی تصدیق" سے تیار ہو جائے تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جاسکے (علوم القرآن از مفتی محمد تقی عثمانی ص ۱۸۶) ۔

۔۶۔ اس نسخہ میں قرآن مجید کی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر، ایک ہی جلد میں مجلد کرایا گیا تھا، اور یہ کام حکومت کی طرف سے انجام دیا گیا، جو کام رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہ ہو پایا تھا، (تدوین قرآن ص ۴۰) ۔

وكان القرآنُ فيها مُنْتَشِراً فَجَمَعَها جامعٌ و رَبَطَهَا بخيطٍ۔ (الاتقان ۸۳/۱)۔

اور (رسول اللہ ﷺ کے گھر میں قرآن مجید کی مکمل یادداشتوں کا جو ذخیرہ تھا) اس میں (قرآنی سورتیں) الگ الگ لکھی ہوئی تھیں؛ پس اس کو (حضرت ابو بکرؓ کے حکم سے) جمع کرنے والے (زید بن ثابتؓ) نے ایک جگہ (ساری سورتوں کو) جمع کر دیا، اور ایک دھاگا سے سب کی شیرازہ بندی کر دی۔

قرآن مجید کا یہ متفق علیہ نسخہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس رہا، جب ان کی وفات ہو گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس محفوظ رہا، جب ان کی بھی وفات ہو گئی تو (وصیت کے مطابق) آپ کی بیٹی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ رکھا رہا (صحیح بخاری ۷۴۶/۲)۔

عہدِ عثمانی میں امت کی شیرازہ بندی

جس طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا کارنامہ جمعِ قرآن ہے، اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا کارنامہ پوری امت کو قرآن مجید کے اس متفق علیہ نسخہ پر جمع کرنا ہے جو "عہدِ صدیقی" میں تیار کیا گیا تھا، اس طرح امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھرنے سے انہوں نے بچالیا، اس کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے: ۔

بالکل ابتداء میں مضمون و معنی کی حفاظت کرتے ہوئے الفاظ میں ادنی تبدیلی کے ساتھ پڑھنے کی اجازت بھی دی گئی تھی، (مناہل العرفان) جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور اسلام کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا، تو جن لوگوں نے مذکوہ بالا رعایتوں کی بنیاد پر اپنے اپنے قبائلی اور انفرادی لہجوں یا مختلف متواتر تلفظ کے لحاظ سے قرآن مجید کے مختلف نسخے لکھے تھے، انکے درمیان شدید اختلاف رونما ہو گیا حتی کہ ایک دوسرے کی تکفیر کی جانے لگی، تو صحابہ کرامؓ کے مشورے سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تیار کردہ متفق علیہ نسخہ پر امت کو جمع کیا، اور اس کے علاوہ سارے نسخوں کو طلب کر کے نذرِ آتش کر دیا تاکہ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"، چنانچہ اختلاف جڑ سے ختم ہو گیا (تفصیل کے لے دیکھئے: تدوینِ قرآن ۴۴، ۵۴، تحفۃ الالمعی ۹۵، ۹۴/۷، مناہل العرفان وغیرہ)۔

کام کی نوعیت

حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تیار کردہ نسخہ یہ کہہ کر منگوایا کہ ہم اس سے نقل تیار کر کے اصل آپ کو واپس کر دیں گے، چنانچہ حضرت حفصہؓ نے وہ نسخہ بھیج دیا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے تین قریشی اور چوتھے انصاری صحابیؓ کو پانچ یا سات نسخے لکھنے کا حکم فرمایا، قریشی صحابی میں حضرت عبد اللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبد الرحمن بن الحارث بن ہشام رضی اللہ عنہم تھے اور انصاری صحابی سے مراد حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں۔

ان سب کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے یہ بھی ہدایت دی تھی کہ آپ حضرات کا اگر کسی جگہ رسم الخط میں حضرت زیدؓ سے اختلاف ہو تو اس لفظ کو قریش کے رسم الخط کے مطابق لکھیں اس لیے کہ قرآن مجید قریش کی لغت میں نازل ہوا ہے (فتح الباری ۲۲/۹)۔

عہد عثمانی میں تیار کردہ نسخوں کی خصوصیات

۔۱۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جو نسخہ تیار ہوا تھا، اس میں ساری سورتیں الگ الگ لکھی گئی تھیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام سورتوں کو اسی ترتیب سے یکے بعد دیگرے ایک ہی مصحف میں لکھوایا (فتح الباری ۲۲/۹)۔

۔۲۔ قرآن مجید ایسے رسم الخط میں لکھا گیا کہ ممکن حد تک متواتر قرأتیں سما جائیں (مناہل العرفان ۲۵۳/۱)۔

۔۳۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جن حضرات کو نسخۂ قرآن تیار کرنے کے لیے مامور فرمایا تھا، ان حضرات نے اسی نسخہ کو بنیاد بنایا تھا جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تیار کیا گیا تھا، اسی کے ساتھ مزید احتیاط کے لیے وہی طریقہ اختیار فرمایا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اختیار کیا گیا تھا چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کی متفرق تحریریں جو مختلف صحابہ کرامؓ کے پاس محفوظ تھیں، انھیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ از سر نو مقابلہ کر کے یہ نسخے تیار کیے گئے (علوم القرآن ص ۱۹۱)۔

عہدِ عثمانی میں تیار کردہ نسخوں کی تعداد

اس سلسلے میں دو اقوال ہیں، ایک قول یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے پانچ نسخے تیار کرائے تھے، یہی قول زیادہ مشہور ہے۔ (فتح الباری ۲۴/۹) اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے سات نسخے تیار کرائے تھے، ایک نسخہ مدینہ منورہ میں رکھا گیا، اور بقیہ مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ ور کوفہ میں ایک ایک کر کے بھیج دیا گیا، یہ قول ابن ابی داؤد سے ابو حاتم سجستانیؒ نے نقل کیا ہے (فتح الباری ۲۵/۹)۔

امت میں پائے جانے والے دیگر مصاحف

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے پاس موجود سارے نسخوں کو نذرِ آتش کرنے کا حکم نافذ فرمادیا (فتح الباری ۱۳/۹) تاکہ امتِ مسلمہ ایک رسم الخط پر متفق ہو جائے اور امت کی شیرازہ بندی باقی رہے۔ اس وقت موجود بلا استثناء سارے صحابہ کرامؓ نے حضرت عثمانؓ کے اس کارنامے کی تائید و حمایت کی اور خوب سراہا۔

چوتھااور پانچواں دور (اعراب اور رموزاوقاف کا دور):۔

قرآن کی جمع و تدوین میں چوتھادور وہ ہے جو اعراب اور نقطوں سے متعلق ہے۔ بعض روایات کے مطابق قرآن کریم پر اعراب اور نقطے حجاج بن یوسف نے لگوائے۔ بعض نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کے شاگرد ابوالاسود نے اعراب لگوائے۔ بعض نے نزدیک یہ خدمت خلیل بن احمد نحوی کی ہے۔

قرآن مجید کی خصوصیات

۔1۔ معجزاتی کتاب

قرآن کریم معجزاتی کتاب ہے، اس کی مثل بنانے سے ہر کوئی عاجز ہے۔ قرآن کریم نے اپنے مخالفین کو تین چیلنج کیے لیکن وہ کسی بھی چیلنج کو پورا نہ کر سکے۔

پہلا چیلنج یہ کیا کہ تم کہتے ہو کہ یہ کسی مجنوں اور دیوانے کا کلام ہے، رب کا کلام نہیں تو تم بھی اس کلام جیسا کلام بنا کر دیکھاؤ:۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (سورہ بنی اسرائیل:88)۔

کہہ دو کہ اگر تمام انسان اور جنات اس کام پر اکٹھے بھی ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا کلام بنا کر لے آئیں، تب بھی وہ اس جیسا نہیں لا سکیں گے، چاہے وہ ایک دوسرے کی کتنی مدد کر لیں۔

دوسرا چیلنج یہ کیا کہ چلو قرآن نہیں بنا سکتے تو اس قرآن جیسی دس سورتیں ہی بنا لاؤں لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکے۔ جس کا سورۃ ہود میں یوں ذکر کیا گیا: ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ(سورہ ہود:13)۔

بھلا کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ وحی اس (پیغمبر) نے اپنی طرف سے گھڑ لی ہے ؟(اے پیغمبر ان سے) کہہ دو کہ پھر تو تم بھی اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں بنالاؤ، اور (اس کام میں مدد کے لیے) اللہ کے سوا جس کسی کو بلا سکو بلالو، اگر تم سچے ہو۔

تیسرا چیلنج یہ کیا کہ چلو کچھ نہیں کر سکتے تو قرآن جیسی چھوٹی سے چھوٹی سورت ہی بنالاؤ اور اس کام میں دوسروں سے بھی معاونت حاصل کرنے کی اجازت ہے لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکے۔ جس کا سورۃ البقرہ میں یوں ذکر کیا گیا: ۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ(سورۃ البقرۃ:23)۔

اور اگر تم اس(قرآن) کے بارے میں ذرا بھی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے(محمد (ﷺ) پر اتارا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنالاؤ۔ اور اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلالو۔

۔2۔ فصاحت وبلاغت والی کتاب

قرآن کریم میں اس انداز کی فصاحت اور بلاغت پائی جاتی ہے جیسی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیت اللہ کے ساتھ مختلف سات مشہور شعراء کے سات قصیدے لٹک رہے تھے اور ہر ایک ان کی فصاحت وبلاغت پر فخر کرتا تھا اور اس کلام جیسا کوئی کلام نہ سمجھتا تھا۔ لیکن جب قرآن کریم کی سب سے چھوٹی سورت سورۃ الکوثر کا نزول ہوا تو اس سورت کو ایک صحابی نے بیت اللہ کے ساتھ لٹکا دیا تو جو شاعر آتا اور جب اس سورۃ کو پڑھتا تو اپنے قصیدے کو اس سے کم تر خیال کر کے اپنے قصیدے کو اتار کر لے گیا اور ان شعراء کی زبان پر ایک ہی کلمہ تھا:۔

ما هذا كلام البشر

یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔

۔3۔ زندہ زبان والی کتاب

قرآن کریم زندہ زبان والی کتاب ہے کیونکہ قرآن عربی زبان میں اور عربی زبان ہر دور میں کہی نہ کہی بولی جاتی رہی ہے اور بولی جاتی ہے برخلاف دوسری زبانوں کے ان کا کسی نہ کسی دور میں انقطاع ملتا ہے۔

۔4۔ پر تاثیر کتاب

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ درجہ کی تاثیر رکھی ہے کہ جو کوئی بھی صاف دل سے قرآن پڑھے یا سنے تو قرآن کریم اس پر ضرور اثر کرتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے بارے میں فرمایا کہ اگر ہم پہاڑوں پر بھی قرآن اتارتے تو ان کی کیا حالت ہوتی:۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (سورۃ الحشر: 21)۔

اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارا ہوتا تو تم اسے دیکھتے کہ وہ اللہ کے رعب سے جھکا جارہا ہے، اور پھٹا پڑتا ہے۔ اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔

۔5۔ حفاظت کتاب

سارے نبیوں پر ساری کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی کتاب کی حفاظت کا وعدہ کسی نبی سے نہیں کیا ہے لیکن قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے جس ذکر سورۃ الحجر کی اس آیت کریمہ میں ہے:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (سورۃ الحجر: 9)۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

۔6۔ آخری کتاب

جب آپ ﷺ آخری نبی ہیں تو آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب بھی آخری کتاب ہے۔ جس طرح آپ ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا اسی طرح قرآن کریم آخری کتاب ہے اس کے بعد کوئی کتاب نازل نہیں ہو گی۔

۔7۔ جامع کتاب

قرآن مجید میں ہر چیز کے بارے میں معلومات مل جاتیں، کبھی صراحتاً ذکر ملتا ہے اور کبھی اصول و قوانین مل جاتے ہیں۔ اس کی دلیل سورۃ النحل کی اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوتی ہے: ۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (سورۃ النحل :89)۔

اور ہم نے تم پر یہ کتاب اتار دی ہے تا کہ وہ ہر بات کھول کھول کر بیان کر دے، اور مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوشخبری کا سامان ہو۔

۔8۔ قابلِ حفظ کتاب

قرآن کریم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ کتاب مکمل چھوٹی چھوٹی عمر کے بچوں کو حفظ ہو جاتی ہے بر خلاف دوسری کتب کے وہ اس انداز میں حفظ نہیں ہوتی ہیں۔

سبق نمبر2

منتخب قرآنی آیات مبارکہ... سورۃ البقرۃ اور سورۃ الحجرات کی آیات

Study of selected Text of Holy Quran

سورۃ البقرۃ آیات 282 تا 284

لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (284)۔

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے، اور جو باتیں تمہارے دلوں میں ہیں، خواہ تم ان کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لے گا پھر جس کو چاہے گا معاف کر دے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا (اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تشریح: اس آیت مبارکہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالی کے لئے خاص ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کسی چیز کی تخصیص کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں جن کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ فلاں چیز کو فلاں خصوصیت حاصل ہے۔

تخصیص کی پہلی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کا بنانے والا ہو، جس طرح کوئی شخص کوئی برتن، اوزار اور مشینری بناتا ہے تو اس کے حق میں وہ چیز خاص ہوتی ہے۔

خصوصیت کی دوسری وجہ ملکیت ہوتی ہے جس چیز کا کوئی مالک ہے اسے اس کے ساتھ تخصیص حاصل ہوتی ہے۔

اور تیسری وجہ حق تصرف ہوتا ہے جس شخص کو کوئی چیز تصرف میں لانے کا حق ہوتا ہے تو اس کو بھی خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔

اب ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اللہ تعالی کی کائنات کے ذرہ ذرہ کے ساتھ تخصیص ہے جو ہم ملاحظہ کر سکتے ہیں، مذکورہ تینوں اوصاف اللہ تعالی میں پائی جاتیں ہیں، جن کی بنا پر اسے کائنات کے ذرہ ذرہ کے ساتھ تخصیص حاصل ہے وہ چیز کا بنانے والا بھی ہے جیسے ارشاد ربانی ہے : ۔

" بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ "(البقرۃ:117) کہ زمین آسمان کو پیدا کرنے والی وہی ذات ہے وہی ہر چیز کا صانع ہے۔

"اَلَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ "(سورۃ النمل:88) ہر چیز اللہ تعالی کی کمال صنعت اور کاریگری کا شاہکار ہے خود انسان اللہ تعالی کا بنایا ہوا ہے۔

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ"(سورۃ التین:4) ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا۔

حدیث میں آتا ہے کہ«إِنَّ اللَّهَ يَصْنَعُ كُلَّ صَانِعٍ وَصَنْعَتَهُ»(خلق افعال العباد:46) ہر چیز اور اس کی صنعت کو پیدا کرنے والا اللہ وحدہ لاشریک ہے۔

چونکہ ان تمام چیزوں کا خالق اللہ تعالی ہے۔ اسی نے ہر چیز کو بنایا ہے لہذا ان کا مالک حقیقی بھی وہی ہے"لہ ما فی السموات والارض "کائنات کی تمام چیزیں اس کی مِلک ہیں۔ اللہ کے علاوہ انسان کو جن چیزوں کی ملکیت حاصل ہے یہ عارضی ہے اور اللہ کے حکم کے مطابق ہے۔ حقیقی ملکیت صرف اللہ تعالی کی ہے کیونکہ اللہ تعالی کے حکم سے ہی کسی انسان کی ملکیت قائم رہتی ہے، وہ جب چاہتا ہے کسی سے حق ملکیت سلب کر لیتا ہے اور پھر نہ ملکیت باقی رہتی ہے اور نہ قبضہ۔ انسان خود فنا ہو جاتا ہے اور وہ تمام چیزیں جن پر ملکیت کا دعوی تھا یہیں راہ جاتی ہیں گویا حقیقی مالک بھی ہر چیز کا اللہ ہی ہے۔

تیسری چیز تصرف ہے اور کائنات کے ذرے ذرے پر اللہ تعالی ہی کو کامل اور مکمل تصرف حاصل ہے اگر کسی دوسرے کو تصرف کی اجازت ہے تو وہ خاص وقت تک کے لئے ہے اور عارضی ہے اور وہ اللہ تعالی کی قدرت سے ہی ہے۔ اللہ تعالی کے سوا کسی کو ذاتی تصرف حاصل نہیں چونکہ خلقت، ملکیت اور تصرف کی تینوں صفات اللہ تعالی ہی میں پائی جاتی ہیں۔

اسی لئے فرمایا:" لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ" آسمان وزمین کی ہر چیز اللہ ہی کے لئے ہے۔

آیت مبارکہ کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ۔

”وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ“ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا۔

یہاں پر قابل غور یہ بات ہے کہ کسی اچھے یا برے کام کا مرتکب ہونا اور کسی چیز کا محض دل میں خیال آنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ کسی غلط کام کے کرنے سے محاسبے کا عمل تو ذہن میں آتا ہے مگر محض دل میں کسی خیال کے آجانے سے محاسبہ کیسا ہو گا جب کہ یہ ایک غیر اختیاری چیز ہے۔

اس ضمن میں شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے نفس میں جو چیزیں آتی ہیں، ان کی پانچ قسمیں ہیں: ۔

ان میں سے پہلی چیز اعتقاد ہے انسان کا اعتقاد کیسا ہے وہ توحید پر کاربند ہے یا شرک میں ملوث ہے، اس کے دل میں اخلاص پایا جاتا ہے یا نفاق پر ہے اور پھر یہ بھی کہ اسے اللہ تعالی پر پختہ یقین ہے یا تردد اور شک کا شکار ہے۔ اعتقاد سے متعلق جو کچھ بھی اس کے دل میں پایا جاتا ہے اس کا محاسبہ ہو گا۔ وہ محاسبہ مخلص اور اللہ پر یقین رکھنے والے کے لئے یہ ہے کہ وہ اللہ کے ہاں جزاء پائے گا اور اگر مشرک، منافق یا متردد ہے تو سزا کا مستحق ہو گا۔ بہر حال ہر انسان کا اعتقاد قابلِ محاسبہ اور قابلِ مؤاخذہ ہے۔

دوسری چیز جس پر محاسبے کا دارومدار ہے وہ محبت یا نفرت کا جذبہ ہے، حدیث شریف میں آتا ہے: ۔

"أفضَلُ الأعمال: الحُبُّ في الله والبغضُ في الله"(سنن ابو داؤد، ج7، ص9) ۔

محض اللہ تعالی کی خاطر محبت یا نفرت ہونا اچھے اعمال میں سے ہے ایسا شخص اللہ کے ہاں جزا کا حقدار ہے اور جس کے دل میں جذبہ محبت و نفرت اپنی ذاتی اغراض یا غیر اللہ کے لئے ہے وہ لازماً سزا کا مستوجب ہو گا۔

دوسری حدیث میں فرمایا: ۔

«مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ، وَأَبْغَضَ لِلَّهِ، وَأَعْطَى لِلَّهِ، وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ»(سنن ابو داؤد، ج4، ص220)۔

جس نے اللہ کی خاطر کسی سے محبت کی، اسی کی خاطر نفرت کی، اسی کی خاطر دیا اور اسی کی خاطر عطا کرنے سے ہاتھ کو روک لیا، تو اس نے ایمان مکمل کر لیا۔

مقصد یہ ہے کہ دل میں آنے والے محبت یا نفرت کے جذبات اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابلِ محاسبہ ہیں۔

یہاں تیسری چیز نیت اور عزم ہے، کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق اچھی یا بری نیت قابلِ محاسبہ ہے اگر کوئی شخص اچھائی کا کام کرنے کی محض دل سے نیت کرتا ہے اور ابھی اس پر عمل درآمد شروع نہیں کیا تو اسکو اس سے نیکی حاصل ہو جاتی ہے اور پھر جب نیک عمل کو کر گزرتا ہے تو دس نیکیوں کا حقدار ہو جاتا ہے۔ جہاں تک بری نیت کا تعلق ہے محض نیت پر مؤاخذہ نہیں ہے۔ البتہ جب اس نیت یا ارادے کے مطابق عمل کریگا تو اس کے نامہ اعمال میں صرف ایک ہی برائی لکھی جائیگی اور وہ قابل محاسبہ ہو گا۔

نفس انسانی میں غیر اختیاری طور پر آنے والی چوتھی چیز اخلاق ہے اور اس میں تقوی، زہد، حرص، لالچ وغیرہ آتے ہیں۔ کسی انسان کے اندر جس قدر تقوٰی اور زہد ہو گا اسی قدر اس کے درجات بلند ہوں گے۔ اس کا ہر عمل اس کے تقوٰی اور زہد کے ساتھ پر کھا جائیگا اور اگر کوئی شخص حرص، لالچ یا دیگر قبیح اشیاء کا شکار ہے تو پھر اس کے مطابق اس کا فیصلہ ہو گا۔ بہر حال اخلاق بھی قابل محاسبہ اور قابل مؤاخذہ ہیں۔

پانچویں چیز جس پر محاسبہ انسانی کا انحصار ہے وہ خطرات ہیں جو انسان کے دل میں کھٹکتے رہتے ہیں۔ ان خیالات کی کئی قسمیں ہیں، جن میں سے بعض قابلِ مؤاخذہ ہیں اور بعض پر کوئی گرفت نہیں۔ پہلی چیز ایسا خیال ہے جو انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ فلاں غلط کام کرنا چاہیے مگر فوراً یہ خیال خود بخود چلا جاتا ہے ایسے خیال پر کوئی مواخذہ نہیں اسے "حاجس" کہتے ہیں۔

دوسری قسم کا ایسا خیال ہے جو انسان کے دل و دماغ پر وارد ہو کر کچھ دیر قائم رہتا ہے اور پھر زائل ہو جاتا ہے اسے "خاطر" کہتے ہیں اور اس پر بھی محاسبہ نہیں۔

تیسری قسم کا خیال ایسا ہے کہ جب یہ آتا ہے تو اس سے انسان لطف اندوز بھی ہوتا ہے اس کو "ہم" کہتے ہیں اور ہماری اس امت میں ایسے خیال کا بھی کوئی محاسبہ نہیں۔

چوتھی قسم کا خیال "حدیثِ نفس" ہے کہ انسان خود اپنے دل میں کوئی ایسی ویسی قابل مواخذہ بات کرتا ہے جس پر عمل نہیں کرتا ایسے خیال پر بھی امت محمدیہ پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ اگرچہ سابقہ امتیں قابلِ مؤاخذہ تھیں۔ اس ضمن میں حضرت عیسی علیہ السلام کا قول مشہور ہے کہ ایسے خیالات سے بچا کرو کیونکہ جس گھر میں دھواں اٹھتا ہے وہ اگرچہ جلاتا نہیں مگر گھر کو سیاہ ضرور کر دیتا ہے۔ اس قسم کے خیالات انسان پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ پہلی امتیں اس سے مستثنٰی نہ تھیں تاہم ہماری امت میں اس خیال پر بھی کوئی مواخذہ نہیں۔

ان خطرات کی پانچویں قسم وہ ''عزم اور ارادہ'' ہے جس کے ذریعے انسان برائی پر عملدرآمد میں پختہ ہو جاتا ہے۔ ایسے خیالات کا دل میں آنا قابلِ مواخذہ ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی کہ تم اپنے دل کی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے حساب لے گا تو صحابہ کرامؓ پریشان ہو گئے اور حضور ﷺ سے عرض کیا حضور! (ﷺ) ہم نماز، روزہ، صدقہ، جہاد وغیرہ کی تکالیف برداشت کر سکتے ہیں مگر اب ایک ایسی چیز کا حکم آیا ہے جو ہمارے بس میں نہیں، دل میں خیالات کا آنا ایک ایسی چیز ہے جسے از خود ٹال نہیں سکتے۔ اگر اس پر محاسبہ شروع ہو گیا تو ہمارے لیے کوئی جائے رفتن نہیں ہو گی۔ ہم اللہ تعالیٰ کے ہاں کیسے سرخرو ہوں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، تم اس طرح کے لوگ نہ بنو جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم تھی جنہوں نے کہا تھا **''سمعنا و عصینا''** یعنی ہم نے احکام کو سن لیا مگر ان پر عمل نہیں ہو سکتا بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ مالک الملک کی طرف سے جو بھی حکم آئے گا سر تسلیم خم دو اور اس کے لئے جذبہ اطاعت کا اظہار کرو اور اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا مانگو۔

چنانچہ جیسا کہ اگلی آیت مبارکہ میں آرہا ہے کہ صحابہ کرامؓ ہر حکم کی تصدیق اس طرح کیا کرتے تھے:۔

''سمعنا و اطعنا غفرانک ربنا'' یعنی اے ہمارے رب ہم نے تیرا حکم سن لیا اسکی اطاعت کی، تو ہمیں معاف فرمادے۔

چنانچہ حضور ﷺ نے صحابہ کرام کے سوال کے جواب میں فرمایا:۔

اللہ تعالیٰ میری امت کے دلوں میں آنے والے وسوسوں پر مؤاخذہ نہیں فرمائیں گے بلکہ گرفت ان کی ہے جو دل سے نکل کر زبان پر آجائیں گے یا ان پر عمل درآمد ہو جائے گا۔ جب تک عمل نہیں ہو گا ایسے خیالات پر مؤاخذہ نہیں ہو گا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ باطل اعتقادات، برے اخلاق یا فاسد نیت جو دل میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ کرے گا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اسکی اس طرح توجیہ فرماتی ہیں کہ مؤاخذہ تو ہر چیز پر ہوتا ہے مگر انسان کو جو تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچتی رہتی ہیں وہ ایسے اعمال کا کفارہ بن جاتی ہیں اور انسان محاسبے سے بچ جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جب کسی شخص کو کوئی کانٹا چبھ جائے، ٹھوکر لگ جائے، یا وہ کوئی چیز رکھ کر بھول جائے، تو اس وجہ سے اس کو جو پریشانی لاحق ہوتی ہے وہ اس کی خطاؤں کا کفارہ بن جاتی ہے اور انسان جب دنیا سے جاتا ہے تو پاک صاف ہو جاتا ہے۔

محاسبے کے اس قانون کے باوجود "فیغفر لمن یشاء" اللہ تعالیٰ جسے چاہے معاف کر دے، جس شخص میں بخشش حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہو گی، اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادے گا اور جو سزا کے قابل ہو گا اسے سزا میں مبتلا کر دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ (285)۔

یہ رسول (یعنی حضرت محمد (ﷺ) اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور (ان کے ساتھ) تمام مسلمان بھی، یہ سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان لائیں، کسی پر نہ لائیں) اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: ہم نے (اللہ اور رسول کے احکام کو توجہ سے) سن لیا ہے، اور ہم خوشی سے (ان کی) تعمیل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم آپ کی مغفرت کے طلبگار ہیں، اور آپ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔

اس آیت میں درحقیقت صحابہ کرامؓ کی تعریف فرمائی گئی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ نے صحابہ کرامؓ کا ذکر حضور ﷺ کے ساتھ کر کے یہ بات واضح کر دی کہ صحابہ کرامؓ بھی حضور ﷺ کی طرح ایمان دار تھے اور ان کے ایمان حضور ﷺ کے ایمان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ اگرچہ پیغمبر کا ایمان اکمل درجے کا ہوتا ہے اور صحابہؓ کا ایمان کامل درجے کا ہے مگر دونوں طرح کے ایمانوں کو باہم ملانے سے صحابہ کرامؓ کے درجات کی بلندی کی نشان دہی ہوتی ہے۔

صحابہ کرامؓ کی اس اطاعت گزاری پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ۔

"آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ"

جو چیز رسول ﷺ کی طرف اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی تھی، رسول ﷺ اس پر ایمان لایا اور اس کے ساتھ مومن بھی ایمان لائے۔ یہاں ایک بات ثابت ہوئی کہ شریعت نبی پر نازل ہوتی ہے غیر نبی پر نہیں۔ دوسرے صحابہؓ اس چیز پر ایمان لائے جس پر رسول ﷺ ایمان لائے تو یہ صحابہ کرامؓ کی مدح ہوئی۔ آگے ایمان کے ارکان کا ذکر کیا گیا۔ سب کے سب صحابہ کرامؓ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔

بنیادی طور پر ایمان کے پانچ ارکان ہیں، جن کی دل سے تصدیق کرنا ضروری ہے ورنہ ایمان مکمل نہیں ہو گا۔ یہ ارکان سب سے پہلے اللہ پر ایمان، پھر فرشتوں پر، رسولوں پر، کتابوں پر اور قیامت کے دن پر ایمان لانا ہے۔

شاہ عبد القادرؒ امن کا ترجمہ مان لیا کرتے ہیں یعنی دل سے تسلیم کر لیا، گویا دل سے تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے اگرچہ زبان سے اقرار بھی لازم ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانا بھی لازمی ہے، اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو گا۔ مثلاً کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ہستی کو مانتا ہے مگر توحید کو نہیں مانتا تو وہ ایماندار نہیں ہے یا ایک کی بجائے دو یا تین اِلٰہ مانتا ہے جیسے مجوسی یا عیسائی وغیرہ تو بھی مشرک اور کافر ہو گیا۔ اگر توحید میں کوئی خرابی آئے گی تو انسان کافر ہو جائے گا۔

ایمان کا دوسرا رکن فرشتوں کے وجود پر ایمان لانا ہے۔ پھر فرشتوں کی بہت سی قسمیں ہیں، جیسے ملاء الاعلیٰ، اور ملاء السافل، عرش کے گرد گھومنے والے، علیین میں رہنے والے، آسمانوں پر مقیم اور پھر فضاء میں رہنے والے اور زمین پر رہنے والے یہ فرشتوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ فرشتے لطیف ترین مخلوق ہے، نورانی مخلوق ہے، روح، عقل اور شعور پایا جاتا ہے، وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے رہتے ہیں اور یہ عبادت الٰہی سے نہ تھکتے ہیں، نہ اکتاتے ہیں، وہ معصوم ہیں، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ انہیں جو حکم دیتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرب مخلوق ہے، اللہ تعالیٰ کا جو فیضان کائنات میں پہنچتا ہے وہ انہیں فرشتوں کے ذریعے پہنچتا ہے۔

ایمان کا تیسرا رکن تمام کتابیں جو منزل من اللہ ہیں ان پر ایمان لانا ہے۔ وہ ساری سچی کتابیں ہیں ان کی تعلیمات شک وشبہ سے بالاتر تھیں اور ان کتابوں میں سے آخری کتاب قرآن مجید ہے جو حضور ﷺ پر نازل ہوئی۔

ایمان کا چوتھا جز اللہ تعالیٰ کے تمام رسولوں پر ایمان لانا ہے اس کے بغیر ایمان مکمل نہ ہو گا۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرے گا تو کافر ہو جائے گا۔ آگے رسولوں پر ایمان لانے کا کیفیت کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔

"والیک المصیر" میں ایمان کے پانچویں جز کا بیان کیا کہ تیری طرف لوٹ کر جانا ہے۔ گویا معاد یعنی قیامت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے کہ ایک وقت آئے گا جب قیامت برپا ہو گی پھر سب کو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے اپنے اعمال کا جوابدہی کرنا ہو گی۔ اس کے بغیر بھی انسان کا ایمان مکمل نہ ہو گا۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (286) ۔

اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا، اس کو فائدہ بھی اسی کام سے ہو گا جو وہ اپنے ارادے سے کرے، اور نقصان بھی اسی کام سے ہو گا جو اپنے ارادے سے کرے۔ (مسلمانو اللہ سے یہ دعا کیا کرو کہ) اے ہمارے پروردگار اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ فرمایئے۔ اور اے ہمارے پروردگار ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالیے جیسا آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اور اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیے جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو، اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرمایئے، ہمیں بخش دیجیے اور ہم پر رحم فرمایئے۔ آپ ہی ہمارے حامی و ناصر ہیں، اس لیے کافر لوگوں کے مقابلے میں ہمیں نصرت عطا فرمایئے۔

اس آیت میں حضور نے صحابہ کرامؓ کو تسلی دی ہے کہ غیر اختیاری چیزوں پر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرتا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے ایک عام قانون بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کسی جان کو تکلیف میں نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق، اسی لئے فرمایا کہ انسان کے لئے وہی چیز ہے جو اس نے کمائی اور جو کچھ اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ کمائے گا وہی اس کے لئے مفید ہو گی اور اسی چیز کا اس پر وبال ہو گا۔

نسیان یا بھول ایسی غلطی کا نام ہے جس میں انسانی ارادے کو دخل نہیں ہوتا بلکہ کوئی کام بھول کر ہو جائے اور خطا سے مراد یہ ہے کہ نیت کچھ اور کام کی ہوتی ہے مگر عمل کوئی دوسرا ہو جاتا ہے، مثلاً روزے کی حالت میں کلی کی نیت سے منہ میں پانی ڈالا مگر وہ حلق سے نیچے اتر گیا، کسی شخص نے شکار کے

جانور کے لئے گولی چلائی مگر وہ کسی انسان یا دوسرے جانور کو لگ گئی، یہ خطا ہوتی ہے۔ آخرت میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہو گا، البتہ دنیا میں اس کی دیت اور کفارہ دینا پڑے گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی نسیان اور خطا کے متعلق دعائیہ کلمات سکھائے ہیں۔

اس کے بعد دعا کا اگلا حصہ ہے جس میں فرمایا: اے ہمارے رب تو ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا، جہاں بوجھ سے مراد ہے مشکل احکام ہیں۔ جو پہلی امتوں پر وارد ہوئے۔

وہ سخت احکام جو پہلی امتوں پر فرض تھے، جیسے بنی اسرائیل پر اپنے مال کا چوتھا حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا فرض تھا۔ اور ان کے کپڑے کو جب نجاست لگ جاتی تھی تو اس کو کاٹ دینا پڑتا تھا وغیرہ (المعارف اور المرغی وغیرہ) اور اس عظیم الشان دعا کی تعلیم و تذکیر میں دراصل یہ بشارت ہے کہ اس امت پر اس طرح کے سخت احکام نہیں عائد کئے جائیں گے، جس طرح پہلی امتوں پر عائد کئے گئے تھے، جیسا کہ دوسرے مقام پر اسکی اس طرح تصریح فرمادی گئی ہے: ۔

(وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ) 022:078) یعنی اس نے تم لوگوں پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ بلکہ اس نے اپنے بندوں کو ایسے سہل اور میسور احکام سے نوازا ہے جو عقل سلیم اور فطرت مستقیم کے تقاضوں کے عین مطابق اور دارین کی سعادت و سرخروئی سے سرفرازی کا ذریعہ و وسیلہ ہیں۔

اور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا: "اَلدِّيْنُ يُسْرٌ" یعنی یہ دین بڑا آسان ہے، اس سے اعراض ورُوگردانی دارین کی ہلاکت وتباہی کا باعث ہے۔

سو کافروں کے مقابلے میں حجت وبرہان کے اعتبار سے بھی ہمارا ہمیشہ غلبہ رہے کہ اصل غلبہ یہی ہے جو دل ودماغ اور قلب وضمیر کو اپیل کرتا ہے اور ان کو حق کے آگے جھکنے اور سجدہ ریز ہونے پر مجبور کرتا ہے اور جہاد وقتال کے موقع پر بھی ہمیں ان کے مقابلے میں غلبہ عطاء ہو تا کہ غلبہ ہمیشہ حق ہی کا ہو اور کافر ومنکر حق کے مقابلے میں سرنگوں اور زیر دست ہو کر رہیں۔ سو یہ دعاء ایک عظیم الشان دعا ہے جو حضرت حق جَلَّ مَجْدُہ، نے اپنے خاص فضل وکرم سے اپنے بندوں کو تعلیم و تلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ مسند امام احمد میں حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ

مجھے سورۃ بقرہ کے خواتیم یعنی اس کی یہ آخری آیتیں۔ عرش کے نیچے کے ایک خزانے سے عطاء فرمائی گئی ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ (مسند امام احمد ج ۵ ص ۱۰) اور صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا کہ جس نے سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں رات کو پڑھ لیں تو وہ اس کو کافی ہو گئیں۔ (صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن باب فضل سورۃ البقرہ)۔

اور حضرات علماء کرام اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے یہ دو آیتیں اس شخص کو کافی ہو گئیں ہر شر سے یا یہ کہ یہ اس کو کافی ہو گئیں اس رات کے قیام اور اس کے اجر و ثواب سے۔

سو اس دعا میں تین چیزوں کی دعا و درخواست کی تعلیم و تلقین فرمائی گئی ہے یعنی عفو و درگزر، اور مغفرت و پردہ پوشی، اور رحمت و عنایت سے سرفرازی، سو بندہ اپنے رب کے حضور عرض کرتا ہے کہ رب کریم میری کوتاہیوں اور تقصیرات کو معاف فرما دے، میرے گناہوں کو ڈھانک دے، اور مجھے اپنی رحمت و عنایت سے نواز دے۔ سو بندے کا سارا اعتماد انہی تین چیزوں پر ہونا چاہئے۔

سورۃ الحجرات...1 تا18 آیات

آداب النبی ﷺ اور معاشرتی اصولوں کا ذکر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (1)۔

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ یقیناً سب کچھ سنتا، سب کچھ جانتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حاشیہ فتح الرحمن میں اس سورۃ کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سورۃ میں بعض آداب کی تعلیم دی گئی، مثلاً اللہ اور اس کے نبی کے اوامر و نواہی سے پہلے کوئی بات نہ کی جائے اور نہ نبی کے سامنے آواز بلند کی جائے، کسی فاسق آدمی کی خبر کی تحقیق کر لی جائے۔ بغیر تحقیق ایسی خبر پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔ اگر مسلمانوں کا آپس میں جھگڑا ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرا دینی چاہیے۔ مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ ٹھٹانہ کریں اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کریں، غیبت کی سخت الفاظ میں ممانعت کی گئی ہے اور دوسرے شخص پر بدگمانی کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے، نسب کی وجہ سے دوسرے کو حقیر نہ جاننا اور اپنے نسب پر فخر کرنا قبیح بات ہے اور پھر آخر سورت میں منافقوں کی بعض خصلتوں کا ذکر کر کر زجر و توبیخ کی گئی ہے۔

درحقیقت یہ سورۃ شہری قوانین (CIVIL LAW) پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس آیت میں ارشاد فرمایا: ۔

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے آگے نہ بڑھو۔ اور ان کے حکم پر بلا چون چرا عمل پیرا ہو۔ اپنی خواہشات کو ان کے احکام کے تابع کرو۔

حضرت عبد اللہ بن عباس اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ۔

" لا تقولوا خلاف الکتب و السنۃ"یعنی اللہ اور اس کے نبی کی سنت کے خلاف کوئی کام نہ کرو۔ اس آیت میں دوسرا اصول یہ ذکر کیا ہے:۔

"واتقوا اللہ" اللہ سے ڈرتے رہو، قرآن میں تقوی اختیار کرنے کی بڑی تلقین آئی ہے۔

سورۃ بقرہ میں ارشاد فرمایا کہ تقوی اختیار کرو تاکہ تم فلاح پاجاؤ۔ نیز سورۃ الطلاق میں ارشاد فرمایا کہ جو تقوی اختیار کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے آسانی پیدا کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے یہاں سے اسے گمان نہیں ہوتا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (2)۔

اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند مت کیا کرو، اور نہ ان سے بات کرتے ہوئے اس طرح زور سے بولا کرو جیسے تم ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں، اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے۔

اس آیت مبارکہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نبی کے سامنے اونچی آواز سے نہ بولو جیسا کہ تو ایک دوسرے کے سامنے بلند آواز سے بات کرتے ہو اور اگر تم نے ایسا کیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں اس بات کی خبر بھی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم نبی ﷺ کی مجلس میں ہو تو اس کے آداب کا پورا لحاظ کرو۔ آپ ﷺ کے ساتھ براہ راست گفتگو میں بھی اپنی آواز کو بلند نہ کرو اور اسی طرح آپ ﷺ کی موجودگی میں آپس کی گفتگو میں بھی اپنی آواز کو بلند نہ کرو۔ نیز آپ ﷺ کی احادیث اور فرامین کو پڑھتے اور سنتے وقت بھی اس ادب کو ملحوظ خاطر رکھو۔

امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ، خلفاء، علمائے ربانیین اور اولوالامر حضرات کے ساتھ بھی درجہ بدرجہ ادب سے پیش آنا چاہیے کیونکہ مراتب میں فرق کیے بغیر بہت سی خرابیاں، بگاڑ اور فتنے پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ صحابہ کرامؓ اس آیت کے نزول کے بعد اپنی آوازوں کو بالکل پست کر لیا بلکہ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کی بات کو سمجھنے کے لئے آپ ﷺ کو ان سے بار بار پوچھنا پڑتا تھا۔

حضرت ثابت بن قیسؓ کی آواز قدرتی طور پر بلند تھی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ثابتؓ اپنی آواز کی بلندی کے ڈر سے گھر میں بیٹھ گئے کہی بے ادبی نہ ہو جائے۔ آپ ﷺ کے سمجھانے پر دوبارہ میں مجلس میں آیا کرتے تھے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَى لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ (3)۔

یقین جانو جو لوگ اللہ کے رسول (ﷺ) کے پاس اپنی آوازیں نیچی رکھتے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے خوب جانچ کر تقوی کے لیے منتخب کر لیا ہے، ان کو مغفرت بھی حاصل ہے اور زبردست اجر بھی۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے ادب بجالانے والوں کی تعریف ذکر فرمائی ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کے رسول ﷺ کے پاس اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقوی کے لئے خالص کر لیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش اور بہت بڑے اجر کی خوش خبری ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (4)۔

(اے پیغمبر) جو لوگ تمہیں حجروں کے پیچھے سے آواز دیتے ہیں ان میں سے اکثر کو عقل ہیں ہے۔

ایک دفعہ قبیلہ بنو تمیم کا ایک وفد حضور ﷺ کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا، آپ ﷺ اس وقت ازواجِ مطہرات میں سے کسی ام المومنینؓ کے کمرے میں آرام فرمارہے تھے، جونہی یہ لوگ وہاں پہنچے تو انہوں نے باہر سے آوازیں دینی شروع کر دی" یا محمد اخرج الینا"، یعنی اے محمد! ﷺ ہمارے پاس باہر تشریف لائیں۔

اس آیت مبارکہ میں ان ہی لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ لوگ کمروں کی دیواروں کے پیچھے سے آپ ﷺ کو پکارتے ہیں یہ کچھ سمجھ نہیں رکھتے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کسی اہم کام میں مصروف ہوں یا آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ آرام فرمارہے ہو، فوری طور پر باہر آنا ممکن نہ ہو۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (5)۔

اور اگر یہ لوگ اس وقت تک صبر کرتے جب تک تم خود باہر نکل کر ان کے پاس آجاتے، تو ان کے لیے بہتر ہوا اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔

باہر سے نبی ﷺ کو آوازیں دینے والے لوگ اگر صبر کرتے یہاں تک کہ آپ ﷺ خود ہی ان کے پاس باہر نکل آتے تو یہ بات ان کے حق میں بہتر ہوتی اور ادبِ نبی کے شایاں یہی تھا۔

امام جلال الدین سیوطیؒ، امام قرطبیؒ اور بعض دوسرے مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ جلیل القدر صحابی اور حضور ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ ہی کے حکم کے مطابق حضرت ابی بن کعبؓ کے گھر قرآن سیکھنے کے لئے جاتے تو جا کر آپ کے دروازے پر بیٹھ جاتے یا وہیں کھڑے رہتے۔ آپ نہ تو باہر سے آواز دیتے اور نہ دروازہ کھٹکھٹاتے، پھر جب ابی بن کعبؓ خود گھر سے باہر تشریف لاتے تو ان سے ملاقات ہوتی۔ ایک دفعہ حضرت ابی بن کعبؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ جب آپ آتے ہیں تو دروازے پر دستک دے دیا کریں۔ انہوں نے کہا کہ شیخ، بزرگ یا استاد قوم میں اس طرح ہوتا ہے جس طرح نبی اپنی قوم میں ہوتا ہے اور اللہ کے نبی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر یہ لوگ صبر کرتے یہاں تک کہ نبی ﷺ خود ان کے پاس آتے تو ان کے لئے زیادہ بہتر ہوتا۔ تمام صحابہ کرامؓ کا بھی یہی عمل تھا۔ جیسا کہ فارسی کا مقولہ ہے:۔

باادب شو باادب شو باادب

بے ادب محروم باند از فضل رب

ہمیشہ باادب رہو کیونکہ بے ادب آدمی اللہ کے فضل سے محروم رہتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (6)۔

اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے، تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا بیٹھو، اور پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک شخص ولید بن عقبہ کو قبیلہ بنو مصطلق سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ شخص گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔ جب اس قبیلہ کو حضور ﷺ کے قاصد کی خبر ملی تو وہ اپنے دستور کے مطابق ہتھیار بند کر کے استقبال کے لئے باہر نکلے، اس شخص کی اس قبیلہ سے دیرینہ دشمنی تھی اس نے سمجھا کہ قبیلہ کے لوگ مجھے قتل کرنے کے لئے باہر نکلے ہیں چنانچہ وہ لوگوں کو اس حالت میں دیکھ کر راستے سے ہی مدینہ واپس لوٹ آیا اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس قبیلے کے لوگ تو مجھے قتل کرنے کے لئے نکل آئے تھے، لہذا میں تو جان بچا کر بھاگ آیا ہوں۔ یہ سن کر آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کو سخت غصہ آیا کہ ان لوگوں نے ہمارے نمائندے کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا، آپ ﷺ نے اس قبیلہ کے ایک سرکردہ آدمی کی طرف پیغام بھیج کر تشویش کا اظہار کیا جب اہل قبیلہ کو یہ پیغام ملا تو وہ سخت پریشان ہوئے، اس شخص نے ہمارے استقبال کا مطلب غلط سمجھا، چنانچہ اس قبیلہ کا ایک وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارے حالات سے آگاہ کیا۔ اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر مسلمان بلا تحقیق بنو مصطلق پر حملہ کر دیتے تو دونوں طرف کتنا جانی اور مالی نقصان ہوتا۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تم اس کی تصدیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو جس کی وجہ سے بعد میں تمہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔

موجودہ زمانے میں تباہی اور بربادی کی وجہ اسی ضابطہ پر عمل کا فقدان ہے۔ اخبارات اکثر جھوٹی خبریں شائع کرتیں ہیں، جن سے وجہ سے متعلقہ افراد مشتعل ہو جانا فطری امر ہے۔

وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ (7)۔

اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسول موجود ہیں۔ بہت سی باتیں ہیں جن میں وہ اگر تمہاری بات مان لیں تو خود تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ لیکن اللہ نے تمہارے دل میں ایمان کی محبت ڈال دی ہے، اور اسے تمہارے دلوں میں پرکشش بنا دیا ہے، اور تمہارے اندر کفر کی اور گناہوں اور نافرمانی کی نفرت بٹھا دی ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو ٹھیک ٹھیک راستے پر آ چکے ہیں۔

شاہ عبد القادرؒ لکھتے ہیں کہ اگر تمہارا مشورہ نبی ﷺ کی بارگاہ میں قبول نہ ہو تو تمہیں اس کا برا نہیں ماننا چاہیے کیونکہ اللہ کا رسول تو اللہ کے حکم پر عمل کرتا ہے اور اس عمل میں تمہارا ہی فائدہ ہے اور اس کے برعکس اگر اللہ کا نبی ﷺ بہت سے معاملات میں تمہاری بات کو مانے تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے، مگر اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے دلوں میں محبوب ٹھہرا دیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں کفر، نافرمانی، گناہ سے متعلق نفرت پیدا کر دی ہے جس کی وجہ سے تم ان چیزوں کو ناپسند کرتے ہو اور جن لوگوں میں ایسی صفات پائی جاتیں ہیں وہی لوگ راہ راست پر ہیں۔

فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (8)۔

جو اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت کا نتیجہ ہے، اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔

جس انسان کو برائی سے نفرت ہو اور اچھائی سے محبت ہو اور وہ اچھائی ہی کی طرف داری کرے تو یہ اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں یہ چیزیں ڈال دی ہیں۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ(9)۔

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے کے ساتھ زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ چناچہ اگر وہ لوٹ آئے، تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو، اور (ہر معاملے میں) انصاف سے کام لیا کرو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں کے درمیان صلح کرا دو۔ اگر مسلمانوں کی جماعت میں خلیفہ وقت یا اس کا مقرر کردہ حاکم موجود ہے تو اولین ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے کہ وہ وہ متحارب فریقوں کے درمیان صلح کا بندوبست کرے اور حاکم موجود نہیں ہے تو پھر جماعت

المسلمین کا فرض بنتا ہے کہ وہ دو گروہوں کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑے کو مٹانے کی کوشش کریں۔ کئی مواقع پر مہاجرین اور انصار کے درمیان مخاصمت پیدا ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کے درمیان صلح کر کے جھگڑے کو ختم کیا۔ مدینہ طیبہ میں اوس اور خزرج کے قبائل سینکڑوں سال سے آباد تھے اور ان کی آپس میں دشمنی بھی بڑی پرانی تھی، زمانہ جاہلیت میں ان دو خاندانوں کی آپس میں معمولی معمولی بات پر عرصہ دراز تک لڑائیاں ہوتیں رہیں حتی کہ ایک لڑائی ایک سو بیس سال تک نسل در نسل چلتی رہی۔ حضور ﷺ مدینہ پہنچے تو آپ ﷺ نے ان دو قبیلوں کے درمیان تمام پرانے جھگڑوں کو ختم کر دیا، ان کی دشمنی جاتی رہی اور وہ باہم شیر و شکر بن کر رہنے لگے۔

پھر اگر ان دو لڑنے والوں میں سے ایک گروہ دوسرے پر سرکشی کرے۔ سارے مل کر بغاوت کرنے والے کی سرکوبی کریں یہاں تک کہ سرکشی کرنے والا اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، مطلب یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے فریق کو مجبور کر دو کہ وہ حکم الٰہی کی تعمیل کرے۔ عام طریقے پر صلح نہ ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے زیادتی کرنے والے فریق کو طاقت کے ذریعے مغلوب کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر دوسرا گروہ مغلوب ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرا دو اور صلح کرانے میں انصاف کا دامن چھوٹنے نہ پائے کیونکہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (10)۔

حقیقت تو یہ ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، اس لیے اپنے دو بھائیوں کے درمیان تعلقات اچھے بناؤ، اور اللہ سے ڈرو تاکہ تمہارے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا جائے۔

ان آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں ان کے درمیان صلح ہی ہونے چاہیے۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کافروں سے بھی بدتر سلوک کیا۔ برصغیر میں سوریوں، مغلوں، تغلق خاندان اور دوسرے کے ساتھ اختلافات نے گل کھلائے، عباسیوں، امویوں اور عثمانیوں کے اختلافات نے لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے کیا یہ بھائیوں جیسا سلوک ہے؟

آیت کے آخر میں فرمایا کہ انسان کا تقویٰ ہی اسے صلح پر آمادہ پر آمادہ کر سکتا ہے خوفِ خدا قوانینِ شرع کی پابندی کا احساس دلاتا ہے اس لئے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَى أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (11)۔

اے ایمان والو! نہ تو مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اڑا رہے ہیں) خود ان سے بہتر ہوں، اور نہ دوسری عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اڑا رہی ہیں) خود ان سے بہتر ہوں۔ اور تم ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو، اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا بہت بری بات ہے۔ اور جو لوگ ان باتوں سے باز نہ آئیں تو وہ ظالم لوگ ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ کوئی قوم دوسری قوم سے ٹھٹا نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جن کا تمسخر اڑایا جا رہا ہے وہ تمسخر کرنے والوں سے بہتر ہوں نیز تمسخر اسی صورت میں ہوتا ہے جب تمسخر کرنے والا اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے۔ بہر حال اس مقام پر اللہ تعالیٰ مرد و زن کی اصناف کا الگ الگ ذکر کر کے اس فعل شنیع کی قباحت کو مزید واضح کر دیا۔ شریعت میں تمسخر اور مذاق جائز نہیں ہے البتہ مذاح جائز ہے جس کا مقصد محض خوش طبعی ہو۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا "تداعبنا و انت رسول الله" آپ اللہ کے رسول ہو کر ہم سے دل لگی کرتے ہیں، اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: "لَا اَقُولُ اِلا حَقًّا" یعنی میں حق کے سوا کچھ نہیں کہتا، حضور ﷺ حضرت انسؓ کو "ذَالأُذُنَین" (دو کانوں والے) ازراہِ تفنن کہتے تھے۔ اسی طرح جہاد کے موقع پر سواری مانگنے والے شخص کو کہنا کہ میں تمہیں اونٹنی کے بچے پر سوار کروں گا خوش طبعی کے لئے اور حقیقت پر مبنی تھا۔

اس آیت مبارکہ میں دوسری چیز یہ ذکر کی گئی ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ہی برے القاب سے یاد کرو۔ طعنہ زنی اور عیب لگانا کبھی آنکھوں کے اشاروں سے ہوتا ہے اور کبھی ہاتھ، پاؤں، سر یا دیگر اعضاء کے اشاروں سے بھی ہوتا ہے۔ کچھ خواتین نے حضرت صفیہؓ کو اشارے سے پست قد ہونے کا طعنہ دیا، تو آپ ﷺ اس بات سے سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: ایسی بات غلط ہے اگر اس کو تمام سمندروں میں ملا دیا جائے تو سارے سمندر

کڑوے ہو جائیں۔ کیونکہ یہ سخت حقارت کی بات ہے۔ اسی طرح برے القاب سے دوسروں کو پکارنے سے منع کیا گیا۔ البتہ تعارفی نام لے کر پکارنا جائز ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں ہے " لَو سَخَرتُ بِالکلبِ خَشِیتُ اَن اَکُونَ کَلباً " اگر میں کسی کتے کے ساتھ ہی ٹھٹا کروں تو مجھے ڈر ہے کہ خدا مجھے کتا ہی نہ بنادے۔

آخر آیت میں فرمایا کہ ایمان لانے کے بعد ایماندار پر فسق کا اطلاق کرنا بہت بری بات ہے البتہ اگر کسی سے کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً اس سے باز آجائے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ سے درگزر فرماتے ہیں اور جو علم کے بعد بھی ان گناہوں سے توبہ نہ کرے وہ لوگ ظالم اور بے انصاف ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ (12)۔

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، اور کسی کی ٹوہ میں نہ لگو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو خود تم نفرت کرتے ہو، اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، بہت مہربان ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے تین ضابطے بیان کیے جن پر عمل کرنے سے انفرادی اور اجتماعی نظام درست ہو سکتا ہے اور امورِ سلطنت خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز بدگمانی سے بچنا ہے کیونکہ بعض بدگمانیاں گناہ کے زمرے میں آتیں ہیں۔

امام ابو بکر جصاصؒ لکھتے ہیں کہ گمان کئی قسم کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کسی قسم کی بدگمانی کرنا ممنوع اور حرام ہے اور اللہ کے متعلق اچھا گمان کرنا ہر انسان پر فرض ہے۔

چنانچہ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ۔

" لا یموتن احدکم الا و ھو یحسن الظن باللہ "

تم میں سے کوئی شخص نہ مرے مگر اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو۔

حدیث قدسی ہے: ۔

" اَنَا عِندَ ظَن عبدِی"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوتا ہوں یعنی بندہ میرے بارے میں جیسا گمان کرتا ہے تو ویسا ہی میں کرتا ہوں۔

دوسری چیز جس کا اس آیت میں ذکر ہے وہ دوسروں کے عیب کی ٹوہ میں نہ لگو کیونکہ کسی کا راز تلاش کرنا پھر اسے فاش کر دینا بہت بری بات ہے۔ اس سے دلوں میں کینہ، نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے، جس کا نتیجہ جنگ و جدل کی صورت میں نکلتا ہے۔

تیسری چیز جس کا اس آیت میں ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کی غیبت نہ کریں۔ غیبت یہ ہے کہ اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کے بارے میں ایسی بات کرنا جو اس کے سامنے کی جائے تو اسے اچھی نہ لگے۔ اگر وہ عیب اس کے اندر نہ ہو تو یہ بہتان ہو گا۔ حضور ﷺ نے معراج کی رات غیبت کرنے والوں کو دیکھا کہ وہ اپنے ناخنوں سے اپنے چہروں کو نوچ رہے تھے۔

غیبت کی برائی کو بیان کرتے ہوا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے مردہ بھائی کے گوشت کو کھانا پسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر کوئی اس کو ناپسند کرے گا۔ غیبت کرنا اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (13)۔

اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو، در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔ یقین رکھو کہ اللہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز سے باخبر ہے۔

اس آیت مبارکہ میں یہ بات واضح الفاظ میں بتادی ہے کہ انسان خواہ کیسی رنگ اور نسل کے ہوں، کسی ملک کے رہنے والے ہوں یا کوئی زبان بولتے ہوں، وہ سارے کے سارے ایک مرد اور ایک عورت یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کی اولاد ہیں۔ اسی جوڑے سے نسل انسانی کو تخلیق کیا جو آئندہ بھی تا قیامت پھیلتی رہے گی، اب کوئی سید ہے یا پٹھان، مغل بنے یا صدیقی یا فاروقی وغیرہ مگر حقیقت میں سب ایک ہی جوڑے کی اولاد

ہیں۔اس قول سے کئی باطل مذاہب کی تردید ہوگئی، مثلاہنود چار ذاتوں کے قائل ہیں۔ پھر فرمایاخاندانوں اور قبیلوں کا مقصد محض تعارف ہے۔ تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔

ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال نے بھی کہا ہے:۔

بتانِ رنگ وبو کو چھوڑ کر ملت میں گم ہو جا

نہ تورانی رہے باقی، نہ افغانی نہ ایرانی

رنگ و نسل کا یہ تفاوت سرخ، سفید، زرد اور سیاہ رنگ کے بت ہیں اور اس بت پرستی میں مشرق و مغرب کے لوگ بھی شامل ہیں، کوئی جاہلیت کی وجہ سے، کوئی نخوتِ جاہلی کی وجہ سے۔

حضرت ملا جامیؒ نے کہا ہے:۔

بندہ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

جب تو عشق کا بندہ یعنی ایماندار بن گیا ہے، خدا کی واحدنیت اور نبی کی نبوت ورسالت پر ایمان لے آیا ہے تو پھر نسب کو ترک کر دے، اس میں دلچسپی نہ لے، کیونکہ اس راہ میں فلاں ابنِ فلاں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (14)۔

یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ: ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ: تم ایمان تو نہیں لائے، البتہ یہ کہو کہ ہم نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم واقعی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروگے تو اللہ تمہارے اعمال(کے ثواب) میں ذرا بھی کمی نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔

اس آیت مبارکہ میں ان لوگوں کا شکوہ کیا گیا ہے جو ایمان کا دعوی تو کرتے ہیں لیکن ایمان ان میں پورے طور پر راسخ نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ سے خطاب فرمایا کہ ایسے ایمان کے دعوے داروں کو جواب دے دیں کہ تم یہ نہ کہو کہ ایمان لائے ہو بلکہ تم کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں کیونکہ ایمان پورے طور پر تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اس لئے کہ جب ایمان کسی کے دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو وہ ایمان کا دعوی نہیں کرتا۔ اگر تم حقیقت میں ایمان والے بن جاؤ اور ایمان کے تقاضوں پر عمل کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کے اجر میں کمی نہیں کرے گا بلکہ ان کا اجر بڑھا چڑھا کر دے گا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (15)۔

ایمان لانے والے تو وہ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کو دل سے مانا ہے، پھر کسی شک میں نہیں پڑے، اور جنہوں نے اپنے مال و دولت اور اپنی جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا ہے۔ وہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں حقیقت میں ایمان لانے والوں کی نشانی بیان کی ہے کہ وہ دل سے اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کا اقرار زبان سے اور تصدیق دل سے کرتے ہیں۔ دین کی کسی بات میں شک کا شکار نہیں ہوتے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ اپنی جان اور مالوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں۔ سچا ایماندار کبھی جہاد سے پیچھے نہیں ہٹتا اور منافق آدمی ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس آدمی میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہی سچے لوگ ہیں نیز یہ صفات حضور ﷺ کے صحابہ کرامؓ میں بدرجہ اتم پائی جاتیں تھیں۔

قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (16)۔

(اے پیغمبر! ان دیہاتیوں سے) کہو کہ: کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ ان تمام چیزوں کو خوب جانتا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور اللہ ہر چیز کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں یہ بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر آدمی کی نیت اور ارادے سے واقف ہے، کون صحیح معنوں میں ایماندار ہے اور کون تردد میں ہے وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو اپنی ایمانداری کے بارے میں بتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو دلوں تک کی باتوں سے واقف ہے اور ہر کسی کی دینداری کس معیار کی ہے وہ جانتا ہے اس لئے تمہیں اپنے ایمان کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (17)۔

یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ یہ اسلام لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ: مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ جتلاؤ۔ بلکہ اگر تم واقعی (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک شکوے کو بیان کیا کہ بعض قبائل نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ہم تو مسلمانوں سے لڑے بھڑے بغیر اسلام لے آئے، حالانکہ لوگوں نے بڑی جنگیں لڑی آخر کار جب مغلوب ہو گئے تو ایمان لے آئے۔ اس آیت مبارکہ میں ایسے لوگوں کو جواب دیا گیا کہ تم اپنے اسلام لانے کو بطور احسان کے بیان نہ کرو بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت اور کرم ہوا جس نے تمہیں ایمان کی دولت سے مالا مال کیا۔ کیونکہ بادشاہ کی خدمت گزاری کا احسان نہیں جتلایا جاتا بلکہ احسان تو کا مانو کہ اس نے تمہیں خدمت کا موقع فراہم کیا۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (18)۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ بات کو خوب جانتا ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔

اس سورۃ مبارکہ کی آخری آیت مبارکہ میں مختلف احکام بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ چاہے نبی ﷺ کی بے ادبی کے مرتکب ہو، فتنہ فساد کا ذریعہ بنے ہو، کسی کا مذاق اڑایا ہو، کسی کی غیبت کی ہو، کسی کے عیبوں کی تلاش میں لگے ہو، کسی کو طعنہ دیا ہو، برے القاب سے یاد کیا ہو، تکبر کا شکار ہوئے ہو یا تمہارے ظاہر اور باطن میں تضاد ہو۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے تمہارا کوئی عمل چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، ظاہر ہو یا چھپا ہوا ہو۔ وہ اس سے واقف ہے۔ اسی کے مطابق تمہیں جزاء یا سزا ہو گی، اس لئے تم ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھنا کہی وہ تمہاری ہلاکت کا سبب نہ بن جائے۔

سبق نمبر 3

حدیث کا تعارف اور حدیث سے متعلقہ مختلف مباحث

حدیث کی لغوی تعریف

حدیث کے معنی بات اور گفتگو کے ہیں، علامہ جوہری صحاح میں لکھتے ہیں:۔

"اَلْحَدِیْثُ الْکَلَامُ قَلِیْلُہٗ وَکَثِیْرُہٗ "۔

حدیث بات کو کہتے ہیں خواہ وہ مختصر ہو یا مفصل۔

حدیث کی اصطلاحی تعریف

حضور ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات کے مجموعہ کو حدیث کہتے ہیں، اقوال سے مراد آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے کلمات ہیں، افعال سے مراد آپ ﷺ کے اعضاء سے ظاہر شدہ اعمال ہیں اور تقریر سے مراد: آنحضرت ﷺ کے سامنے کسی صحابی نے کچھ کیا یا کہا اور آپ نے اس پر سکوت فرمایا نکیر نہ کی اس لئے اس سے یہی سمجھا گیا کہ اس عمل یا قول کی حضور ﷺ نے تصدیق فرمادی ہے تو اسی تصدیق کو "تقریر" یعنی confirmation کہتے ہیں اور آپ کی یہ تصدیق تقریری صورت کہلاتی ہے۔

حدیث کی اقسام

۔1۔حدیث قولی ۔2۔حدیث فعلی ۔3۔حدیث تقریری

حدیث قولی:۔

حدیث قولی سے مراد آپ ﷺ کی وہ باتیں ہیں جو آپ ﷺ نے ارشاد فرمائیں ہیں۔ عام طور پر احادیث کی کتابوں میں حدیث کی یہی قسم مراد ہوتی ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا فرمان مبارک ہے: ۔

"صلوا کما رایتمونی اصلی" (ایسے نماز پڑھو جیسا کہ تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا)

حدیث فعلی:۔

آپ ﷺ کے افعال و اعمال کو حدیث فعلی کہتے ہیں۔ آپ ﷺ کی عادات اور اعمال کو صحابہ کرام نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور وہی امت کو بتایا کہ آپ ﷺ نے وضو کس طرح کرتے تھے، آپ ﷺ پانچ نمازیں کس طرح پڑھتے تھے، مناسک حج کس طرح ادا کرتے تھے۔

حدیث تقریری:۔

آپ ﷺ کی موجودگی میں صحابہ کرامؓ نے کوئی کام کیا اور اس کام کو دیکھ کر آپ ﷺ نے سکوت اختیار کیا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کام درست ہے اس کو حدیث تقریری کہتے ہیں۔ اسی طرح وہ افعال جو آپ ﷺ کے سامنے ہوئے یا آپ ﷺ کے علم میں آئے تو آپ ﷺ نے انہیں پسند کیا یا خاموش رہے۔ جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ غزوہ بنی قریظہ سے متعلق آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا تمہیں عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچ کر ادا کرنی چاہیے۔ لیکن راستے میں جب نماز کا وقت ہو گیا تو کچھ حضرات نے نماز پڑھ لی اور کچھ لوگوں نے مابعد المغرب تک موخر کر کے بنی قریظہ میں عصر کی نماز ادا کی تو آپ ﷺ کو جب علم ہوا تو آپ ﷺ نے سکوت اختیار کیا تو یہ اس بات کی دلیل کہ دونوں کا عمل درست ہے۔

حدیث قدسی:۔

آپ ﷺ کے وہ فرامین ہیں جن کو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہو تو ایسے کلام پر تقدس کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ جسطرح حدیث قدسی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بندے کے گمان کے مطابق کرتا ہوں۔

سنت کا مفہوم:۔

سنت کے لغوی معنی راستہ اور طریقہ کے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ دائمی طریقہ اور کام ہے جو آپ ﷺ نے ہمیشہ کیا ہو اور جس کے کرنے کا دوسروں کو حکم دیا ہو۔

نسبت کے اعتبار کے حدیث کی اقسام

۔1۔ حدیث مرفوع

۔2۔ حدیث موقوف

۔3۔ حدیث مقطوع

حدیث مرفوع:۔ حدیث مرفوع وہ ہے جس کی نسبت حضور ﷺ کی طرف ہو۔

حدیث موقوف:۔ حدیث موقوف وہ ہے جس کی نسبت صحابی رسول ﷺ کی طرف ہو۔

حدیث مقطوع:۔ حدیث مقطوع وہ ہے جس کی نسبت تابعیؒ کی طرف ہو۔

راویوں کی تعداد کے اعتبار سے حدیث کی قسمیں

حدیث نقل کرنے والے کو راوی کہتے ہیں، اس لحاظ سے حدیث کی چار قسمیں ہیں، متواتر، مشہور، غریب، عزیز۔

متواتر:۔

وہ حدیث ہے جس کو رسول اللہ ﷺ سے آج تک اتنی بڑی جماعت نقل کرتی آئی ہو کہ عادتاً ان کا جھوٹ پر متفق ہو جانا ناقابل تصور ہو اور محال ہو۔(ڈاکٹر محمود الطحان: مصطلح الحدیث، صفحہ 29/30، مطبوعہ لاہور)۔

مشہور:۔

وہ حدیث ہے جس کو ہر زمانے میں تین یا اس سے زیادہ راویوں نے نقل کیا ہو، اگر سلسلہ سند میں کہیں بھی راویوں کی تعداد کسی زمانے میں تین سے کم ہو گئی ہو تو خبر مشہور باقی نہیں رہے گی۔

عزیز:۔

وہ حدیث ہے جس کی روایت کرنے والے کسی زمانے میں دو سے کم نہ ہوں۔

غریب:۔

وہ حدیث ہے جس کے سلسلہ سند میں کسی زمانے میں بھی راوی کی تعداد صرف ایک رہ گئی ہو، حدیث غریب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ غیر معتبر ہوتی ہے، بلکہ حدیث غریب کبھی صحیح کبھی حسن اور کبھی ضعیف کے درجے کی ہوتی ہے۔

کتب حدیث کی اقسام

جامع:۔

حدیث کی ایسی کتاب جو صرف فقہ کے مسائل تک محدود نہ ہو بلکہ اس میں ہر آٹھ قسم کی احادیث ہو۔ ان میں عقائد، تفسیر القرآن، مناقب، سیر، آداب اور فتن وغیرہ کی احادیث شامل ہیں۔ جیسے الجامع الصحیح البخاری، الجامع الصحیح المسلم وغیرہ۔

سنن:۔

جس میں احکام کی احادیث ابواب فقہ کی ترتیب کے مطابق ذکر کی گئی ہوں۔ جیسے سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ وغیرہ۔

مسند:۔

جس میں صحابہ کرام کی ترتیب کے مطابق احادیث ذکر کی گئی ہوں، خواہ حروف تہجی کے اعتبار سے ہو، خواہ قبائل کے لحاظ سے ہو یا فرقِ مراتب کے اعتبار سے ہو جیسے مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ۔

معجم:۔

جس میں شیوخ اور اساتذہ کے اعتبار سے احادیث نقل کی گئی ہو جس معجم طبرانی وغیرہ۔

مفرد:۔

حدیث کی ایسی کتاب جس میں صرف ایک ہی شخص کی مرویات کو جمع کیا گیا ہوں یا ایک ہی مسئلہ سے متعلق احادیث کو جمع کیا گیا ہو۔، جیسے جزء ابی بکر، جزء رفع الیدین فی الصلوۃ وغیرہ ہے۔

مستدرک:۔

جس میں کسی دوسری کتاب یا محدث کی رہی ہوئی احادیث کو ذکر کر دیا گیا ہو شرط یہ ہے کہ اسکی مقرر کردہ شرائط کا لحاظ کیا جائے۔ جیسے مستدرک حاکم وغیرہ۔

مستخرج:۔

کوئی مصنف کسی کتاب کی احادیث کو کتاب کے جامع اور مؤلف کے علاوہ اپنی سند سے روایت کرے اور اس کی کتاب کے مؤلف کے شیخ کے ساتھ یا اس سے اوپر جا کر مل جائے۔ جیسے مستخرج ابی بکر، مستخرج ابو عوانہ وغیرہ۔

اربعین:۔

وہ کتاب ہے جس میں ایک موضوع یا مختلف موضوعات کی کم و بیش چالیس حدیثیں بیان کی گئی ہوں۔ جیسے امام نووی کی مشہور کتاب "الاربعین"۔

رسالہ:۔

جس میں کسی مخصوص موضوع پر احادیث جمع کی گئی ہوں جیسے الرسالہ امام شافعیؒ۔

صحیح:۔

وہ کتب حدیث ہیں جن میں مؤلف نے صحیح احادیث کے نقل کرنے کا اہتمام کیا ہو، جیسے مؤطا امام مالک، بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان، ان کتابوں میں مؤلفین نے اپنی دانست میں صحیح و حسن روایات کو نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے اور اگر کہیں کسی مصلحت سے قصداً ضعیف روایت نقل کی ہیں تو ان کا ضعف بھی ظاہر کر دیا ہے۔

مصنف:۔

ایسی کتابیں جو فقہی ترتیب پر مرتب کی جاتی ہیں، مگر ان میں احادیث مرفوعہ کے ساتھ صحابہ و تابعین کے فتاویٰ بھی مذکور ہوں، جیسے مصنف عبد الرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ۔

المؤطا کا تعارف

جس کتاب کے مصنف امام مالک بن انسؒ ہیں، جس کا لقب امام دار الہجرۃ ہے۔ جن کی ولادت 93ھ میں ہوئی ہے۔ یہ اسلام کی پہلی وہ کتاب بتائی جاتی ہے۔ جو قرآن مجید کے بعد سب سے پہلے باقاعدہ طور پر فقہی ترتیب سے مرتب کی گئی ہے۔ مؤطا در حقیقت احادیث مدینہ کا وہ مجموعہ ہے جس کو امام دار الہجرہ مالک بن انسؒ نے جمع کیا ہے جس میں 1720 احادیث کو جمع کیا گیا ہے۔

سنت اور حدیث میں فرق

سنت کا لفظ ایسے عمل متوارث پر بھی بولا جاتا ہے جس میں نسخ کا کوئی احتمال نہ ہو، حدیث کبھی ناسخ ہوتی ہے کبھی منسوخ، مگر سنت کبھی منسوخ نہیں ہوتی، سنت ہے ہی وہ جس میں توارث ہو اور تسلسلِ تعامل ہو، حدیث کبھی ضعیف بھی ہوتی ہے کبھی صحیح، یہ صحت وضعف کا فرق ایک علمی مرتبہ ہے، ایک علمی درجہ کی بات ہے، بخلاف سنت کے کہ اس میں ہمیشہ عمل نمایاں رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے مسلک کے لحاظ سے اپنی نسبت ہمیشہ سنت کی طرف کی ہے اور اہل سنت کہلاتے ہیں، حدیث کی طرف جن کی نسبت ہوئی اس سے ان کا محض ایک علمی تعارف ہوتا رہتا ہے اور اس سے مراد محدثین سمجھے گئے ہیں، مسلکاً یہ حضرات اہلسنت شمار ہوتے تھے۔

حدیث کی حیثیت قرآن کریم میں

شریعتِ اسلامیہ کی اساس اور بنیاد قرآن اور سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بحیثیتِ مطاع (یعنی جس کی اطاعت کی جائے) پیش کیا ہے، فرمانِ باری ہے:۔

"يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُو اللهَ وَأَطِيْعُوالرَّسُوْلَ وَلَاتُبْطِلُوْا أَعْمَالَكُمْ"(محمد:۳۳) ۔

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی طرح حضور ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات کی بھی اتباع کرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے مستقل طور سے اس کا حکم دیا ہے۔

نیز ارشاد خداوندی ہے:۔

"وَأَنْزَلْنَا إِلَيْکَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ"(النحل:۴۴) ۔

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُن باتوں کی واضح تشریح کر دو جو اُن کے لیے اتاری گئی ہیں اور تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کی جو ذمہ داری لی ہے اس کی تکمیل رسول اللہ ﷺ کریں گے، آپ ﷺ کا بیان اللہ ہی کا بیان ہوگا اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے قرآن کی تبیین و تشریح وحی کے ذریعہ فرمائی ہو ورنہ اس کو اللہ کا بیان کیسے کہہ سکتے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے: ۔ "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى" (النجم: ۳،۴)۔

(اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے)۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا" (الحشر: ۷)۔

(رسول تم کو جو کچھ دیں وہ لے لو اور جس چیز سے تم کو روک دیں رک جاؤ)۔

ان دونوں آیتوں سے واضح طور پر حدیث کا مقام معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے ارشادات کو وحی الٰہی سے تعبیر فرمایا اور امت کو حکم دیا کہ حضور اکرم ﷺ جس بات کا حکم دیں اس کو اختیار کرو اور جس بات سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

احادیث میں حدیثِ رسول ﷺ کی حیثیت

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ۔ " أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ " (ابو داؤد، باب فی لزوم السنۃ، حدیث نمبر: ۳۹۸۸)۔

(خبردار رہو کہ مجھے قرآن کے ساتھ اس کا مثل بھی دیا گیا ہے)۔

حدیث کے حفظ اور یادداشت کی ترغیب دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:۔

"نَضَّرَ اللَّهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا فَحَفِظَهُ حَتَّى يُبَلِّغَهُ غَيْرَهُ" (ترمذی، بَاب مَا جَاءَ فِي الْحَثِّ عَلَى تَبْلِيغِ السَّمَاعِ، حدیث نمبر: ۲۵۸۰ شاملہ، موقع الاسلام)۔

(اللہ تعالی اس شخص کو تازگی بخشیں جس نے ہم سے کوئی حدیث سنی اسے یاد رکھا؛ یہاں تک کہ اسے کسی دوسرے تک پہنچایا)۔

ایک اور حدیث میں ہے:۔

"فَلْيُبَلِّغْ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ"(مسلم، بَاب تَغْلِيظِ تَحْرِيمِ الدِّمَاءِ وَالْأَعْرَاضِ وَالْأَمْوَالِ، حدیث نمبر: ۳۱۸۰، شاملہ، موقع الاسلام)۔

(جو حاضر ہے وہ اسے غائب تک پہنچادے)۔

خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے متنبہ فرمایا کہ آپ کی یہ حدیث آج صرف اسی اجتماع کے لیے نہیں یہ کل انسانوں کے لیے راہ ہدایت ہے۔ جو آج موجود ہیں اور سن رہے ہیں وہ ان باتوں کو دوسروں تک پہنچادیں۔

تدوینِ حدیث

حدیث کی عظمت وفضیلت اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی ضرورت کے پیشِ نظر حدیث کی حفاظت وصیانت اور کتابت کا اہتمام زمانۂ رسالت ہی سے کیا گیا۔ چنانچہ احادیث کی تحریر سے قطع نظر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے علم حدیث کے اصول اور حفظ وضبط کے لیے اللہ کی عطا کردہ غیر معمولی حافظہ کی تیزی اور ذہن کی سلامتی کا سہارا لیا۔

حفاظتِ حدیث کے طریقے

عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں حفاظتِ حدیث کے لیے تین طریقے (حفظِ روایت، تعامل اور تحریر وکتابت) اپنائے گئے تھے۔ جو یہاں ذکر کئے جاتے ہیں۔

حفظِ روایت

حفاظتِ حدیث کا پہلا طریقہ احادیث کو یاد کرنا ہے اور یہ طریقہ اس دور کے لحاظ سے انتہائی قابل اعتماد تھا، اہلِ عرب کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حافظے عطا فرمائے تھے، وہ صرف اپنے ہی نہیں بلکہ اپنے گھوڑوں تک کے نسب نامے ازبر یاد کر لیا کرتے تھے، ایک ایک شخص کو ہزاروں اشعار حفظ ہوتے تھے، یہی نہیں بلکہ یہ حضرات بسا اوقات کسی بات کو صرف ایک بار سن کر یا دیکھ کر پوری طرح یاد کر لیتے تھے، تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے سامنے عمر بن ابی ربیعہ شاعر آیا اور ستر اشعار کا ایک طویل قصیدہ پڑھ گیا، شاعر کے جانے کے بعد ایک شعر کے متعلق گفتگو چلی، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مصرعہ اس نے یوں پڑھا تھا، جو مخاطب تھا اس نے پوچھا کہ تم کو پہلی دفعہ میں کیا پورا مصرعہ یاد رہ گیا؟ بولے کہو تو پورے ستر شعر سنا دوں اور سنا دیے۔

علماء اسلام کا خیال ہے کہ علاوہ اس کے کہ عرب کا حافظہ قدرتی طور پر غیر معمولی تھا یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق جس نے ''وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ'' کا اعلان کیا تھا۔ اسی نے قرآن کی عملی شکل یعنی رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی حفاظت جن کے سپرد کی تھی ان کے حافظوں کو غیبی تائیدوں کے ذریعہ سے بھی کچھ غیر معمولی طور پر قوی تر کر دیا تھا۔ وہ حضور ﷺ کے اقوال وافعال کو محفوظ کرنا اپنے لیے راہِ نجات سمجھتے تھے، خاص طور پر جب کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد ان کے سامنے آچکا تھا:۔

'' نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فحفظها ووعاها واداها كما سمع''۔(ترمذی، باب ماجاء فی الحث علی تبلیغ السماع، حدیث نمبر:۲۵۲۸۔ ابن ماجہ، باب من بلغ علی، حدیث نمبر:۲۲۶۔ مسند احمد، حدیث جبیر بن مطعم، حدیث نمبر:۱۶۷۸۴۔ مسند شافعی، فدب حامل فقہ غیر فقیہ، حدیث نمبر:۱۱۱۵)۔

(اللہ اس بندہ کو آسودہ حال رکھے جس نے میری بات (حدیث) سن کر یاد کیا پھر اسے اسی طرح دوسروں تک پہنچایا)۔

طریقۂ تعامل

حفاظتِ حدیث کا ایک اور طریقہ جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا تھا وہ تعامل تھا، یعنی صحابۂ کرام آپ ﷺ کے اقوال وافعال پر بجنسہا عمل کر کے اسے یاد کرتے تھے، ترمذی شریف اور دیگر حدیث کی کتابوں میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ انھوں نے کوئی عمل کیا اور اس کے بعد فرمایا:۔

"هٰكَذَا رَأَيْتُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ" بلاشبہ یہ طریقہ بھی نہایت قابلِ اعتماد ہے اس لیے کہ انسان جس بات پر خود عمل پیرا ہوتا ہے تو وہ ذہن میں اچھی طرح راسخ ہو جاتی ہے۔

طریقۂ کتابت

حدیث کی حفاظت کتابت و تحریر کے ذریعہ سے بھی کی گئی ہے، تاریخی طور پر کتابتِ حدیث کو چار مراحل پر تقسیم کیا جاتا ہے:۔

۔۱۔ متفرق طور سے احادیث کو قلمبند کرنا۔

۔۲۔ کسی ایک شخصی صحیفہ میں احادیث کو جمع کرنا جس کی حیثیت ذاتی یادداشت کی ہو۔

۔۳۔ احادیث کو کتابی صورت میں بغیر تبویب (ابواب) کے جمع کرنا۔

۔۴۔ احادیث کو کتابی شکل میں تبویب (ابواب) کے ساتھ جمع کرنا۔

عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں کتابت کی پہلی دو قسمیں اچھی طرح رائج ہو چکی تھیں، منکرینِ حدیث عہدِ رسالت میں کتابتِ حدیث کو تسلیم نہیں کرتے اور مسلم وغیرہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:۔

"لَاتَكْتُبُوْا عَنِّيْ وَمَنْ كتب عنى غَيْرَالْقُرْآن فَلْيَمْحُهُ" منکرینِ حدیث کا یہ کہنا ہے کہ حضور ﷺ کا کتابتِ حدیث سے منع فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس دور میں حدیثیں نہیں لکھی گئیں، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احادیث حجت نہیں ورنہ آپ انھیں اہتمام کے ساتھ قلمبند فرماتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتابتِ حدیث کی یہ ممانعت ابتداء اسلام میں تھی۔

ذیل میں ہم کتابتِ حدیث سے ممانعت کی وجوہ اور اس کے متعلق اعتراضات کے جوابات پیش کر رہے ہیں، کاتبین کی سہولت کے باوجود عمومی طور پر حدیث کی کتابت اور تدوین کی جانب توجہ نہ دینے کے درجِ ذیل اسباب ہیں:۔

۔۱۔ اپنے فطری قوتِ حافظہ کی حفاظت مقصود تھی، کیونکہ قیدِ تحریر میں آجانے کے بعد یادداشت کے بجائے نوشتہ پر اعتماد ہو جاتا۔

۔۲۔ قرآن کریم کے لفظ اور معنی دونوں کی حفاظت مقدم اور ضروری تھی اس لیے لکھنے کا اہتمام کیا گیا، جب کہ حدیث کی روایت بالمعنی بھی جائز تھی۔ اس لیے حدیث کے نہ لکھے جانے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔

۔۳۔ عام مسلمانوں کے اعتبار سے یہ اندیشہ تھا کہ قرآن اور غیر قرآن یعنی حدیث ایک ہی چمڑے یا ہڈی پر لکھنے کی وجہ سے خلط ملط ہو سکتے ہیں، اس لیے احتیاطی طور پر رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کے علاوہ احادیث نبویہ کو لکھنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی حدیث جس میں کتابتِ حدیث سے ممانعت فرمائی گئی اسی مصلحت پر مبنی ہے۔

۔۴۔ ابتداءِ اسلام میں تحریرِ حدیث کی ممانعت تھی پھر حضور ﷺ نے عوارضات کے ختم ہونے کے بعد تحریرِ حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی۔ جس کے متعلق درجِ ذیل احادیث سے تائید ہوتی ہے:۔

۔۱۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنتا تھا اسے محفوظ رکھنے کی غرض سے لکھ لیا کرتا تھا، قریش کے لوگوں نے مجھے منع کیا کہ تم ہر بات رسول اللہ ﷺ سے لکھ لیا کرتے ہو حالانکہ رسول اللہ ﷺ ایک انسان ہیں، ان پر بھی خوشی اور غصہ دونوں حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں لکھنے سے رُک گیا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر یہ بات میں نے عرض کی تو آپ ﷺ نے اپنی انگشتِ مبارک سے اپنے دہنِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ۔

"اُكْتُبْ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَايَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّاحَقٌّ "(ابو داؤد، بَاب فِي كِتَابِ الْعِلْمِ حدیث نمبر:۳۱۶۱)۔

تم لکھتے رہو کیونکہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میرے منہ سے حق بات ہی کا صدور ہوتا ہے۔

۔۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں مجھ سے زیادہ حدیثوں کا جامع کوئی نہیں ہے، سوائے عبد اللہ بن عمروؓ کے، کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا (بخاری شریف، کتاب العلم، باب کتابۃ العلم:۲۲/۱)۔

۔۳۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے منقول ہے کہ ایک انصاری شخص نے نبی کریم ﷺ سے اپنے حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ۔

"اسْتَعِنْ بِيَمِينِكَ"(اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو یعنی اسے لکھ لو)(ترمذی، بَاب مَا جَاءَ فِي الرُّخْصَةِ فِيهِ، حدیث نمبر: ۲۵۹۰)۔

یہ سنہرا دور۔۔ جو پہلی صدی ہجری تک کا ہے۔ اس بحث و تحقیق کا محتاج تھا کہ حدیث کی روایت و حفظ کا اور آپ ﷺ اور صحابہ کرام کے مکتوبات کو جمع کرنے کا کتنا کام ہوا؟

آپ ﷺ نے مختلف حکمرانوں کو جو خطوط بھیجے وہ تحریر شدہ تھے۔ مصر کے شاہ مقوقس کو ایک خط لکھا جس میں اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ گذشتہ صدی ایک عیسائی گرجا میں رکھی گئی ایک قدیم کتاب کی جلد میں لگا ہوا آپ ﷺ کا یہ خط ملا ہے جس کا انکشاف بھی مستشرقین نے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ بعینہ وہی نامہ مبارک ہے جو آپ ﷺ نے مقوقس کو لکھوایا تھا۔ کیونکہ اس کا عربی رسم الخط بھی آپ ﷺ کے دور کا ہے، مہر میں نام، اس کی ترتیب اور صورت بھی وہی ہے۔ اس کی تحریر بھی وہی ہے جو صحابہ و تابعین اور محدثین کی سند سے زبانی روایت ہو کر کتب حدیث میں درج ہو چکی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کے کئی ایسے صحیفے جو دعوتی اور فقہی مسائل پر مبنی خطوط ہیں وہ آپ ﷺ نے بادشاہوں، حکمرانوں، قبائلی سرداروں، اپنے گورنرز، عمال اور قاضیوں کو لکھے۔ کئی تحریری معاہدے اور عہد و پیمان کئے اور لکھ کر دیئے۔ بیشتر تحریریں ایسی لکھوائیں جن میں معافی نامے اور زمین کی ملکیت دینے کی تھیں۔ ان میں کچھ دستیاب بھی ہو گئے جن کی فوٹو شائع ہو چکی ہیں۔ ایسے رجسٹر تیار کروائے جن میں عام مسلمانوں اور مجاہدین کے نام درج ہوں تاکہ ان میں غنائم اور اموال تقسیم ہو سکیں اور شہداء کا علم بھی ہو۔ اپنے سفراء کا رجسٹر بھی تیار کروایا۔ غلامی سے آزادی اور قرض و بار کے بوجھوں کی ضمانت کے نامے لکھوائے۔ خطبوں اور مختلف احادیث کی کتابت بھی کرائی۔ ان سب کا انکشاف گو پچھلی صدی عیسوی میں ہوا ہے جو محدثین کرام کی انتہائی محتاط زبانی روایت و ثقاہت کے شواہد ہیں اور سبھی مرفوع احادیث ہیں۔ صحیفۂ صحیحہ، صحیفۂ صادقہ، مقوقس کو آپ ﷺ کا لکھا ہوا خط اور خلافت عثمانی کا لکھا ہوا قرآن یہ سب آج بھی موجود ہیں۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا لکھا صحیفۂ حدیث جس میں زکاۃ کے احکام تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کا ذکر کتاب الجہاد میں کیا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا صحیفہ تو معروف ہی تھا جس میں زکاۃ، صدقات، دیت، حرمتِ مدینہ، خطبہ حجۃ الوداع اور اسلامی دستور کے اہم نکات تھے۔ محمد بن الحنفیہ جو سیدنا علی رضی اللہ کے بیٹے ہیں ان کے پاس یہ صحیفہ تھا۔ پھر امام جعفرؒ کے پاس آیا اور انہوں نے حارث کو لکھ کر دیا (صحیح بخاری: ۱۱۱)۔

یوں اس نسل کے مجموعہ ہائے حدیث مرتب ہو گئے جن میں صحیفہ ہمام بن منبہ، صحیفہ معمر بن راشد جسے ان کے شاگرد امام عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں جمع کیا اور وہ مسند احمد میں بھی آ گیا ہے۔ کے علاوہ بے شمار تابعین کے لاتعداد مجموعوں کی دنیا کی مختلف لائبریریوں میں موجودگی ایک حقیقت ہے جن میں کچھ شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ رحمہ اللہ کا صحیفہ ہمام بن منبہ کی تحقیق پر قیمتی نوٹ اور " الْوَثَائِقُ السِّيَاسِيَّةُ" میں آپ ﷺ کے خطوط، معاہدات، اور خلفاء اربعہ کے معاہدات وغیرہ کا تذکرہ اہل ایمان کے یقین کے لئے کافی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ۔ صحیفہ ہمام کے نودستیاب مخطوطوں سے خود اس کا بھی یقین ہو جاتا ہے کہ امام احمدؒ بن حنبل نے پوری علمی دیانت سے صحیفہ ہمام کے متعلق اپنی معلومات محفوظ کی ہیں انہیں کیا خبر تھی کہ ان کی وفات کے ساڑھے گیارہ سو سال بعد ان کی لکھی حدیث کی توثیق اس طرح ہو گی۔ اگر انہوں نے صحیفہ ہمام کی حد تک جعل سازی نہیں کی تو اپنی مسند کے باقی اجزاء میں بھی عمداً کوئی ایسی بد دیانتی نہیں کی ہو گی۔ (صحیفہ ہمام بن منبہ اردو ترجمہ از بیکن بکس، ص:۵۸) اسی طرح امام اوزاعی، سفیان ثوری، ابن وردان کے صحف حدیثیہ بھی قابل ذکر ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور مجموعہ امام مالکؒ کی موطأ ہے جو دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ہی جمع کر لیا گیا تھا۔

اس قسم کی احادیث، اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ کتابتِ حدیث کی ممانعت کسی امر عارض کی بنا پر تھی اور جب وہ عارض مرتفع ہو گیا تو اس کی اجازت بلکہ حکم دیا گیا۔ اسی لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ کے دور میں حدیث کے کئی مجموعے (جو ذاتی نوعیت کے تھے) تیار ہو چکے تھے، جیسے صحیفۂ صادقہ، صحیفۂ علی، کتاب الصدقہ، صحفِ انس بن مالک، صحیفۂ سمرہ بن جندب، صحیفۂ سعد بن عبادہ اور صحیفۂ ہمام بن منبہ رضی اللہ عنہم، یہ صحیفے اس بات کی وضاحت کے لیے کافی ہیں کہ عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں کتابتِ حدیث کا طریقہ خوب اچھی طرح رائج ہو چکا تھا۔ لیکن اتنی بات ضروری ہے کہ خلفائے ثلاثہ کے دور میں قرآن کی طرح تدوین واشاعتِ حدیث کا اہتمام نہیں ہوا۔ لیکن حضور ﷺ کی زندگی عہدِ صحابہ میں بجائے ایک نسخہ کے

ہزاروں نسخوں کی صورت میں موجود ہو چکی تھی، اس اعتبار سے تدوینِ حدیث کی ایک صورت خود صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی تھی۔

عصرِ بنو امیہ

اسلامی سلطنت کا دائرہ کار جب وسیع ہوا اور ملک و سلطنتیں فتح ہوئیں، صحابۂ رسول ﷺ علمِ نبوی کی میراث بانٹنے انہی علاقوں میں جا کر آباد ہوئے۔ مغرب و مشرق کا فرق یا سیاسی و معاشرتی ارتقاء ان پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ خود عادل تھے اس لئے یہ خیرات بھی انہوں نے صرف ان میں بانٹی جو صدق، امانت، دیانت اور ثقاہت میں اعلیٰ درجے پر تھے۔ جن کی اکثریت خلیفۂ راشد کی ہدایت پر یہ کام کر رہی تھی اور کچھ اپنی دعوتی دل چسپی سے بھی شغف رکھے رہی۔ ہر خلیفۂ وقت نے زیادہ اہم امور نمٹانے میں وقت گذارا۔ اس لئے کہ دینی امور نمٹانے کے لئے صحابۂ رسول تاحال حیات تھے۔ گو حدیث رسول کو ان ادوار میں خلافتی سرپرستی تو حاصل نہ ہو سکی مگر ایسا بھی نہیں ہوا کہ کسی حکمران یا خلیفہ کے لئے حدیث گھڑی گئی ہو۔ دیگر فتنوں کے سر اٹھانے کی وجہ سے توجہ قرآن کے جمع کرنے اور فتنوں کو دبانے میں رہی۔ خوارج اور علویوں کے فتنے بھی تدوین حدیث کے کام میں رکاوٹ بنے رہے۔ تا آنکہ وہ وقت آیا جب اللہ تعالیٰ نے خلافت عمر ثانی کے مختصر عہد میں یہ عظیم الشان کام لے لیا۔

خلیفہ عمر بن عبد العزیز کی تدوینی کوشش

سیدنا عمر بن عبد العزیز علم حدیث میں گو امام زہریؒ سے کم نہیں تھے مگر خلافتی امور کے ہمراہ وہ تدوین حدیث کے امور کو بھی درد دل سے نمٹانا چاہتے تھے۔ سیدنا عمرؓ فاروق کے اصرار پر قرآن جمع ہوا اور عمر بن عبد العزیزؒ کے اصرار پر احادیث۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں عمروں سے دین کی دو اہم بنیادوں کا عظیم الشان کام لیا۔

☆... سیدنا عمر بن عبد العزیزؒ کی شاندار اور نمایاں ترین خدمت سنت یہ ہے کہ انہوں نے مملکت کے چاروں طرف حدیث کو جمع کرنے اور مدون کرنے کے بارے میں یہ سرکاری حکم بھیجا :۔

" اُنْظُرُوْا حَدِيْثَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَاجْمَعُوْهُ" حدیثِ رسول ﷺ تلاش کرو اور اسے جمع کرو۔ (فتح الباری ۱/۲۰۴)۔

☆... اہلِ مدینہ کو انہوں نے لکھا :۔

" اُنْظُرُوْا حَدِيْثَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَإِنِّي خِفْتُ دُرُوْسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَاءِ"۔

مدینہ والو! حدیث کو تلاش کرو، مجھے علم کے مٹ جانے اور علماء کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے (سنن دارمی)/ ۱۲۶)۔

☆... مدینہ کے گورنر جناب ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم (م:۱۱۷ھ) کو لکھا :۔

" اُكْتُبْ إِلَيَّ بِمَا ثَبَتَ عِنْدَكَ مِنَ الْحَدِيْثِ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَبِحَدِيْثِ عُمْرَةَ، فَإِنِّيْ خَشِيْتُ دُرُوْسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَهُ۔"

مجھے وہ احادیث رسول لکھ بھیجئے جو آپ کے نزدیک مصدقہ ہوں اور سیدہ عمرۃ کی احادیث بھی لکھ بھیجئے کیونکہ میں علم کے مٹ جانے اور اس کے ختم ہو جانے کا خوف رکھتا ہوں (الطبقات الکبری لابن سعد ۲/ ۱۳۴)۔

☆... ان خطوط کے بعد سیدنا عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے امام ابن شہابؒ الزہری کو حکم دیا کہ وہ ان گورنرز سے احادیث کو اکٹھا کر کے ایک دیوان کی شکل دیں۔ ابن شہاب رحمہ اللہ نے ان تمام تحریروں کو یکجا لکھ کر یہ کام عین ۱۰۰ھ میں کر دکھایا۔ یہ پہلی تصنیف تھی جو باقاعدہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز کی ہدایت اور نگرانی میں اہل اسلام کو نصیب ہوئی۔ اور جس کے نسخے لکھوا کر سلطنت کے مختلف گورنرز کو بھیجے گئے۔

مدوّنِ اوّل

سب سے پہلے حدیث کی تدوین اور اس کو کتابی شکل میں جمع کرنے کا حکومت کی جانب سے حکم حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ (۱۰۱ھ) نے دیا ہے، آپ کے مبارک دور میں احادیث کی باضابطہ تدوین کی تحریک پیدا ہوئی ہے، اس لیے کہ اب قرآن کریم سے احادیث کے اختلاط والتباس کا اندیشہ نہ تھا، صحیح بخاری میں ہے:۔

"كَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَى أَبِي بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ انْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيثِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاكْتُبْهُ فَإِنِّي خِفْتُ دُرُوسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَاءِ..الخ" (بخاری، باب کیف یقبض العلم، ۱/۱۷۵)۔

(حضرت عمر بن عبد العزیز نے ابو بکر بن حزم کو لکھا کہ آنحضرت ﷺ کی احادیث پر نظر رکھیں اور انہیں لکھ لیں؛ کیونکہ مجھے علم کے مٹ جانے اور علماء کے اٹھ جانے کا ڈر ہے)۔

الغرض اس طرح تدوینِ حدیث کے اس اہم کام کا آغاز ہوا، جس کے نتیجہ میں پہلی ہجری کے آخر میں حدیث کی بہت سی کتابیں وجود میں آگئی تھیں، جیسے: کتب ابی بکر، رسالہ سالم بن عبد اللہ فی الصدقات، دفاتر الزھری، کتاب السنن لمکحول، ابواب الشعبی۔

یہ حدیث کی کتابوں میں تبویب کی ابتداء تھی، دوسری صدی ہجری میں تدوینِ حدیث کا یہ کام نہایت تیزی اور قوت کے ساتھ شروع ہوا۔ چنانچہ اس دور میں حدیث کی لکھی گئی کتابوں کی تعداد بیس سے بھی زیادہ ہے جن میں سے چند مشہور کتابیں یہ ہیں:۔

کتاب الاثار لابی حنیفہ، المؤطا للامام مالک، جامع معمر بن راشد، جامع سفیان الثوری، السنن لابن جریج، السنن لوکیع بن الجراح اور کتاب الزہد لعبد اللہ بن المبارک وغیرہ۔

تدوینِ حدیث کا کام تیسری صدی ہجری میں اپنے شباب کو پہنچ گیا جس کے نتیجہ میں اسانید طویل ہو گئیں، ایک حدیث کو متعدد طرق سے روایت کیا گیا نیز شیوعِ علم کی بنا پر فن حدیث پر لکھی گئی کتابوں کو نئی تبویب اور نئے انداز سے ترتیب دیا گیا، اس طرح حدیث کی کتابوں کی بیس سے زیادہ قسمیں ہو گئیں، پھر اسماء الرجال کے علم نے باقاعدہ صورت اختیار کر لی اور اس پر بھی متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ الغرض اسی دور میں صحاحِ ستہ کی بھی تالیف ہوئی جس سے آج تک امت مستفید ہو رہی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حدیث کی حفاظت وصیانت اور کتابت کا آغاز زمانۂ رسالت ہی سے ہو گیا تھا اور حدیث کی حفاظت کے لیے حفظِ روایت، طریقۂ تعامل اور تحریر سے کام لیا گیا، اور تیسری صدی ہجری تک حدیثوں کو پورے طور پر مدون کر دیا گیا۔

تدوین حدیث کا تیسرا مرحلہ:۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا زمانہ اور ان کے بعد کا زمانہ ہے۔

صحاح ستہ

صحاح صحیح کی جمع ہے اور ستہ کا معنی چھ ہے۔ صحاح ستہ سے مراد حدیث کی مشہور وہ چھ کتابیں ہیں جو تیسری صدی ہجری کے نصف دوم میں مدون کی گئی ہیں وہ اور ان کے مصنفین درج ذیل ہیں:۔

صحیح بخاری

آپؒ کا اصل نام محمد بن اسماعیل البخاری ہے۔ ۱۳/ یا ۱۶/ شوال ۱۹۴ھ کو بخارہ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ کم و بیش ایک ہزار شیوخ سے علم حدیث حاصل کئے۔ آپ نے بیشمار کتابیں لکھیں، جن میں ذیل کی کتابیں آپ کے "انمٹ نقوش" ہیں۔(۱) کتاب الجامع الصحیح،(۲) کتاب الادب المفرد، (۳) کتاب برّ الوالدین،(۴) کتاب الہبہ،(۵) کتاب القراءۃ خلف الامام،(۶) کتاب رفع الیدین فی الصلوٰۃ،(۷) کتاب خلق افعال العبد،(۸) کتاب التاریخ الکبیر،(۹) کتاب التاریخ الاوسط،(۱۰) کتاب التاریخ الصغیر،(۱۱) کتاب الجامع الکبیر،(۱۲) کتاب المسند الکبیر،(۱۳) کتاب التفسیر الکبیر، (۱۴) کتاب الاشربۃ،(۱۵) کتاب العلل،(۱۶) کتاب اسامی الصحابۃ،(۱۷) کتاب الوحدان،(۱۸) کتاب المبسوط،(۱۹) کتاب الکنی،(۲۰) کتاب الفوائد۔

ان کتابوں میں سب سے عظیم اور جلیل القدر تصنیف آپ کی "جامع بخاری" ہے، جس کو تمام دنیائے اسلام میں شہرت دوام حاصل ہے۔ آپ نے اپنی اس "صحیح" کا انتخاب چھ لاکھ احادیث سے فرمایا ہے، اور اس کتاب میں صرف انہی حدیثوں کو جگہ دیتے ہیں جن کے رواۃ پر نقد و جرح اور عدل و ضبط کی حیثیت سے آپ کو شرح صدر اور کامل وثوق حاصل تھا۔ اس طرح یہ کتاب دنیائے اسلام میں اپنے نہج کی سب سے پہلی کتاب قرار پائی مکررات کے علاوہ آپ کی جامع کی حدیث کی تعداد ۲۶۰۲ ہے۔ اور اگر مکررات کو شامل کر لیا جائے تو اب یہ تعداد بڑھ کر ۷۳۹۷ ہو جائیں گی (الحطۃ)۔

بخاری کی سب سے بڑی کمائی ان کے تراجم میں ہے۔ تراجم میں لطیف اشارات، اور دقیق استنباط پائے جاتے ہیں، جس سے حضرت امام بخاری کی باریک بینی، بالغ نظری، اور اجتہادی شان ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بخاری شریف کے تراجم حل کرنے کیلئے محدثین کو باقاعدہ اصول وضوابط بنانے پڑے۔ سمرقند کے ایک چھوٹے سے گاؤں "خرتنک" میں ۲۵۶ھ میں وفات ہوئی۔

صحیح مسلم

مسلم شریف کے مصنف مسلم بن الحجاج القشیری النیشاپوری ہیں۔ آپ کی ولادت "نیشاپور" میں ۲۰۴ھ کو ہوئی۔ آپ کا سب سے اہم اور عظیم کارنامہ "جامع صحیح مسلم" ہے۔ جو حسن ترتیب، جودت نظم، اور دقائق اسناد میں بخاری سے بھی اونچی ہے۔ ایک مضمون کی جملہ روایتوں کو بجمیع طرقہا یکجا، نہایت سلیقہ، اور عمدگی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ تاہم صحت وقوت میں بخاری شریف سے نیچے ہے۔ مکررات کے علاوہ کل حدیث چار ہزار اور مکررات کے ساتھ ۷۲۷۵ احادیث ہیں۔

سنن ابی داؤد

سنن ابی داؤد کے مصنف سلیمان بن الاشعث الازدی السجستانی ہیں۔ ۲۰۲ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، پانچ لاکھ حدیثوں میں سے چار ہزار آٹھ سو حدیثوں کا انتخاب کر کے اپنی سنن میں ذکر کیا۔ سنن ابی داؤد کی منجملہ دیگر خصوصیات کے سب سے اہم خصوصیت "قال ابو داؤد" ہے۔ اس لفظ سے امام ممدوح کا جو اختلاف رواۃ، یا اختلاف رواۃ فی الالفاظ کی طرف باریک ترین اشارہ ہوتا ہے اس کا سمجھنا ایک انتہائی اہم کام ہوتا ہے۔ اس سنن کے علاوہ آپ کی اور بھی دوسری تصانیف ہیں، جو درجِ ذیل ہیں:۔

۔ا۔ مراسیل ابی داؤد، یہ مختصر سا رسالہ ہے۔ جس میں آپ مرسل روایات ذکر کرتے ہیں۔ یہ کتاب سنن ابی داؤد کے بعض نسخوں کے ساتھ بھی ملحق ہے۔

(۲) الردّ علی القدریہ،(۳) الناسخ والمنسوخ،(۴) ما تفرد بہ اہل الامصار،(۵) فضائل الانصار،(۶) مسند مالک بن انس،(۷) المسائل،(دیکھئے تہذیب) لیکن آپ کی جملہ تصانیف میں "سنن ابی داؤد" سب سے اعلیٰ وافضل ہے۔ ۲۷۵ھ میں بمقام بصرہ آپ کی وفات ہوئی۔

جامع ترمذی

جامع ترمذی کے مصنف محمد بن عیسیٰ الترمذی ہیں۔ ۲۰۹ھ میں بمقام "ترمذ" آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ نے حدیث پاک کی مستند و معتبر ترین کتاب "جامع ترمذی" لکھی۔ اس کتاب کے تین نام ہیں:۔ (۱) جامع ترمذی:۔ جامع اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں حدیث کے آٹھوں ابواب ﴿سیرت نبوی، آدابِ اسلامی، تفسیر، عقائد، احادیث فتن، علامات قیامت، احکام اور مناقب﴾ کی روایتیں موجود ہے۔(۲) سنن ترمذی: سنن اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں احکام شرعیہ سے تعلق رکھنے والی حدیثیں یعنی مستدلاتِ فقہاء بیان کئے گئے ہیں۔(۳) الجامع المعلّل: معلّل اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں ایسی احادیث کی اسناد پر بحث کی گئی ہے جن میں کوئی خرابی پائی جاتی ہے۔ اصل نام جامع ترمذی ہی ہے۔ لیکن سنن ترمذی سے مشہور ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت روایات کی تخریج ہے۔ یعنی جب وہ کہتے ہیں کہ "وفی الباب عن فلان" تو جن روایتوں کا وہ حوالہ دیتے ہیں، ان کا مقام و مرتبہ جاننا اور ان کی تخریج کرنا بہت اہم کام ہے۔

سننِ نسائی

سنن نسائی کے مصنف احمد بن شعیب النسائی ہیں۔ ولادت ۲۱۵ھ میں خراسان کے ایک شہر " نساء" میں ہوئی۔ آپ کی سنن کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے اس میں روایتوں پر جو نقد کیا ہے اس کے مقابل کو سمجھنا بہت اہم ہے۔ مثلاً جب آپ فرماتے ہیں کہ "ہذا الحدیث خطأ" تو اس کا جاننا مشکل ہوتا ہے کہ اس کا مقابل " صواب" کیا ہے؟ اس کے علاوہ آپ کے تراجم بھی بڑے اہم اور باریک ہوتے ہیں۔ ۳۱۳ھ میں آپ نے وفات پائی۔

سننِ ابنِ ماجہ

سنن ابن ماجہ کے مصنف ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ ہے۔ ۲۰۹ھ میں آپ کی ولادت ہے۔ آپ نے جو سنن لکھی ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی نادر اور غریب حدیثیں موجود ہیں۔ اس میں بعض روایتیں ضعیف بھی ہیں۔ اسلئے متقدمین نے اس کو "صحاح ستہ" میں شامل نہیں کیا ہے۔ ۲۷/ رمضان ۳۷۳ھ بروز دوشنبہ آپ کی وفات ہوئی۔

سبق نمبر 4

منتخب احادیث

دنیا سے رخصت ہونے کے بعد جاری رہنے والے اعمال

1۔:حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ أَيُّوبَ، وَقُتَيْبَةُ يَعْنِي ابْنَ سَعِيدٍ، وَابْنُ حُجْرٍ، قَالُوا: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ هُوَ ابْنُ جَعْفَرٍ، عَنِ الْعَلَاءِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: " إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ "(صحیح مسلم،جز3،ص1255)۔

(حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب انسان مر جائے تو اس سے اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں مگر تین چیزیں ایسی ہیں جو مرنے کے بعد بھی ملتی رہتی ہیں، وہ صدقہ جاریہ ہے یا نفع بخش علم ہے یا نیک اولاد ہے جو اس کے حق میں دعا کرتی ہے)۔

حدیث کی تشریح: ۔اس حدیث میں ان اعمال کا ذکر ہے جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے موت ایک اٹل حقیقت ہے جو انسان دنیا میں آیا ہے اس نے یہاں سے جانا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے" ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے"۔

اس حدیث مبارکہ میں موت کے بعد کام آنے والوں اعمال کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک صدقہ جاریہ ہے، اس میں سے مسجد کی تعمیر وغیرہ خرچ کرنا اور رفاہی کاموں میں خرچ کرنا شامل ہے، رستے میں کوئی سبیل وغیرہ لگانا اور اسی طرح شاگردوں جو علم پڑھایا ہے اس کا بھی ثواب پہنچتا رہے گا۔

اور دوسرا عمل جس کا اجر ملنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے وہ نفع بخش علم ہے، اگر کسی عالم نے کوئی کتاب لکھ دی اسکے مرنے کے بعد بھی اس کو ثواب پہنچتا رہے گا، اسی طرح شاگردوں کو جو علم پڑھایا ہو اس کا بھی اجر ملتا رہے گا۔ جب تک وہ شاگرد علم پڑھتے اور پڑھاتے رہیں گے تو استاد کو اجر ملتا رہے گا۔

تیسری چیز نیک اولاد ہے جو کہ مرنے کے بعد بھی فائدہ دے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کا اپنی اولاد کو تربیت دینا بہتر ہے ایک صاع صدقہ دینے سے ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی والدین کا اپنی اولاد کو آداب سکھانے سے بہتر کوئی تحفہ نہیں (مشکوٰۃ)۔

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر حقوق

2:۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ، حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ أَبِي سَلَمَةَ، عَنِ الأَوْزَاعِيِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِي ابْنُ شِهَابٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي سَعِيدُ بْنُ المُسَيِّبِ، أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: " حَقُّ المُسْلِمِ عَلَى المُسْلِمِ خَمْسٌ: رَدُّ السَّلاَمِ، وَعِيَادَةُ المَرِيضِ، وَاتِّبَاعُ الجَنَائِزِ، وَإِجَابَةُ الدَّعْوَةِ، وَتَشْمِيتُ العَاطِسِ "(صحیح البخاری ،جز2،ص71)۔

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ فرمارہے تھے کہ مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں: سلام کا جواب دینا، مریض کی عیادت کرنا، اور جنازہ پڑھنا اور دعوت کو قبول کرنا اور چھینک کا جواب دینا۔

حدیث کی تشریح: ۔اس حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے مختصر انداز میں ایک جامع بات کو بیان کیا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق ہیں وہ پانچ ہیں: ۔

1۔ سلام کا جواب دینا۔

2۔ مریض کی عیادت کرنا۔

۔3۔ نماز جنازہ میں شرکت کرنا۔

۔4۔ دعوت کو قبول کرنا۔

۔5۔ چھینک کا جواب دینا۔

پہلا حق سلام کا جواب دینا۔ سلام کی احادیث مبارکہ میں بہت تاکید وارد ہوئی ہے ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: ۔جو بھی آئے اسے سلام کرو،مَن عَرَفتَ وَ مَن لم تَعرِف خواہ تم اسے جانتے ہو یا نہیں جانتے، تاہم سلام میں پہل کرنے والے کو جواب دینے والے کی نسبت زیادہ اجر ملتا ہے۔

جب فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تو انہوں نے سلام کیا اور ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کا جواب سلام سے دیا۔جب جنتی جنت کے دروازے پر پہنچیں گے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور کہیں گے **سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ**(الزمر 73) تم پر سلامتی ہو تم بہت اچھے رہے بہر حال کہ زندوں کے لئے **سلام علیکم** اور مردوں کے لئے **علیکم السلام** کہنا چاہیے۔

اسی طرح سلام کی اہمیت بہت سی احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتی ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں: ۔

۔1۔ سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے بری ہے۔

۔2۔جو سلام سے پہل نہ کرے اس کو گھر میں آنے کی اجازت دو۔

۔3۔ایک دفعہ حضور ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اس نے کہا "**السلام علیکم** "تو حضور ﷺ نے فرمایا دس، دوسرا آدمی آیا اس نے کہا"السلام علیکم و رحمۃ اللہ"تو حضور ﷺ نے فرمایا بیس، پھر تیسرا آدمی آیا اس نے کہا"السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ"تو حضور ﷺ نے فرمایا: تیس، تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اس کا کیا مطلب ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا جس نے کہا"السلام علیکم"کہا اس کو دس نیکیاں ملتی ہیں، جس نے "ورحمۃ اللہ"کو ساتھ ملایا اس کو بیس نیکیاں ملتی ہیں اور جس نے "وبرکاتہ"بھی ساتھ ملایا اس کو تیس نیکیاں ملتیں ہیں۔

دوسری چیز جس کا اس حدیث مبارکہ میں ذکر کیا گیا ہے وہ ہے مریض کی عیادت کرنا، جب کوئی بیمار ہو جائے تو ہمیں چاہیے کہ اس کی عیادت کے لئے جائیں اور مریض کی عیادت کرنے کا مطلب اس کو سکون پہنچانا ہے، لہٰذا جس طریقے سے اور جتنا وقت بیٹھنے سے مریض کو سکون ملے تو اسی طرح کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ نیز ہو سکے تو مریض کے لئے جو کھانے کی چیز مفید ہو وہ بھی لے جائیں۔ مریض کی عیادت کے وقت تسلی کے الفاظ استعمال کرنے چاہیے، ایسے الفاظ استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے جس سے مریض ناامید اور مایوس ہو جائے۔ آپ ﷺ نے ایک دوسری حدیث مبارکہ میں ارشاد فرمایا ہے: جو شخص صبح کو مریض کی عیادت کرنے جاتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور اگر شام کو کوئی مریض کی عیادت کرنے جائے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں۔

تیسری چیز جس کا اس حدیث مبارکہ میں ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق ہے جب وہ فوت ہو جائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ بعض جنازے ایسے ہوتے ہیں جن کے پڑھنے سے پڑھنے والوں کی بخشش ہو جاتی ہے اور بعض پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے نماز جنازہ پڑھنے سے مرنے والے کی بخشش ہو جاتی ہے، اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں آتا ہے جو نماز جنازہ میں شریک ہوا اس کو ایک قیراط ثواب ملتا ہے اور جو آدمی نماز جنازہ پڑھنے کے بعد تدفین میں بھی شامل ہوا اس کو دو قیراط ثواب ملتا ہے اور ایک قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوتی ہے۔ آج ہمارے اندر اس حق کی ادائیگی میں بہت کتاہی اور کمی پائی جاتی ہے کہ ہم جنازے میں تو شریک ہو جاتے ہیں لیکن اس کے آداب و شرائط سے بے خبر ہوتے ہیں۔

چوتھی چیز جس کا اس حدیث مبارکہ میں ذکر کیا گیا وہ یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی مسلمان کی دعوت کرے تو اس کی دعوت کو قبول کرنا چاہیے بالخصوص اس وقت جب دعوت کرنے والا کوئی غریب آدمی ہو اور ہمارے اس کی دعوت کو قبول کرنے اور شریک ہونے سے اس کی عزت میں اضافہ ہو۔ دعوت کے آداب میں سے یہ بھی ہے جب کوئی دعوت پر بلائے تو اسی وقت دعوت پر جانا چاہیے اور کھانا کھا لینے کے بعد واپس آجانا چاہیے باتوں میں جی لگا کر بیٹھ جانا نہیں چاہیے۔ کہیں دعوت کرنے والے کو مشقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ دعوت دینے پر جو پیش کرے اس کو خوشی خوشی کھا لینا چاہیے، خوامخواہ اپنی خواہشات کا اظہار نہیں کرنا چاہیے سوائے اس کے دعوت دینے والا باتکلف دوست اور رشتے دار ہو جو مدعو کی خواہش پورا کرنے پر بھی قادر ہو۔

مسلمان کا مسلمان پر پانچواں حق یہ کہ کہ چھینک کا جواب دیا جائے جس کا تفصیل سے حدیث مبارکہ میں ذکر ہے کہ جب کسی کو چھینک آئے تو وہ کہے الحمد لله (تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں) اور سننے والا کہے یرحمك الله (اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے) اور جس کو چھینک آئے وہ دوبارہ کہے یهديكم الله ويصلح بالكم(اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت دے اور تمہارے لئے تمہارے اعمال درست کرے) ۔

چھینک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور بہت ساری بیماریوں کا علاج ہوتی ہے اور انسانی دماغ سے گرد غبار کا خاتمہ کرتی ہے۔ چھینک کے جواب کے بارے میں پوری حدیث مبارکہ یوں ہے: ۔

عن أبي هريرة عن النبي –صلي الله عليه وسلم – قال: "إذا عطس أحدكم فليقل: الحمد لله، فإذا قال: الحمد لله، قال له أخوه: يرحمك الله، فإذا قيل له: يرحمك الله، فليقل: يهديكم الله ويصلح بالكم".

حضرت ابوہریرۃؓ سے مروی ہے کہ جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو وہ "الحمد لله" کہے، جب وہ "الحمد لله" کہے تو اس کا بھائی "یرحمک الله" کہے، پھر جب چھینک آنے والے کو "یرحمک الله" کہا جائے تو وہ "یهدیکم الله و یصلح بالکم" کہے۔

قیامت کے دن ہونے والے سوالات

ـ3:- حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ قَالَ: أَخْبَرَنَا الأَسْوَدُ بْنُ عَامِرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرِ بْنُ عَيَّاشٍ، عَنْ الأَعْمَشِ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جُرَيْجٍ، عَنْ أَبِي بَرْزَةَ الأَسْلَمِيِّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا تَزُولُ قَدَمَا عَبْدٍ يَوْمَ القِيَامَةِ حَتَّى يُسْأَلَ عَنْ عُمُرِهِ فِيمَا أَفْنَاهُ، وَعَنْ عِلْمِهِ فِيمَ فَعَلَ، وَعَنْ مَالِهِ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيمَ أَنْفَقَهُ، وَعَنْ جِسْمِهِ فِيمَ أَبْلَاهُ»(سنن الترمذی، جز4، ص190)ـ

حضرت ابو برزہؓ سے مروی ہے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرما کہ قیامت کے دن کسی انسان کے قدم اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکیں گے جب تک کہ اس سے سوال نہ کیا جائے کہ عمر کے بارے میں کہ کہاں گزاری، علم کے بارے میں کتنا اس پر عمل کیا اور مال کے بارے میں کہاں سے کمایا اور کہا اس میں سے خرچ کیا اور جسم کے بارے میں کہا اس کو ختم کیا؟

حدیث کی تشریح: ۔اس حدیث مبارکہ میں ان سوالات کا ذکر جو قیامت کے دن پوچھے جائیں گے جن کی ہم نے اس دنیا میں رہتے ہوئی تیاری کرنی ہے۔ اگرچہ دنیا کا ضابطہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے سوالات نہیں بتائے جاتے لیکن اللہ کریم نے سوالات بھی بتائے اور ان کا حل بھی اپنے نبیوں کے ذریعے سکھلایا ہے ہم نے صرف ان کی تیاری کرنی ہے۔

پہلا سوال عمر کے بارے میں ہو گا کہ زندگی کے لیل و نہار اللہ تعالیٰ کی امانت تھے اور ان کو بسر کرنے کا طریقہ بھی بتلایا گیا تھا، آیا تم نے اپنی عمر کو کیسے گزارا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا والے کام کیے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کام انجام دیئے ہیں۔ دوسرا سوال علم کے بارے میں ہو گا کہ علم پر عمل کتنا کیا ہے، اسی کی وضاحت آپ ﷺ نے ایک دوسری مبارکہ میں کی ہے کہ علم والے سارے ہلاک ہونے والے ہیں مگر جو عمل کرنے والے ہیں وہی بچیں گے۔ علم تو شیطان کو بھی بہت تھا لیکن اس کا اس کے مطابق عمل نہیں تھا۔ اگرچہ علم کی اہمیت سے انکار عبث ہے لیکن علم کا مرتبہ اور مقام عمل ہی کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جس کسی شخص نے علم دین اس لئے حاصل کیا کہ وہ دنیا کو حاصل کرے قیامت کے دن آگ کی لگام اس کے گلے میں ڈالی جائے گی۔ علم تو مومن کی متاع گم گشتہ ہے جہاں کہیں میسر ہو حاصل کر لینی چاہیے۔ اب علم حاصل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی دربار میں یہ سوال بھی ہو گا کہ علم پر عمل کتنا کیا ہے؟ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس ڈر سے علم حاصل کرنے کے بعد عمل کرنا پڑے گا۔ لہٰذا علم سیکھنا عبث سمجھنا نادانی اور بے سمجھی ہی ہے۔ کیونکہ غلام آقا کو راضی کرنے کے لئے ہر اس طریقے کو اختیار کرتا ہے جو اس کو راضی کرنے کا ذریعہ ہو، یقیناً عمل سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوتی ہے لیکن علم کے بغیر عمل کھوکھلا اور بے کار ہوتا ہے۔ البتہ عمل کی بہت ساری آداب اور شرائط ہوتی ہیں وہ علم کی محتاج ہوتیں ہیں۔

قیامت کے دن تیسرا سوال مال کے بارے میں ہو گا، قابل غور بات یہ ہے کہ مال کے بارے میں قیامت کے دن دو سوال ہوں گے یعنی مال کمایا کہاں سے ہے اور خرچ کہاں کیا ہے۔ لہٰذا پہلے تو مال کمانے کا طریقہ بھی شریعت کی حدود و شرائط کے تابع ہونا چاہیے تا کہ اس میں حرام کی آمیزش نہ ہو اور مال کما لینے کے بعد اس فخر میں نہیں آنا چاہیے کہ یہ تو میں نے کمایا ہے اب میں اس کا حق کیوں ادا کروں۔ بلکہ مال کو بھی فضل الٰہی کی سمجھ کر جہاں جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے انہیں مواضع پر اسے خرچ کرنا چاہیے، نہ ہی مال میں فضول خرچی کو اختیار کیا جائے اور نہ ہی کنجوسی کی جائے بلکہ اعتدال کی راہ کو مدِ نظر رکھنا چاہیے اور جو مال اپنی ضروریات کو پورا کر لینے کے بعد بچ جائے تو اس میں سے غرباء اور مساکین اور رشتہ دار اور ہمسائیوں کے حقوق کو بھی ادا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہیں، ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ بندوں کو آزمانا چاہتے ہیں۔ ہر امت کا ایک فتنہ اور آزمائش ہوتی ہے اور امت محمدیہ ﷺ کا فتنہ اور آزمائش مال ہے۔ نیز دنیا کی حد سے زیادہ محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔ آپ ﷺ نے تو جہاں تک فرمایا ہے کہ اگر ابن آدم کو ایک وادی سونے کی بھر کر دے دی جائے تو پھر بھی اس کا پیٹ نہیں بھرے گا، وہ یہ ہی کہے گا کاش کہ ایک وادی اور مل جائے۔ کثرت سے مال مل جانا اللہ تعالیٰ کی رضا کی دلیل نہیں ہے بلکہ مال حلال کمانا اور درست جگہ خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا کی دلیل ہے۔

آخری سوال جو قیامت کے دن ہونا ہے جس کا اس حدیث مبارکہ میں ذکر ہے وہ یہ کہ جسم کے بارے میں اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ اس کو پرانا کیسے کیا ہے۔ جسم میں انسان کے تمام اعضاء شامل ہیں یعنی زبان، دل، ہاتھ، پاؤں، دماغ، آنکھ وغیرہ تمام اعضاء کی اہمیت مسلمہ ہے۔ لہٰذا ہر عضو کے لئے شریعت کا ایک دائرہ کار اور دائرہ عمل ہے، اسی دائرہ عمل کے بارے میں سوال ہو گا کہ جس عضو کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس طرح استعمال کرنے کا حکم دیا تھا اسی طرح استعمال کیا ہے یا اس میں شریعت کی حدود سے تجاوز تو نہیں کیا گیا ہے۔

ایمان، جہاد اور حج کی عظمت

ـ4:ـ حدثنا عفان، حدثنا أبان، حدثنا يحيى عن أبي جعفر عن أبي هريرة قال: قيل: يا رسول الله – صلي الله عليه وسلم –أي الأعمال أفضل؟ قال: "إيمان لا شك فيه، وغزو لا غلول فيه، وحج مبرور "(مسند الإمام أحمد بن حنبل، أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني (المتوفى: 241ھ، جلد8، ص355) ۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ کہا کہ عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ایسا ایمان جس میں شک نہ ہو، ایسا جہاد جس میں خیانت نہ ہو اور ایسا حج جو مقبول ہو۔

حدیث کی تشریح: ۔ صحابہ کرامؓ کو جس چیز کے بارے میں کوئی سوال پیدا ہوتا تھا تو فوراً حضور ﷺ سے سوال کرتے تھے۔ جس کا آپ ﷺ تسلی بخش جواب دیتے تھے جس سے ہمیں دین کا ایک بہت بڑا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس حدیث مبارکہ میں بھی ایک سوال کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ ایمان افضل ہے جس میں کسی قسم کا شک اور تردد نہ ہو۔ ایمان ظاہری اعمال میں تو نہیں ہوتا بلکہ انسان کے دل میں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود افضل الاعمال یہی ہے، ایمان پختہ ہو اور شک وشبہ سے پاک ہو، منافقوں جیسا مشکوک ایمان نہ ہو تو یہی سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑا عمل ہے۔

پھر حضور ﷺ نے فرمایا وہ جہاد بھی افضل عمل ہے جس میں خیانت نہ ہو، جہاد میں دشمن سے مال غنیمت بھی حاصل ہوتا ہے جو کہ امیر کی تقسیم اور اجازت کے بغیر تصرف میں لانا روا نہیں۔ اگر کوئی شخص بلا اجازت امیر کوئی چیز حاصل کرتا ہے تو یہ خیانت ہو گی۔ فرمایا ایسا جہاد افضل اعمال میں سے ہے جس میں خیانت نہ ہو۔

تیسرے نمبر پر حضور ﷺ نے فرمایا حج مبرور ومقبول بھی افضل عمل ہے۔ حج مبرور وہ حج ہے جس میں حلال کمائی خرچ کی گئی ہو اور ارکان حج سنت کے مطابق ٹھیک ٹھیک ادا کئے گئے ہوں۔ نیز فلا رفث و لا فسوق ولا جدال فی الحج (سورۃ البقرۃ:197) دوران حج نہ کوئی فحش بات کی جائے، نہ فسق و

فجور کو قریب آنے دیا جائے اور نہ رفقائے حج کیساتھ کوئی لڑائی جھگڑا کیا جائے۔ حج مبرور کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس میں ریاکاری نہ ہو۔ حج محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کیا جائے۔ یہ شرائط پوری ہو جائیں تو حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ حج مبرور کا بدلہ جنت ہی ہے۔ شمائل میں یہ روایت موجود ہے کہ حضور ﷺ نے جس اونٹنی پر حج کیا تھا اس کا پلان وغیرہ چار درہم کا بھی نہیں تھا بلکہ بالکل معمولی سا تھا۔ آپ ﷺ یہ دعا بھی کر رہے ہیں: اللهم اجعلها حجة لا رئا فيه اے اللہ اسکو ایسا حج بنادے جس میں ریاکاری کا شائبہ نہ ہو الغرض فرمایا کہ کہ حج مبرور بھی افضل اعمال میں سے ہے۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے کے مستحق خوش نصیب

ـ5:- حَدَّثَنَا الأَنْصَارِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا مَعْنٌ قَالَ: حَدَّثَنَا مَالِكٌ، عَنْ خُبَيْبِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ حَفْصِ بْنِ عَاصِمٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَوْ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: " سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ، إِمَامٌ عَادِلٌ، وَشَابٌّ نَشَأَ بِعِبَادَةِ اللَّهِ، وَرَجُلٌ كَانَ قَلْبُهُ مُعَلَّقًا بِالمَسْجِدِ إِذَا خَرَجَ مِنْهُ حَتَّى يَعُودَ إِلَيْهِ، وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللَّهِ فَاجْتَمَعَا عَلَى ذَلِكَ وَتَفَرَّقَا، وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ، وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ حَسَبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ: إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ "(صحيح البخاری، ج1،ص133)۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا سات قسم کے لوگوں کو قیامت کے دن اللہ تعالی اپنے سایہ میں رکھیں گے جس دن اللہ تعالیٰ کے سایہ کے علاوہ سایہ نہیں ہو گا ایک ان میں سے عادل حکمران ہے، دوسرا وہ نوجوان ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پروان چڑھا اور تیسرا وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلیں اور چوتھا وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے اور پانچواں وہ دونوں شخص جنہوں نے صرف اللہ کے لئے محبت کی، اسی کی بنیاد پر ملے اور اسی کی بنیاد پر جدا ہوئے۔ چھٹا وہ شخص جس کو اونچی ذات والی اور خوبصورت عورت نے اپنے نفس کی طرف دعوت عیش دی اور

اس نے کہا بیشک میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور ساتواں وہ شخص جس نے اللہ کی راہ میں صدقہ کیا اور اس نے اس کو اس طرح چھپایا حتی کہ بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا کیا۔

حدیث کی تشریح: ۔اس حدیث مبارکہ میں ان سات لوگوں کا ذکر ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں ہوں گے، جب نفسا نفسی کا وقت ہو گا اور اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہو گا، جو دن پچاس ہزار سال کا ہو گا جس کی سختی کو دیکھ کر لوگ یہ خواہش کریں گے کہ جہنم میں چلا جانا تو قبول ہے لیکن یہ دن ختم ہونا چاہیے۔ جس دن کی سختی سے حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ لیکن اس دن میں سات طرح کے لوگ خوش نصیب ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں ہوں گے: ۔

پہلا عادل حکمران ہو گا جس کے تمام فیصلے انصاف کو مد نظر رکھ کر صادر ہوتے تھے جو اپنے فیصلوں میں اپنی ذات اور اپنے مفاد کو پس پشت ڈال کر شریعت کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا اور حق والوں کو ان کا حق دلوایا کرتا تھا۔

دوسرا وہ جوان ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں جوان ہوا ہو گا، جوانی میں انسان کی شیطانی اور نفسانی خواہشات عروج پر ہوتی ہیں اور بسا اوقات وہ گناہ کرنے پر قادر بھی ہوتا ہے اس سب کے باوجود اگر کوئی رب کے ڈر اور رضا کو مد نظر رکھ کر جوانی عبادت اور رب کی رضا میں گزار دے، تو اسے اللہ کے عرش کا سایہ نصیب ہو گا۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ جوانی کا ایک سجدہ بڑھاپے کے سو سجدوں سے بہتر ہے۔

تیسرا وہ آدمی ہے جو تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور اسے کوئی دیکھنے والا موجود نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو گر پڑتے ہیں۔ یہ آنسو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہیں۔ اس لئے ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کے عرش کا سایہ نصیب ہو گا۔

چوتھا وہ شخص ہے جس کا دل مسجد سے اٹکا رہتا ہے۔ جب بھی کوئی نماز اور عبادت کر کے فارغ ہوتا ہے اور گھر کی طرف لوٹتا ہے تو اس کے دل میں یہی خواہش ہوتی ہے کاش کہ مجھے ایک دفعہ دوبارہ نماز پڑھنے اور عبادت کرنے کا موقع مل جائے، مومن مسجد میں ایسے ہی ہوتا ہے جیسے دریا میں مچھلی ہوتی ہے، مومن کو مسجد سے آنے کے بعد قلبی سکون نصیب نہیں ہوتا جہاں تک کہ وہ مسجد کی طرف لوٹ آئے۔

پانچوے وہ دو شخص جن کی محبت اور نفرت، دوستی اور دشمنی اللہ تعالیٰ ہی کی رضا کے لئے ہوتی ہے، اگر ان کا ملاپ ہو رہا تو اس میں بھی مد نظر اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے اور اگر جدائی ہو رہی ہے تو اس میں بھی مقصود اللہ تعالیٰ کی ہی رضا ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت آپ ﷺ نے ایک اور حدیث میں یوں کی ہے: ۔

"جس نے محبت کی اللہ کی رضا کے لئے، نفرت کی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے، کسی کو عطا کیا وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور عطا کرنے سے ہاتھ روکا بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رضا کے لئے، ایسے آدمی نے اپنا ایمان مکمل کر لیا"۔

حاصل یہ ہے کہ کسی سے محبت یا نفرت کسی ذاتی مفاد یا عداوت کی بنا پر نہ ہو بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو۔ ایسا آدمی کسی بھائی سے محبت کرتا ہے تو محض اس لئے کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرنبردار ہے اور اگر کسی سے نفرت یا جدائی ہے تو اس لئے ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے اور اللہ تعالیٰ کا باغی ہے۔

چھٹا آدمی جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں ہو گا وہ شخص ہے جس کو کوئی حسب و نسب اور حسن و جمال والی عورت، دعوتِ گناہ دے تو وہ یہ ہی کہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے ڈر لگتا ہے، وہ ہی میرا آقا اور مولا ہے اس نے جس کام سے منع کر دیا وہ کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے اور نہ ہی چاہت ہے کہ میں محبوب کی نافرمانی کرو۔

ساتواں آدمی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں دائیں ہاتھ سے مال خرچ کرتا ہے تو بائیں ہاتھ کو بھی علم نہیں ہوتا یعنی اس کا مقصد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے۔ مال خرچ کرنے سے مقصد احسان جتانا، تکلیف دینا اور دکھاوا کرنا نہیں ہوتا، بلکہ صدقات کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خفیہ طور پر سرانجام دیتا ہے۔

متعدی بیماری اور شگون

ـ6ـعَنْ أَنَسٍ – رضی اللہ عنہ – قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم : «لَا عَدْوَى وَلَا طِيَرَةَ،وَيُعْجِبُنِي الفَأْلُ». قَالُوا: وَمَا الفَأْلُ؟ , قَالَ: «الكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ».(غاية المريد شرح كتاب التوحيد،عبد الرحمن بن عبد العزيز العقلج1، ص305)ـ

حضرت انس بن مالکؓ روایت بیان کرتے ہیں کہ بے شک اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ نہ کوئی بیماری متعدی ہے، نہ شگون ہے اور مجھے تو فال پسند ہے، لوگوں نے عرض کیا حضرت! فال کیا چیز ہے؟ فرمایا اچھا کلمہ جو کسی کی زبان سے سن کر دل خوش ہو جائے۔

حدیث کی تشریح: ۔عام مشہور ہے کہ بعض بیماریاں مثلاً ہیضہ، چیچک، خارش، طاعون وغیرہ متعدی بیماریاں ہیں جو ایک مریض سے دوسرے مریض کو لگ جاتی ہیں مگر حضور ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ کوئی بھی بیماری متعدی نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس جان کو پیدا کیا ہے اس کے ساتھ اس کے تمام عوارضات بھی لکھ دیئے ہیں جو اس کو زندگی میں پیش آتے ہیں۔ لہٰذا متعدی بیماری کا اعتقاد درست نہیں ہے۔

اسی طرح فرمایا" ولا الطيرة "اور شگون لینے کا عقیدہ بھی درست نہیں ہے بعض پرندے کو اڑا کر یا کسی دوسرے طریقے سے اچھا یا برا شگون لیتے ہیں، یہ عقیدہ باطل ہے۔ دوسری روایت میں آتا ہے"الطيرة من الشرك"،یعنی شگون لینا شرک کے مترادف ہے، انسان کو کو محض کسی برے شگون کی بناء پر کوئی کام روک نہیں دینا چاہیے، بلکہ اسے جاری رکھنا چاہیے۔ جاہلیت کے زمانے میں اس قسم کے شگون لیے جاتے تھے کہ کوئی شخص سفر پر روانہ ہوا ہے اگر سامنے سے بلی گزر گئی تو یہ واپس آجاتا کہ یہ سفر نامراد ہے۔ اس قسم کی باتیں محض وہم ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ بعض لوگ پرندے سے اڑا کر شگون لیتے تھے، اگر پرندہ دائیں طرف اڑا تو اسے اچھا شگون سمجھتے، اور مطلوبہ کام کر گزرتے اور اگر بائیں طرف اڑ جاتا تو برا شگون سمجھ کر اس کام کو ترک کر دیا جاتا۔

ہمارے ہاں فال سے وہ فال مراد لی جاتی ہے جس کے ذریعے نجومی لوگ اٹکل پچو باتیں بتاتے ہیں۔ بعض لوگ نقشِ سلیمانی، دیوان حافظ یا ہیر رانجھے وغیرہ کی کتاب سے یا مثنوی سے فال نکالتے ہیں، بعض اس کام کے لئے قرآن مجید کو استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کا عقیدہ درست نہیں ہے، حضور ﷺ نے فال کی تعریف میں فرمایا کہ وہ اچھا کلمہ ہے جو کسی کی زبان سے سن کر آدمی کا دل خوش ہو جاتا ہے۔

جسم کا سب سے قیمتی حصہ

ـ7ـ حدَّثنا عليُّ بنُ عبدِالعزيزِ، ثنا أبو نُعيمٍ، ثنا زكريَّا بنُ أبي زائدةَ، عن الشعبيِّ، قال: سمعتُ النُّعمانَ بنَ بَشيرٍ يقولُ: سمعتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ: «أَلا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً؛ إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ؛ أَلا وَهِيَ الْقَلْبُ» .(المعجم الكبيرللطبرانی،جز21،ص64)ـ

نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ فرمارہے تھے خبر دار بے شک جسم میں خون کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے جب وہ خراب ہو تو سارا جسم خراب ہوتا ہے خبر دار وہ دل ہے۔

حدیث کی تشریح: ۔اس حدیث مبارکہ یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اگر انسان کا دل خراب ہو گا تو پورے جسم کے اعمال خراب ہوں گے اور اگر دل درست لائن اور راہ پر ہو گا تو باقی اعضاء کے اعمال بھی درست اور اچھے ہوں گے، یہ بات حقیقت پر ہی مبنی ہے کیونکہ انسان کے جسم کے سارے اعضاء کا سردار اور باقی اعضاء کو چلانے والا دل ہی ہوتا ہے۔ اگر دل میں اچھائی ہو گی اور وہ پاک ہو گا تو انسان کی آنکھ بھی پاک ہوں گی اور زبان بھی درست بول بولے گی اور ہاتھ بھی درست کام سرانجام دیں گے اور پاؤں بھی درست طرف چلیں گے۔ اور اس کے برخلاف اگر دل ناپاک ہو گا اور دل میں اچھائی نہ ہو تو باقی اعضاء سے بھی اچھائی ظاہر ہونا محال ہے۔ اسی لئے اس حدیث مبارکہ میں واضح طور پر ارشاد فرمایا دیا گیا باقی اعضاء کی سلامتی اور درستی دل پر مبنی ہے۔

ارکانِ اسلام

ـ8ـحَدَّثَنَا مَكِّيٌّ، حَدَّثَنَا دَاوُدُ بْنُ يَزِيدَ الْأَوْدِيُّ، عَنْ عَامِرٍ، عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: " بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ،

وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصِيَامِ رَمَضَانَ "(مسند احمد ،جز31،ص555)

جریر بن عبدؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ فرمارہے تھے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: ۔پہلی چیز لا الہ الا اللہ کی گواہی ہے اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج کرنا، اور رمضان کے روزے رکھنا ہے۔

حدیث کی تشریح: ۔اس حدیث مبارکہ میں ارکان اسلام کو بیان کیا گیا ہے جن پر پورے دین کی بنیاد استوار ہوتی ہے اور ارکان اسلام میں کسی ایک کا بھی منکر دائرہ اسلام سے خارج ہوتا ہے۔ ان ارکان میں پہلے رکن کا تعلق ہمارے دل اور عقائد سے ہے جو ہمارے ایمان کی جڑ ہے جس کے بغیر ایمان کا تصور ہی نہیں، البتہ باقی چار ارکان کا تعلق ہمارے اعمال سے ہے ان اعمال کو سرانجام دینے سے ہمارا ایمان مکمل اور مضبوط ہوتا ہے۔ ان چار ارکان پر عمل نہ کرنے والا فاسق ہوتا ہے اور تسلیم نہ کرنے والا مسلمان ہونے کے لائق نہیں۔

نماز وروزے سے زیادہ اجر والی چیز

۔9-حَدَّثَنَا هَنَّادٌ حَدَّثَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ عَنْ الْأَعْمَشِ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ عَنْ أُمِّ الدَّرْدَاءِ عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ قَالُوا بَلَى قَالَ صَلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ فَإِنَّ فَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ قَالَ أَبُو عِيسَى هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ وَيُرْوَى عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ هِيَ الْحَالِقَةُ لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعَرَ وَلَكِنْ تَحْلِقُ الدِّينَ(جامع ترمذی: جلد دوم: حدیث نمبر408)

ہناد، ابو معاویہ، اعمش، عمرو بن مرہ، سالم بن ابی الجعد، ام الدرداء، حضرت ابو درداء(رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو روزے نماز اور صدقے سے افضل ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کیوں نہیں! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آپس میں محبت اور میل جول اس لئے کہ آپس کا بغض تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) سے منقول ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آپس کی پھوٹ مونڈ دیتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سر کو مونڈ دیتی ہے بلکہ یہ تو دین کو مونڈ دیتی ہے (یعنی انسان کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے)۔

حدیث کی تشریح: ۔ آپ ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ پہلے آپ ﷺ کسی چیز کے سیکھنے کا شوق پیدا کرتے تھے تاکہ بعد میں آنے والی بات پر عمل کرنا سہل ہو جائے۔ اسی طرز انداز کو اختیار کرتے ہوئے آپ ﷺ نے اس حدیث مبارکہ میں صحابہ کرامؓ سے سوالیہ انداز میں پوچھا "کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں، جس کا ثواب اور اجر نماز، روزے اور صدقہ سے بھی زیادہ اور وہ افضل ہے؟" صحابہ کرامؓ نماز، روزے اور صدقے کے اجر سے تو آگاہ ہی تھے کہ ان پر بہت بڑا اجر ملتا ہے لیکن آپ ﷺ نے ان میں شوق پیدا کیا کہ ان سے بھی افضل چیز ہے، تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ فوراً بتا دیں۔ شوق پیدا ہونے کے بعد آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا: ۔ "آپس کی محبت اور آپس میں صلح کروانا، ان تمام چیزوں سے بھی افضل ہے۔ اور آپس کی پھوٹ اور بغض تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور یہ چیز تمہارے دین کو مونڈ ڈالنے والی ہے"۔

اس حدیث مبارکہ اور کثیر احادیث مبارکہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام آپس میں صلح کروانے اور محبت کرنے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور آپس میں نفرت اور لڑائی جھگڑے کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ آپ ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا: جو تعلق توڑے تو اس کے ساتھ تعلق جوڑو، جو تجھ پر ظلم کرے اسے معاف کر دو، جو تیرے ساتھ برائی کرے تو اس کے ساتھ اچھائی کر۔ شب قدر کی تعیین کے بھلا دیئے جانے کی وجوہات میں سے ایک وجہ آپس کا جھگڑا ہی تھا۔ (اس حدیث مبارکہ کی مزید وضاحت اسلام اور فرقہ پرستی کا عنوان جو فقہ کے سبق میں ہے کہ تحت دیکھی جا سکتی ہے)

حقوق العباد، علم اور علم کی مجالس کی اہمیت

۔10۔حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ يَحْيَى التَّمِيمِيُّ وَأَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَمُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ الْهَمْدَانِيُّ وَاللَّفْظُ لِيَحْيَى قَالَ يَحْيَى أَخْبَرَنَا و قَالَ الْآخَرَانِ حَدَّثَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ عَنْ الْأَعْمَشِ عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ بِهِ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللَّهِ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمْ

السَّكِينَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللَّهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ(صحیح مسلم: جلد سوم: حدیث نمبر 2352)

یحییٰ بن یحییٰ تمیمی، ابو بکر بن ابی شیبہ محمد بن علاء ہمدانی یحییٰ بن یحییٰ ابو معاویہ اعمش، ابو صالح حضرت ابو ہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس آدمی نے کسی مومن سے دنیا میں مصیبتوں کو دور کیا اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن کی مصیبتوں کو دور کرے گا اور جس نے تنگ دست پر آسانی کی اللہ اس پر دنیا میں اور آخرت میں آسانی کرے گا اور اللہ اس بندے کی مدد میں ہوتے ہیں جو اپنے بھائی کی مدد میں لگا ہوتا ہے اور جو ایسے راستے پر چلا جس میں علم کی تلاش کرتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ذریعہ جنت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں اور جو لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے اور اس کی تعلیم میں مصروف ہوتے ہیں ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے اور رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ ان کا ذکر اپنے پاس موجود فرشتوں میں کرتے ہیں اور جس شخص کو اس کے اپنے اعمال نے پیچھے کر دیا تو اسے اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔

حدیث کی تشریح: ۔اس حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے تین چیزوں کی عظمت کو احسن انداز میں بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی مدد کرتا ہے اور اس سے مصیبتوں کا دور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس آدمی کی ایک کے بدلے ستر ضرورتوں کو پورا کرے گا اور اگر کوئی کسی مسلمان کے ایک عیب پر پردہ ڈالتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے ستر عیبوں پر پردہ ڈالے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے اسی محبت کو پیارے نبی ﷺ نے یوں بیان کیا:۔

"الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ " ۔

ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب وہ آدمی ہے جو مخلوق کے ساتھ سب اچھا سلوک کرتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا:۔ اے میرے بندے! میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہ کی، میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہ پلایا اور میں

بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا، اے اللہ! تو تو ان چیزوں سے پاک ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، میرا فلاں بندہ پیاسا تھا، میرا فلاں بندہ بھوکا تھا۔

مختلف آیات اور احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے معیار پر اور ان کی جگہ پر اپنی ذات کو لا کر کلام کرتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی بندوں سے محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت میں لگے رہتے ہیں اس وقت تک اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرنے میں لگا رہتا ہے۔

دوسری چیز علم کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے جو شخص علم کی طلب اور تلاش میں نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔ اگر کوئی آدمی علم کی طلب میں گھر سے نکلتا ہے وہ اللہ کے راستے میں ہوتا ہے اگر اس راستے میں موت آجائے تو شہادت کی موت ہوتی ہے۔ علم دین حاصل کرنے والوں کے پاؤں کے نیچے فرشتے پر بچھاتے ہیں، دریاؤں میں مچھلیاں، ہواؤں میں پرندے اور بلوں میں حشرات الارض علم حاصل کرنے والوں کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ علم حاصل کرنے والوں کے درجات کو اللہ تعالیٰ نے بلند کر دیا ہے۔ علماء نبیوں کے وارث ہوتے ہیں اور نبیوں کی وراثت دراہم اور دنانیر نہیں ہوتے بلکہ انبیاء کی وراثت علم ہوا کرتا ہے۔ علم ہی مومن کی متاع گم گشتہ ہے جہاں میسر ہو اسے حاصل کر لینا چاہیے۔ علم کی اہمیت کا اس بات سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ خاص طور اللہ تعالیٰ سے ایک دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما۔

تیسری چیز جس کا اس حدیث مبارکہ میں ذکر کیا گیا ہے وہ علم و ذکر کی مجالس کی عظمت کا بیان ہے کہ جو مجلس علم و ذکر کی ہوتی ہے یعنی جس مجلس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور شان کا ذکر کیا جاتا ہے اور علم کی باتوں کو سیکھا اور سیکھایا جاتا ہے، ایسی مجالس کو رحمت کے فرشتے گھیر لیتے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینہ اور رحمت کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا ذکر فرشتوں کی جماعت کے پاس کرتے ہیں۔ اس کی تائید دوسری حدیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اپنی مجالس میں میرا ذکر کرو تو میں فرشتوں کی مجالس میں تمہارا ذکر کروں گا، تم میری طرف چل کر آؤں میں تمہاری طرف دوڑ کر آؤں گا۔

آخر حدیث میں سمجھایا گیا کہ انسان کی شان اور عظمت کا دارومدار اس کے عمل پر ہوتا ہے اگر کسی کو اس کا عمل پست کر دے تو اس کا حسب و نسب اسے عروج پر نہیں لے جا سکتا۔

سبق نمبر 5

حضور ﷺ کی مکی زندگی اور اس کی خصوصیات

Life of Muhammad Bin Abdullah(Before Prophet Hood),Life of Holy Prophet in Makkah.,Important Lesson Derived from the Life of Holy Prophet in Makkah.

حضور ﷺ کا مختصر تعارف

محمد بن عبد اللہ ﷺ کی ولادت مشہور عام تاریخ کے مطابق 12 ربیع الاول عام الفیل بمطابق 570 ء یا 571 ء کو ہوئی۔ آپ ﷺ تمام مذاہب کے پیشواؤں سے کامیاب ترین پیشوا تھے۔ آپ کی کنیت ابو القاسم تھی۔ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت محمد ﷺ اللہ کی طرف سے انسانیت کی جانب بھیجے جانے والے انبیا اکرام کے سلسلے کے آخری نبی ہیں۔ جن کو اللہ نے اپنے دین کی درست شکل انسانوں کی جانب آخری بار پہنچانے کیلئے دنیا میں بھیجا۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مطابق آپ ﷺ دنیا کی تمام مذہبی شخصیات میں سب سے کامیاب شخصیت تھے۔ 570ء (بعض روایات میں 571ء) مکہ میں پیدا ہونے والے حضرت محمد ﷺ پر قرآن کی پہلی آیت چالیس برس کی عمر میں نازل ہوئی۔ ان کا وصال تریسٹھ (63) سال کی عمر میں 632ء میں مدینہ میں ہوا۔ حضرت محمد ﷺ بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف کے والد کا انتقال ان کی دنیا میں آمد سے قریبا چھ ماہ قبل ہو گیا تھا اور جب ان کی عمر چھ سال تھی تو ان کی والدہ حضرت آمنہ بھی اس دنیا سے رحلت فرما گئیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش آپ کے دادا خواجہ عبد المطلب نے کی اور جب آپ ﷺ کی عمر مبارک آٹھ سال ہوئی تو آپ ﷺ کے دادا جان خواجہ عبد المطلب کا بھی انتقال ہو گیا اور اس کے بعد آپ ﷺ کی پرورش آپ کے چچا ابو طالب نے کی۔ عربی زبان میں لفظ "محمد" کے معنی ہیں 'جس کی تعریف کی گئی'۔ یہ لفظ اپنی اصل حمد سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے تعریف کرنا۔ یہ نام ان کے دادا حضرت عبد المطلب نے رکھا تھا۔ محمد ﷺ کو رسول، خاتم النبیین، حضور اکرم، رحمت للعالمین اور آپ ﷺ کے القابات سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کے بہت نام والقاب ہیں۔ نبوت کے اظہار

سے قبل حضرت محمد ﷺ نے اپنے چچا حضرت ابو طالب کے ساتھ تجارت میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ اپنی سچائی، دیانت داری اور شفاف کردار کی وجہ سے آپ ﷺ عرب قبائل میں صادق اور امین کے القاب سے پہچانے جانے لگے تھے۔

شام کا پہلا سفر

بارہ سال کی عمر میں حضرت محمد ﷺ نے حضرت ابو طالب کے ساتھ شام کا تجارتی سفر بھی اختیار کیا اور تجارت کے امور سے واقفیت حاصل کی۔ اس سفر کے دوران میں ایک بحیرا نامی عیسائی راہب نے آپ ﷺ میں کچھ ایسی نشانیاں دیکھیں جو ایک آنے والے پیغمبر کے بارے میں قدیم آسمانی کتب میں لکھی تھیں۔ اس نے حضرت ابو طالب کو بتایا کہ اگر شام کے یہود یا نصاریٰ نے یہ نشانیاں پالیں تو آپ ﷺ کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو طالب نے یہ سفر ملتوی کر دیا اور واپس مکہ آ گئے (تاریخ طبری جلد 2 صفحہ 34)۔

جنگ فجار

زمانہ جاہلیت کی لڑائی جو 15 عام الفیل میں قریش اور بنی قیس کے درمیان میں ہوئی۔ یہ جنگ ان دنوں میں ہوئی جن میں لڑنا منع ہے۔ اس لیے اسے حرب فجار کہتے ہیں۔

اس جنگ میں آنحضرت ﷺ بھی شریک ہوئے۔ اگرچہ قریش سچائی پر تھے مگر آپ نے کشت و خون میں حصہ نہیں لیا۔ صرف دشمن کے پھینکے ہوئے تیر اٹھا اٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیتے تھے۔ یہ جنگ صلح پر منتج ہوئی۔ آپس میں یہ معاہدہ کیا گیا کہ ملک میں ہر طرح سے امن قائم رکھا جائے گا اور مسافروں، غریبوں اور مظلوموں کی خواہ وہ کسی قبیلے کے ہوں، مدد کی جائے گی۔ رسول پاک عہد رسالت میں بھی اس معاہدے پر فخر فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ اس قسم کے معاہدے کے لیے میں اب بھی حاضر ہوں۔ اس معاہدے کا نام حلف الفضول رکھا گیا۔ کیونکہ معاہدے پر آمادہ کرنے والے تین سرداروں کے نام میں لفظ فضل مشترک تھا۔

حرب فجار زمانۂ جاہلیت کی جنگوں میں سب سے زیادہ مشہور لڑائی سمجھی جاتی ہے۔ روایت ہے کہ حرب فجار کی تعداد چار ہے اور یہ لڑائی جس میں آنحضرت ﷺ نے شرکت کی چوتھی اور آخری تھی۔ یہ آنحضرت ﷺ کی ابتدائی زندگی کی پہلی جنگ تھی جس میں آپ نے شرکت کی تھی۔

شام کا دوسرا سفر اور شادی

خدیجہ بنت خویلد اسد بن عبد العزیٰ بن قصی، قصی محمد ﷺ کے جد امجد تھے۔ آپ کا تعلق قریش کی ایک نہایت معزز شاخ بنی اسد سے تھا۔ یہ خاندان اپنی شرافت و نجابت اور کاروباری معاملات میں ایمانداری اور راست روی سے عزت و شہرت کے بلند مقام پر فائز تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ بنت زائدہ تھا۔ آپ کے والد ایک مشہور تاجر تھے اور بہت مالدار۔

قتادہ کے قول کے مطابق، خدیجہ بنت خویلد کی پہلی شادی عتیق بن عاید مخزومی سے ہوئی جس سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کے انتقال کے بعد دوسری شادی ابوہالہ ہند بن بنائش تمیمی سے ہوئی جس سے تین لڑکے ہند اور طاہر پیدا ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد ابوہالہ کی بھی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد آپ کی تیسری شادی محمد ﷺ سے ہوئی۔ جن سے آپ کی اولاد بھی ہوئی، آپ کی وفات ہجرت مدینہ سے پہلے مکہ شہر میں محمد ﷺ کی زوجہ کی حیثیت سے ہوئی۔

تقریباً 25 سال کی عمر میں آپ ﷺ نے شام کا دوسرا بڑا سفر کیا جو حضرت خدیجہ علیہا السلام کے تجارتی قافلہ کے لیے تھا۔ حضرت محمد ﷺ نے ایمانداری کی بنا پر اپنے آپ کو ایک اچھا تاجر ثابت کیا۔ آپ ﷺ دوسرے لوگوں کا مال تجارت بھی تجارت کی غرض سے لے کر جایا کرتے تھے۔ آپ ﷺ یہ خدمات حضرت خدیجہ علیہا السلام کے لیے بھی انجام دیا کرتے تھے۔ اس سفر سے واپسی پر حضرت خدیجہ کے غلام میسرہ نے ان کو حضور ﷺ کی ایمانداری اور اخلاق کی کچھ باتیں بتائیں۔ انہوں نے جب یہ باتیں اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کو بتائیں تو ورقہ بن نوفل نے کہا کہ جو باتیں آپ نے بتائیں ہیں اگر صحیح ہیں تو یہ شخص یقیناً نبی ہیں۔ آپ حضرت محمد ﷺ کے اچھے اخلاق اور ایمانداری سے بہت متاثر ہوئیں اور آپ ﷺ کو شادی کا پیغام دیا جس کو آپ ﷺ نے حضرت ابو طالب کے مشورے سے قبول کر لیا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر 25 سال تھی۔

حضرت خدیجہ علیہا السلام قریش کی مالدار ترین اور معزز ترین خواتین میں سے تھیں۔ حضرت خدیجہ علیہا السلام سے آپ ﷺ کی چار بیٹیاں حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمہ پیدا ہوئیں (البدایہ والنہایہ جلد 2 صفحہ 294)۔

سیدہ خدیجہ نے 65 سال کی عمر میں ہجرت سے تین سال قبل 10 ماہِ رمضان بروز پیر 30 اپریل 619ء کو مکہ میں وفات پائی۔ سیدہ خدیجہ کی وفات مدینہ کی ہجرت اور نماز فرض ہونے سے پہلے اسی سال ہوئی جب ابو طالب کی وفات ہوئی۔ اس سال کو عام الحزن کا نام ملا۔ روایات کے مطابق انہیں جنت میں موتیوں سے تیار کردہ گھر ملے گا۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے ایک دن حاضر ہو کر خدیجہؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ خدیجہ ہیں۔ ان کا ساتھ اور کھانا پینا ہمیشہ آپ ﷺ کے ساتھ رہے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سلام بھیجا ہے اور میں بھی انہیں سلام کہتا ہوں۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے کہا کہ انہیں بشارت دے دیجیے کہ اللہ نے ان کے لیے جنت میں ایک بڑا خوشنما اور پر سکون مکان تعمیر کرایا ہے۔ جس میں کوئی پتھر کا ستون نہیں ہے۔

جنت المعلی (مکۃ المکرمہ) کا قبرستان

تعمیر کعبہ اور حجر اسود کے تنازع کا فیصلہ

مکی زندگی میں نبی اکرم ﷺ کی سب سے بڑی شناخت تھی آپ ﷺ کی صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی۔ مکی زندگی میں نبوت ورسالت سے سرفراز ہونے سے پہلے اور بعد کے زمانہ میں آپ کی شناخت آپ کی صداقت وامانت، شرافت وپاکیزگی، تواضع وانکساری اور تقوی وپاکبازی تھی۔ مکہ کا ہر باشندہ آپ کی شرافت وپاکیزگی اور اعلی اخلاق کا قائل تھا۔ آپ کو عام طور پر صادق اور امین کہا جاتا تھا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت حجرِ اسود کو اس کے مقام تک اٹھا کر رکھنے میں قریش کے اندر جو سخت اختلاف پیدا ہوا اور جس کی وجہ سے خوں ریز جنگ چھڑنے والی تھی، وہ آپ کی جوانی کا زمانہ تھا، لیکن قریش کے سرداروں اور بڑے بوڑھوں کو جب یہ ہاشمی نوجوان دکھائی پڑا تو سب نے بیک آواز ہو کر کہا: ۔

"هَذا مُحَمَّدُن الأَمِيْنُ رَضِيْنَا هَذا مُحَمَّدُن الأَمِيْنُ"۔

(یعنی یہ محمد امین شخص ہیں، ہم ان سے خوش ہیں، یہ امین ہیں)۔ اور سب نے اس نوجوان کے حکیمانہ فیصلے کو بخوشی قبول کیا اور اس طرح ایک خون ریز جنگ چھڑتے چھڑتے رہ گئی (سیرۃ المصطفیٰ ۱:۱۱۶، سیرت ابن ہشام)۔

نوٹ: ۔ عرب ٹی وی کے مطابق محمد صادق بیہ نے آج سے 138 برس پیشتر یعنی 1880 میں بنائی، موصوف نے یہ تصویر اپنے سفر حجاز کے دوران بنائی، حرمین شریفین کی زیارت کے حوالے سے 4 کتابیں بھی لکھیں، آج سے قریباً ڈیڑھ سو برس قبل لی گئی تصاویر میں خانہ کعبہ کے غلاف کو بھی دیکھا جا سکتا ہے جو سیاہ ریشمی کپڑے سے تیار کیا گیا اور اس پر قرآنی آیات سنہری حروف میں منقش ہیں۔

حجر اسود

حضرت عبداللہ بن زبیر (جو حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے اور حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد احتجاجاً یزید بن معاویہ سے بغاوت کرتے ہوئے مکہ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تھا) نے نبی پاک ﷺ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے، 685ء میں بیت اللہ کو دوبارہ بنائے ابراہیمی کی طرز پر تعمیر کروایا تھا مگر حجاج بن یوسف نے 693ء میں انہیں شکست دی تو دوبارہ قریشی طرز پر تعمیر کرا دیا جسے بعد ازاں تمام مسلمان حکمرانوں نے برقرار رکھا۔

کعبہ کی عمارت کا خاکہ اور اس کے ابعاد

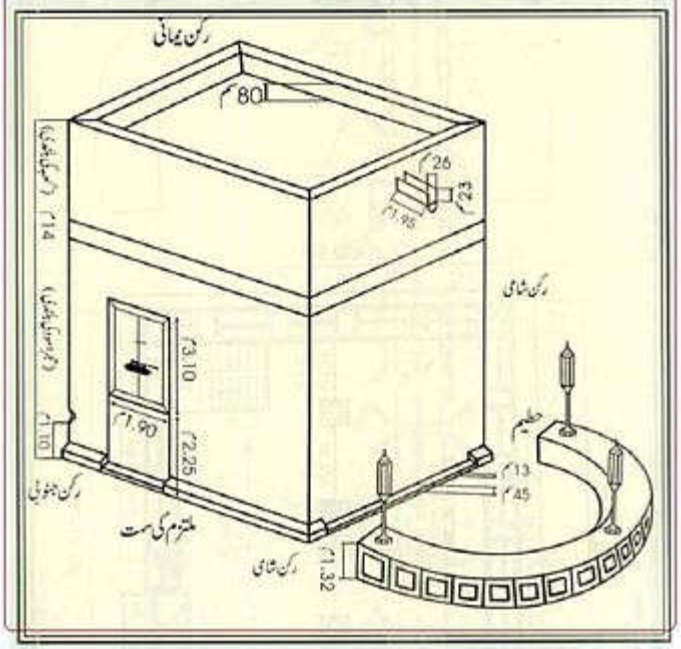

کعبہ شریف کی بلندی	14 میٹر
ملتزم کی جانب کعبہ کی لمبائی	12.84 میٹر
حطیم کی جانب کعبہ کی لمبائی	11.28 میٹر
رکن یمانی اور حطیم کا فاصلہ	12.11 میٹر
رکن یمانی اور رکن جنوبی کے مابین فاصلہ	11.52 میٹر

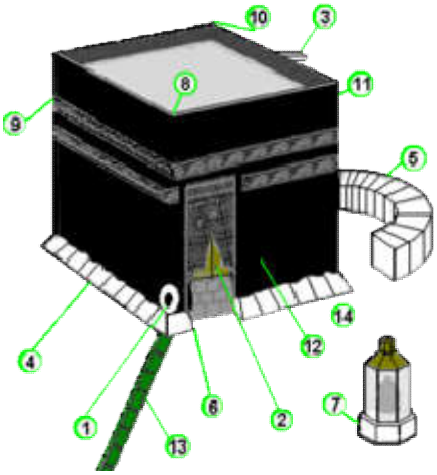

۔1۔ حجر اسود

۔2۔باب کعبہ

۔3پرنالہ

۔4۔بنیادیں

۔5۔ حطیم

۔6۔ملتزم

۔7۔مقام ابراہیم

۔8۔رکن حجر اسود

۔9۔رکن یمانی

۔10۔رکن شامی

۔11۔رکن عراقی

۔12۔غلاف کعبہ

۔13۔سنگ مرمر سے ڈھانپا ہوا حصہ، چاروں طرف سے

۔14۔مقام جبرائیل

ستمبر 2015ء کی تصویر

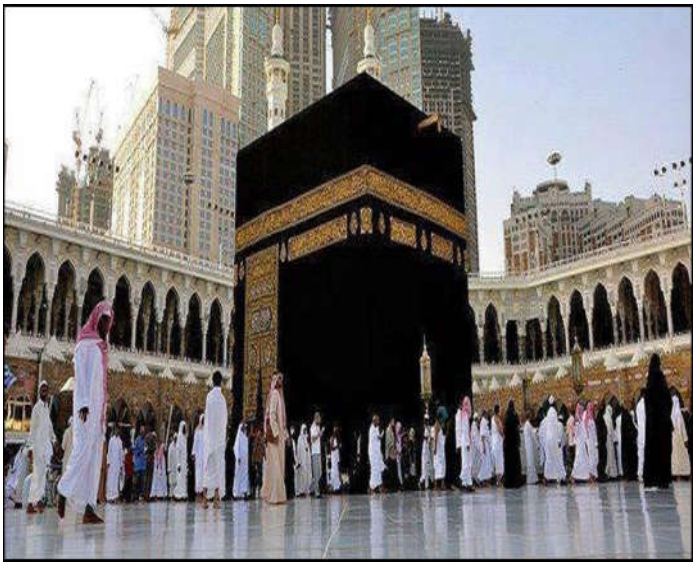

غارِ حرا میں وحی کا نزول

رسول اللہ ﷺ کی عمر شریف جب چالیس برس کے قریب ہو چلی اور اس دوران آپ ﷺ کے اب تک کے تاملات نے قوم سے آپ ﷺ کا ذہنی اور فکری فاصلہ بہت وسیع کر دیا تھا تو آپ ﷺ کو تنہائی محبوب ہو گئی۔ چنانچہ آپ ﷺ ستو اور پانی لے کر مکہ سے کوئی دو میل دور کوہ حراء کے ایک غار میں جا رہتے، یہ ایک مختصر سا غار ہے جس کا طول چار گز اور عرض پونے دو گز ہے۔ یہ نیچے کی جانب گہرا نہیں تھا۔ بلکہ ایک مختصر راستے کے بازو میں اوپر کی چٹانوں کے باہم ملنے سے ایک کوتل کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔ آپ ﷺ رمضان بھر اس غار میں قیام فرماتے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔ کائنات کے مشاہد اور اس کے پیچھے کار فرما قدرتِ نادرہ پر غور فرماتے۔ آپ ﷺ کو اپنی قوم کے لچر پوچ شرکیہ عقائد اور واہیات تصورات پر

بالکل اطمینان نہ تھا۔ لیکن آپ ﷺ کے سامنے کوئی واضح راستہ، معین طریقہ اور افراط و تفریط سے ہٹی ہوئی کوئی ایسی راہ نہ تھی، جس پر آپ ﷺ اطمینان وانشراح قلب کے ساتھ رواں دواں ہو سکتے۔

نبی ﷺ کی یہ تنہائی پسندی بھی در حقیقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا ایک حصہ تھی تا کہ زمین کے مشاغل، زندگی کے شور، اور لوگوں کے چھوٹے چھوٹے ہم و غم کی دنیا سے آپ کا کٹنا اس کارِ عظیم کی تیاری کے لیے پلٹنے کا نقطہ ہو جس کا دنیا کو انتظار تھا اور آپ امانتِ کبریٰ کا بوجھ اٹھانے، روئے زمین کو بدلنے اور خطِ تاریخ کو موڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اللہ نے رسالت کی ذمہ داری عائد کرنے سے تین سال پہلے آپ ﷺ کے لیے یہ خلوت نشینی مقدر کر دی۔ آپ ﷺ اس خلوت میں ایک ماہ تک کائنات کی آزاد روح کے ساتھ ہم سفر رہتے اور اس وجود کے پیچھے چھپے ہوئے غیب کے اندر تدبر فرماتے تا کہ جب اللہ تعالیٰ کا اذن ہو تو اس غیب کے ساتھ تعامل کے لیے مستعد رہیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا نیند میں اچھے خواب سے ہوئی۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے تھے وہ سپیدۂ صبح کی طرح نمودار ہوتا تھا، پھر آپ کو تنہائی محبوب ہو گئی۔ چنانچہ آپ غارِ حرا میں خلوت اختیار فرماتے اور کئی کئی رات گھر تشریف لائے بغیر مصروفِ عبادت رہتے۔ اس کے لیے آپ توشہ لے جاتے۔ پھر (توشہ ختم ہونے پر) حضرت خدیجہؓ کے پاس واپس آتے اور تقریباً اتنے ہی دنوں کے لیے پھر توشہ لے جاتے۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس حق آیا اور آپ غارِ حراء میں تھے کہ آپ کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا پڑھو۔ آپ نے فرمایا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس پر اس نے مجھے پکڑ کر اس زور سے دبایا کہ میری قوت نچوڑ دی۔ پھر چھوڑ کر کہا: پڑھو! میں نے کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے دوبارہ پکڑ کر دبوچا۔ پھر چھوڑ کر کہا: پڑھو! میں نے پھر کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے تیسری بار پکڑ کر دبوچا، پھر چھوڑ کر کہا :۔

''اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ﴿١﴾ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿٢﴾ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ﴿٣﴾ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝''۔

"پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، انسان کو لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا رب نہایت کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا"۔

ان آیات کے ساتھ رسول اللہ ﷺ پلٹے۔ آپ ﷺ کا دل دَھک دَھک کر رہا تھا۔ حضرت خَدِیجہؓ بنت خویلد کے پاس تشریف لائے اور فرمایا مجھے چادر اوڑھادو، مجھے چادر اڑھادو۔ انہوں نے آپ ﷺ کو چادر اوڑھادی یہاں تک کہ خوف جاتا رہا۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کو واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ مجھے تو اپنی جان کا ڈر لگتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا قطعاً نہیں۔ واللہ! آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ رسوا نہ کرے گا۔ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ درماندوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ تہی دستوں کا بند وبست کرتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہ کرے گا۔

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے چچیرے بھائی وَرَقَہ بن نَوفل بن اسد بن عبد العزیٰ کے پاس لے گئیں۔ ورقہ دورِ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے اور عبرانی میں لکھنا جانتے تھے۔ چنانچہ عبرانی زبان میں حَسبِ توفیق الٰہی انجیل لکھتے تھے۔ اس وقت بہت بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے، ان سے حضرت خدیجہؓ نے کہا: بھائی جان! آپ اپنے بھتیجے کی بات سنیں۔ ورقہ نے کہا: بھتیجے! تم کیا دیکھتے ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا بیان فرمادیا، اس پر ورقہ نے آپ سے کہا: یہ تو وہی ناموس ہے جسے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا۔ کاش! میں اس وقت توانا ہوتا۔ کاش! میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اچھا! تو کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا: ہاں! جب بھی کوئی آدمی اس طرح کا پیغام لایا جیسا تم لائے ہو تو اس سے ضرور دشمنی کی گئی اور اگر میں نے تمہارا زمانہ پالیا تو تمہاری زبردست مدد کروں گا۔ اس کے بعد ورقہ جلد ہی فوت ہو گئے اور وحی رک گئی۔

غار حراء کو جانے والا راستہ

غار حراء

(مکہ مکرمہ کے قریب واقع پہاڑ جبلِ نور میں واقع ایک غار، جہاں پہلی وحی نازل ہوئی۔ یہ غار پہاڑ کی چوٹی پر نہیں بلکہ اس تک پہنچنے کے لیے ساٹھ ستر میٹر نیچے مغرب کی سمت جانا پڑتا ہے۔ نشیب میں اتر کر راستہ پھر بلندی کی طرف جاتا ہے جہاں غارِ حرا واقع ہے۔ غار پہاڑ کے اندر نہیں بلکہ اس کے پہلو میں تقریباً خیمے کی شکل میں اور ذرا باہر کو ہٹ کر ہے۔ کم و بیش نصف میٹر موٹے اور پونے دو میٹر تک چوڑے اور تین چار میٹر لمبے چٹانی تختے پہاڑ کے ساتھ اس طرح ٹکے ہوئے ہیں کہ متساوی الساقین مثلث جیسے منہ والا غار بن گیا ہے، جس کا ہر ضلع اڑھائی میٹر لمبا اور قاعدہ تقریباً ایک میٹر ہے۔ غار کی لمبائی سوا دو میٹر ہے اور اس کی اونچائی آگے کو بتدریج کم ہوتی گئی ہے۔ غار کا رخ ایسا ہے کہ سارے دن میں سورج اندر نہیں جھانک سکتا۔ نبی کریم ﷺ جب چالیس سال کے ہوئے تو آپ چند روز کی خوراک ساتھ لے کر جبل نور پر آتے اور اس غار میں غور و فکر اور عبادت فرماتے تھے۔ یہیں ایک روز جبرائیل علیہ السلام امین نمودار ہوئے اور نبی ﷺ پر سب سے پہلی وحی نازل کی جس کے ذریعے باری تعالیٰ نے آپ کو نبی آخر الزماں مبعوث کیا)۔

اعلان نبوت کے بعد کے واقعات

اعلان نبوت کے بعد کے واقعات کو ہم تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:۔

۔1۔پہلا دور: پس پردہ دعوت (ابتدائی تین سال)۔

۔2۔دوسرا دور: اعلانیہ دعوت (4 سن نبوی تا 10 سن نبوی کے اواخر تک)۔

۔3۔تیسرا دور: مکہ کے باہر اسلام کی دعوت اور پھیلاؤ (سن 11 نبوی تا ہجرت مدینہ)۔

شروع ہی میں حضرت خدیجہؓ، آپ کے چچازاد حضرت علیؓ آپ ﷺ کے قریبی دوست حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے آزاد کردہ غلام اور صحابی حضرت زید بن ثابت آپ ﷺ پر ایمان لے آئے۔مکہ کے باہر سے پہلے شخص حضرت ابوذر غفاریؓ تھے جو اسلام لائے۔پہلے تو آپ ﷺ نے قریبی ساتھیوں میں تبلیغ کی پھر تقریباً پہلی وحی کے تین سال بعد آپ ﷺ نے دعوتِ ذوالعشیرہ کے بعد سے اسلام کے پیغام کی کھلی تبلیغ شروع کی۔

نماز کا حکم

ابتداء میں جو کچھ نازل ہوا اس میں نماز کا حکم بھی تھا۔مقاتل بن سلیمان کہتے ہیں کہ ابتداء میں دو رکعت صبح اور دو رکعت شام کی نماز فرض ہوئی تھی، صحابہ کرامؓ گھاٹیوں میں چھپ کر یہ نماز ادا کرتے تھے (ابن ہشام)۔

پہلے دور کی خصوصیات

جماعت المسلمین کا تیار ہونا

نبی کریم ﷺ کی خفیہ دعوت کے نتیجے میں مسلمانوں کی ایک چھوٹی جماعت تیار ہو گئی اگر آپ ﷺ شروع میں ہی اعلانیہ دعوت دیتے تو شاید یہ جماعت تیار نہ ہو سکتی کیونکہ مشرکین نے آپ ﷺ کی فوراً مخالفت شروع کر دینی تھی اور آپ ﷺ کی دعوت کو ناکام بنانے کے لئے پوری توانائی صرف کر دینی تھی۔

اشاعت اسلام

آہستہ آہستہ تین سالوں میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہونے لگی اور لوگ اسلام قبول کرتے رہے۔ اس لئے کہ دیے سے دیا روشن ہوتا ہے اور اسلام کافی حد تک پھیل گیا۔

احکامِ الٰہی کا نزول

اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر مختلف احکامات نازل کیے، مثلاً نماز ادا کرنے کا حکم نازل ہوا، اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی مسلمانوں کی رہنمائی کرتا تھا۔

دوسرا دور..... اعلانیہ دعوت

قرابت داروں کو دعوت

اظہار دعوت کے متعلق سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا۔

و انذر عشیرتک الاقربین(سورۃ الشعراء)۔

ترجمہ: آپ ﷺ اپنے نزدیک ترین قرابت داروں کو ڈرایئے۔

نبی ﷺ نے بنی نوع ہاشم کو جمع کر کے دعوت دی تو ابو لہب نے سب سے پہلے دعوت کو جھٹلایا۔

نبی ﷺ نے دوبارہ لوگوں کو اکٹھا کیا اور اسلام کا پیغام انہیں دیا۔ ابو لہب نے پھر کہا، اللہ کی قسم یہ برائی ہے اس کے ہاتھ تم دوسروں سے پہلے ہی پکڑ لو۔

کوہ صفاء پر خطاب

ایک دن نبی کریم ﷺ نے صفاء پہاڑی پر چڑھ کر "یا صباحا یا صباحا" کی صدا لگا کر لوگوں کو اکٹھے کر کے اسلام کی دعوت دی تو ابو لہب نے کہا۔

"تبا لک یا محمد الھذا جمعتنا" (اے محمد! تو تباہ ہو جائے تو نے ہمیں اسی لئے یہاں جمع کیا تھا)۔

حق کا واشگاف اعلان

اس آواز کی گونج ابھی مکے میں ہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرمایا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ (94) (سورۃ الحجر 15:94)۔

(پس آپ ﷺ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اسے (بلا جھجک) بجا لائیں اور مشرکوں کی (رکاوٹوں کی) پروانہ کریں)۔

قریش ابو طالب کی خدمت میں

قریش نے ابو طالب کی خدمت میں پیش ہو کر کہا کہ اپنے بھتیجے کو روکو وہ ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتا ہے۔ ہمارے دین پر عیب چینی کرتا ہے ابو طالب نے جواباً نرم بات کہی، اس کے بعد آپ ﷺ کو لالچ دینے کی بھی کوشش کی گئی مگر آپ ﷺ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

پہلی ہجرت حبشہ

4 نبوی میں جو جور و ستم شروع ہونے والا سلسلہ بڑھتا اپنے شباب کو پہنچ گیا حتی کہ مسلمانوں کا مکہ میں رہنا مشکل ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ نے حالات کے پیشِ نظر مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔

دوسری ہجرت حبشہ

ہجرت کرنے کے بعد مسلمانوں کو غلط فہمی ہوئی کہ کفار کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے اتحاد کر لیا تو وہ واپس آ گئے۔ واپسی پر خبر غلط معلوم ہوئی تو دوبارہ حبشہ چلے گئے۔ اس دفعہ قریباً 82 مرد اور 19 عورتوں نے شرکت کی۔

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا قبول اسلام

نبی کریم ﷺ اکثر دعا کرتے تھے کہ یا اللہ عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام (ابو جہل) کو مسلمان کر دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا قبول کی اور حضرت عمرؓ مسلمان ہو گئے اور حضرت حمزہؓ ان سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔

شعبِ ابی طالب میں محصوری

قبائل نے ایک معاہدہ کے تحت مسلمانوں کا معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ کیا۔ یہاں تک کہ مسلمان تین سال شعبِ ابی طالب میں محصور رہے۔ یہ بائیکاٹ اس وقت ختم ہوا جب کعبہ پر لٹکے ہوئے معاہدے میں یہ دیکھا گیا کہ لفظ "اللہ" کے علاوہ تمام حروف دیمک کی وجہ سے کھائے گئے ہیں۔

عامُ الحزن

619ء میں آپ ﷺ کی بیوی حضرت خدیجہؓ اور آپ ﷺ کے چچا ابو طالب انتقال فرما گئے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے اس سال کو عام الحزن یعنی دکھ کا سال قرار دیا۔

دوسرے دور کی خصوصیات

حق کا واشگاف اعلان

اس دور میں اعلانیہ دعوت کا حکم نازل ہوا، نبی کریم ﷺ نے پہلے تین سال خفیہ تبلیغ کی، پھر رشتہ داروں کو دعوت دی اور اس کے بعد اعلانیہ دعوت دی۔

ابو لہب کا قریش کو خطرے سے آگاہ کرنا

نبی کریم ﷺ نے خاندان بنو ہاشم کو دعوت دی تو ابو لہب نے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ محمد ﷺ جس دعوت کو لے کر اٹھا ہے وہ مستقبل میں ہمارے لئے خطرناک ہو سکتی ہے لہٰذا ابھی اس کو روک دو۔

مشرکین کی پریشانی

اعلانیہ دعوت سے مکے کے تمام مشرکین پریشان ہو گئے کیونکہ وہ اپنے خود ساختہ مذہب کی حقیقت سے آگاہ تھے وہ ہر وقت نبی کریم ﷺ کی دعوت کو ناکام بنانے کے لئے منصوبے بناتے رہتے تھے۔

مسلمانوں پر تکالیف کے پہاڑ

جب رسول پاک ﷺ کی تبلیغ نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا تو مشرکین مکہ نے نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کو تکالیف دینا شروع کر دی حضرت خبابؓ کو انگاروں پر لٹایا جاتا، حضرت بلالؓ کو تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جاتا اس طرح دیگر صحابہ کرام کو اذیتیں دی جاتیں تھیں۔

اسلام کی بنیادوں کا مضبوط ہونا

اس دور میں کچھ ایسے لوگ بھی ایمان لائے جو اسلام کی تقویت کا باعث بنے، مثلاً حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ اس کے بعد کفار کے ظلم و ستم کا زور ٹوٹ گیا اور مسلمانوں کو اسلام پھیلانے میں سہولت ہو گئی۔

ہجرت کی اجازت

جب مخالفت حد سے بڑھ گئی تو آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو حبشہ جہاں ایک عیسائی بادشاہ نجاشی حکومت کرتا تھا کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔

نبی ﷺ کو غم پہنچنا

اس دور میں آپ ﷺ کے محبوب چچا جناب ابو طالب کا انتقال ہوا اس کے بعد حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا ان کی وفات سے نبی کریم ﷺ کو بہت غم پہنچا۔

تیسرا دور..... مکہ سے باہر اسلام کی دعوت

طائف میں تبلیغ

نبی کریم ﷺ نے مکہ سے باہر تبلیغ کرنے کے لئے وادی طائف کا انتخاب کیا، آپ ﷺ نے طائف پہنچ کر وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے پتھر مار مار کر آپ ﷺ کو لہولہان کر دیا۔ طائف کے لوگوں کے رویے نے آپ ﷺ کی پریشانی میں اور اضافہ کر دیا اور اگر چند لوگ بھی ایمان لے آتے تو آپ ﷺ کو بہت خوشی ہوتی۔

حضرت عائشہ سے نکاح

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کر لیا، یہ واقعہ معراج سے پہلے پیش آیا۔

معراج النبی ﷺ اور نماز کی فرضیت

مسجد اقصیٰ، جہاں سے سفر معراج کی ابتداء ہوئی

620ء میں آپ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے۔ اس سفر کے دوران میں آپ ﷺ مکہ سے مسجد اقصیٰ گئے اور وہاں تمام انبیائے کرام کی نماز کی امامت فرمائی۔ پھر آپ ﷺ آسمانوں میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے تشریف لے گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جنت اور دوزخ دکھائی۔ وہاں آپ کی ملاقات مختلف انبیائے کرام سے بھی ہوئی۔ اسی سفر میں نماز بھی فرض ہوئی (مناقب شہر آشوب جلد اول صفحہ 43)۔

بیعت عقبہ اولیٰ و ثانیہ

نبوت کے گیارہویں سال یثرب کے چھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی تبلیغ سے مزید سات آدمیوں نے اسلام قبول کیا اور عقبہ کے مقام پر نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ نبوت کے تیرہویں سال ستر سے زیادہ لوگ فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے تشریف لائے اور انہوں نے چھپ کر عقبہ گھاٹی میں رات کے وقت نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اس بیعت کا نام بیعت عقبہ ثانیہ ہے۔

تیسرے دور کی خصوصیات

۔الف۔ طائف کے لوگوں نے آپ ﷺ پر پتھر برسائے تو اللہ نے فرشتہ بھیجا کہ اے پیغمبر اگر آپ کہیں تو ہم طائف والوں کو تباہ کر دیتے ہیں مگر آپ ﷺ نے ان کے لئے ہدایت کی دعا فرمائی۔ فتح مکہ کے بعد وہی لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں قیدی کی حیثیت سے پیش ہوئے تو آپ ﷺ نے سب کو معاف کر دیا۔

۔ب۔ اس دور کی نمایاں خصوصیت پانچ نمازوں کی فرضیت ہے۔

۔ج۔ حضرت خدیجہؓ اور جناب ابو طالب کی وفات سے آپ ﷺ بہت پریشان تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آسمانوں کی سیر کروائی جس نے آپ ﷺ کی پریشانی کو ختم کر دیا۔

مکی زندگی میں آپ ﷺ میں پائی جانے والی خوبیاں

امانت و دیانت اور پاکیزگی و شرافت

مکی زندگی میں نبی اکرم ﷺ کی سب سے بڑی شناخت تھی آپ کی صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی۔ مکی زندگی میں نبوت و رسالت سے سرفراز ہونے سے پہلے اور بعد کے زمانہ میں آپ کی شناخت آپ کی صداقت و امانت، شرافت و پاکیزگی، تواضع و انکساری اور تقوی و پاکبازی تھی۔ مکہ کا ہر باشندہ آپ ﷺ کی شرافت و پاکیزگی اور اعلی اخلاق کا قائل تھا۔ آپ ﷺ کو عام طور پر صادق اور امین کہا جاتا تھا(سیرۃ المصطفیٰ ۱:۱۱۶، بحوالہ سیرت ابن ہشام)۔

صبر و استقامت

نبی اکرم ﷺ کی مکی زندگی کا دوسرا سب سے واضح عنصر آپ کا بے پناہ جذبۂ صبر و استقامت، اولوالعزمی اور اپنے صحیح موقف پر پہاڑ کی طرح قائم رہنے کی قوت تھی۔ تبلیغِ اسلام اور دعوتِ حق کے بعد مکہ کی اکثریت آپ کے خلاف تھی۔ وہ ہمیشہ آپ کے اور مٹھی بھر مسلمانوں کے درپئے آزار رہتے، انھیں تکلیفیں پہنچاتے، ایذائیں دیتے اور دن رات اسلام، پیغمبر اسلام اور متبعینِ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے۔ نبی اکرم ﷺ نے کفار مکہ کے اس برتاؤ کا جواب صبر و خاموشی اور ہمت و استقامت سے دیا۔ آپ نے دعوتِ حق کے اپنے موقف سے ذرہ برابر پیچھے ہٹنا گوارا نہیں کیا، حتی کہ آپ کو پورے عرب کی بادشاہت، مال و دولت، حسین ترین عورتوں اور ہر خواہش کی چیز پیش کیے جانے کی پیش کش بھی کی گئی، لیکن آپ نے اس دعوتِ حق کے سامنے ہر کسی پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ آپ نے خواجہ ابو طالب کی فہمائش کے جواب میں فرمایا کہ چچا اگر میرے ایک ہاتھ میں چاند دوسرے میں سورج رکھ دیا جائے اور کہا جائے کہ اس کام سے باز رہو، تو بھی میں ایسا نہیں کر سکتا۔

تصادم سے گریز اور دعوت و تبلیغ کا تسلسل

آپ ﷺ نے اس صبر آزما اور مخالف ماحول میں اہلِ مکہ کے سامنے اعلیٰ اخلاقی نمونہ پیش کیا۔ گالیوں کا جواب دعاؤں سے، پتھر کا جواب نرم کلامی سے، دل آزاری کا جواب ہمدردی و غم گساری سے دیا۔ آپ نے اس ماحول میں تصادم سے گریز کیا اور حکمت و بصیرت کے ساتھ کام کرتے رہے۔ لوگوں کی بھلائی اور دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے ان کو خدائے واحد اور اللہ کے پسندیدہ دین کی طرف بلاتے رہے۔ دعوت و تبلیغ کا جو فرضِ منصبی آپ نے اٹھایا تھا، اس پر پوری دلجمعی، استقامت اور سختی سے قائم رہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی دعوت دلوں کے قلعوں کو تسخیر کرتی چلی گئی اور مکہ کی ایک بڑی تعداد نے مخالف ماحول میں بھی اسلام میں کشش محسوس کی۔ جو لوگ کل تک آپ کے مشن کے شدید ترین دشمن تھے، وہ آپ کے اخلاق عالیہ اور دعوت حق کی گرمی سے پگھل کر پانی پانی ہو جاتے اور اہل ایمان کے حلقے میں شامل ہو جاتے۔

سبق نمبر 6

حضور ﷺ کی مدنی زندگی اور اس کے واقعات و اسباق

Life of Holy Prophet in Madina.,Important Events of Holy Prophet in Madina.,Important Lesson Derived from the Life of Holy Prophet in Madina.

ہجرت

622ء تک مسلمانوں کے لیے مکہ میں رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ کئی دفعہ مسلمانوں اور خود حضرت محمد ﷺ کو تکالیف دیں گئیں۔ اس وجہ سے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے حضرت ابو بکر کے ساتھ ستمبر 622ء میں مدینہ کی طرف روانہ ہوئے اور مدینہ میں اپنی جگہ حضرت علی بن ابی طالب ؓ کو امانتوں کی واپسی کے لیے چھوڑا۔ حضور ﷺ کے مدینہ پہنچنے پر انصار نے ان کا شاندار استقبال کیا اور اپنے تمام وسائل پیش کر دیے۔ جب آپ ﷺ مدینہ پہنچے تو انصار استقبال کے لیے آئے اور خواتین چھتوں پر سے دیکھ رہی تھیں۔ اور دف بجا کر کچھ اشعار پڑھ رہی تھیں:۔

طلع البدر علينا　　من ثنيات الوداع

وجب الشكر علينا　　ما دعـا لله داع

أيها المبعوث فينا　　جئت بالأمر المطاع

جئت شرفت المدينة　　مرحباً يا خير داع

ہم پر چودھویں کی رات کا چاند طلوع ہو گیا وداع کی پہاڑیوں سے۔ ہم پر شکر واجب ہے جب تک کوئی اللہ کو پکارنے والا اللہ کو پکار تا رہے۔ اے رب کی طرف سے مبعوث کیے ہوئے تو ہم میں ایسا حکم لایا ہے جس کی تابع داری کی جائے گی۔ تیرے آنے سے مدینہ منور ہوا، اے خیر کی طرف بلانے والے تجھے خوش آمدید ہے۔

آپ ﷺ کی اونٹنی حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر کے سامنے رکی اور حضور ﷺ نے ان کے گھر قیام فرمایا۔ جس جگہ اونٹنی رکی تھی اسے حضور ﷺ نے قیمتاً خرید کر ایک مسجد کی تعمیر شروع کی جو مسجد نبوی کہلائی۔ اس تعمیر میں انہوں نے خود بھی حصہ لیا۔ یہاں حضور ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان میں عقدِ مؤاخات کیا یعنی مسلمانوں کو اس طرح بھائی بنایا کہ انصار میں سے ایک کو مہاجرین میں سے ایک کا بھائی بنایا۔ خود حضرت علیؓ کو اپنا بھائی قرار دیا۔ انصار نے مہاجرین کی مثالی مدد کی۔ ہجرت کے ساتھ ہی اسلامی تقویم کا آغاز بھی ہوا۔ آپ کے مدینہ آنے سے، اوس اور خزرج، یہاں کے دو قبائل جنہوں نے بعد میں اسلام قبول بھی کیا، میں لڑائی جھگڑا ختم ہوا اور ان میں اتحاد اور بھائی چارہ پیدا ہو گیا۔ اس کے علاوہ یہاں کچھ یہودیوں کے قبائل بھی تھے جو ہمیشہ فساد کا باعث بنتے تھے۔ آپ ﷺ کے آنے کے بعد یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان میں ہونے والے معاہدہ "میثاق مدینہ" نے مدینہ میں امن کی فضا پیدا کر دی۔ اسی دور میں مسلمانوں کو کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا، اس سے پہلے مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے جو یہودیوں کا بھی قبلہ تھا۔

میثاقِ مدینہ

میثاق مدینہ کو بجا طور پر تاریخ انسانی کا پہلا تحریری دستور قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ 730 الفاظ پر مشتمل ایک جامع دستور ہے جو ریاست مدینہ کا آئین تھا۔ 622ء میں ہونے والے اس معاہدے کی 53 دفعات تھیں۔ یہ معاہدہ اور تحریری دستور مدینہ کے قبائل (بشمول یہود و نصاریٰ) کے درمیان میں جنگ نہ کرنے کا بھی عہد تھا۔ معاہدے کا بکثرت ثبوت پوری تفصیل کے ساتھ کتبِ تواریخ میں ملتا ہے۔ مگر اس کے باوجود مغربی مصنفین اسے نظر انداز کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ (ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، مکتبۃ المعارف بیروت الطبعۃ الثانیۃ 1978ء، محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، الوثائق السیاسیۃ، دارالارشاد، بیروت، محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، اردو اکیڈمی سندھ 1981ء)۔

یہود و مشرکین کی سازشیں

میثاقِ مدینہ کے بعد یہود مجبور تھے کہ وہ علی الاعلان حضرت محمد ﷺ اور اسلام کے خلاف بات نہ کر سکتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے خفیہ سازشیں شروع کیں جن میں سے ایک ادب اور اظہارِ آزادی کی آڑ میں حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی حملہ کرنا تھا۔ عرب لوگ جو شعر و شاعری کے بڑے خوگر تھے ان کے لیے شاعری کے ذریعے حضور ﷺ کی ہتک کرنے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ اسلام میں ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک حضور ﷺ کی ذات کی اہمیت و درجہ مال و جان و اولاد سے زیادہ نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں تین شعرا نے حضرت محمد ﷺ کے خلاف ہجو لکھیں۔ ایک کا نام کعب بن الاشرف تھا جو یہودی تھا۔ دوسری کا نام اسماء بنت مروان تھا اور تیسرے کا نام ابو عفک تھا۔ جب وہ شاعر حد سے گزر گئے اور ان کے رکیک اشعار سے حضرت محمد ﷺ کو شدید رنج پہنچا تو ان تینوں کو انہی کے قبیلے کے افراد نے قتل کر ڈالا۔ کعب بن الاشرف کو ان کی ایک رشتہ دار ابو نائلہ نے قتل کیا۔ اسماء بنت مروان کو ان کے ہم قبیلہ ایک نابینا صحابی عمیر بن عوف ؓ نے قتل کر دیا۔ ابو عفک کو حضرت سالم بن عمیر ؓ نے قتل کیا۔ (حرفِ زار از اوریا مقبول جان)۔

جنگیں

مدینہ میں ایک ریاست قائم کرنے کے بعد مسلمانوں کو اپنے دفاع کی کئی جنگیں لڑنا پڑیں۔ ان میں سے جن میں حضور ﷺ شریک تھے انہیں غزوہ کہتے ہیں اور جن میں وہ شریک نہیں تھے انہیں سریہ کہا جاتا ہے۔ اہم غزوات یا سریات درج ذیل ہیں۔

غزوہ بدر :۔ 17 رمضان 2ھ (17 مارچ 624ء) کو بدر کے مقامات پر مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان میں غزوہ بدر ہوئی۔ مسلمانوں کی تعداد 313 جبکہ کفار مکہ کی تعداد 1000 تھی۔ مسلمانوں کو جنگ میں فتح ہوئی۔ 70 مشرکینِ مکہ مارے گئے۔ جن میں سے 36 حضرت علی ؓ کی تلوار سے ہلاک ہوئے۔ مشرکین 70 جنگی قیدیوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسلمان شہداء کی تعداد 14 تھی۔ جنگ میں فتح کے بعد مسلمان مدینہ میں ایک اہم قوت کے طور پر ابھرے۔

غزوہ احد :۔ 7شوال 3ھ (23مارچ 625ء) میں ابوسفیان کفار کے 3000 نفری لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ احد کے پہاڑ کے دامن میں ہونے والی یہ جنگ غزوہ احد کہلائی۔ آپ نے مسلمانوں کے ایک گروہ کو ایک ٹیلے پر مقرر فرمایا تھا اور یہ ہدایت دی تھی کہ جنگ کا جو بھی فیصلہ ہو وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ ابتدا میں مسلمانوں نے کفار کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ٹیلے پر موجود لوگوں نے بھی یہ سوچتے ہوئے کہ فتح ہو گئی ہے کفار کا پیچھا کرنا شروع کر دیا یا مالِ غنیمت اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ خالد بن ولید نے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اس بات کا فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں پر پچھلی طرف سے حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اچانک تھا۔ مسلمانوں کو اس سے کافی نقصان ہوا لیکن کفار چونکہ پیچھے ہٹ چکے تھے اس لیے واپس چلے گئے۔ اس جنگ سے مسلمانوں کو یہ سبق ملا کہ کسی بھی صورت میں رسول اکرم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کریں۔

غزوہ خندق (احزاب):۔ شوال۔ ذی القعدہ 5ھ (مارچ 627ء) میں مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں سے جنگ کی ٹھانی۔ مگر مسلمانوں نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے مدینہ کے ارد گرد ایک خندق کھود لی۔ مشرکینِ مکہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ خندق کھودنے کی عرب میں یہ پہلی مثال تھی کیونکہ اصل میں یہ ایرانیوں کا طریقہ تھا۔ ایک ماہ کے محاصرے اور اپنے کئی افراد کے قتل کے بعد مشرکین مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ بعض روایات کے مطابق ایک آندھی نے مشرکین کے خیمے اکھاڑ پھینکے۔

غزوہ بنی قریظہ:۔ ذی القعدہ۔ ذی الحجہ 5ھ (اپریل 627ء) کو یہ جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

غزوہ بنی مصطلق:۔ شعبان 6ھ (دسمبر 627ء۔ جنوری 628ء) میں یہ جنگ بنی مصطلق کے ساتھ ہوئی۔ مسلمان فتح یاب ہوئے۔

غزوہ خیبر:۔ محرم 7ھ (مئی 628ء) میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان یہ جنگ ہوئی جس میں مسلمان فتح یاب ہوئے۔

جنگِ موتہ:۔ 5جمادی الاول 8ھ (اگست۔ ستمبر 629ء) کو موتہ کے مقام پر یہ جنگ ہوئی۔ اس میں حضور ﷺ شریک نہیں ہوئے تھے ۔

غزوہ فتح (فتحِ مکہ):۔ رمضان 8ھ (جنوری 630ء) میں مسلمانوں نے مکہ فتح کیا۔ جنگ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی کیونکہ مسلمانوں کی ہیبت سے مشرکینِ مکہ ڈر گئے تھے۔ اس کے بعد مکہ کی اکثریت مسلمان ہو گئی تھی۔

غزوہ حنین:۔ شوال 8ھ (جنوری۔ فروری 630ء) میں یہ جنگ ہوئی۔ پہلے مسلمانوں کو شکست ہو رہی تھی، حقیقت میں وہ رب کی طرف سے آزمائش تھیں کیونکہ بعض حضرات نے اپنی تعداد پر فخر کر لیا تھا کہ آج تو ہم مغلوب ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ ہماری تعداد زیادہ ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آئی کیونکہ جنگیں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت سے جیتی جاتیں ہیں نہ کہ کثرت سے۔ حضور ﷺ تنہا میدان میں نظر آ رہے تھے اور آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر یہ اشعار تھے:۔

انا النبی لا کذب

انا ابن عبد المطلب

(میں جھوٹا نبی نہیں ہوں، میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں)

تعداد پر فخر کرنے کی وجہ سے آزمائش آئیں لیکن بعد صحابہ کرامؓ حضور ﷺ کی طرف لوٹے اور مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فتح نصیب کی۔

غزوہ تبوک:۔ رجب 9ھ (اکتوبر 630ء) میں یہ افواہ پھیلنے کے بعد کہ بازنطینیوں نے ایک عظیم فوج تیار کر کے شام کے محاذ پر رکھی ہے اور کسی بھی وقت حملہ کیا جا سکتا ہے، مسلمان ایک عظیم فوج تیار کر کے شام کی طرف تبوک کے مقام پر چلے گئے۔ وہاں کوئی دشمن فوج نہ پائی اس لیے جنگ نہ ہو سکی مگر اس علاقے کے کئی قبائل سے معاہدے ہوئے اور جزیہ ملنے لگا اور مسلمانوں کی طاقت کے چرچے عرب میں دور دور تک ہو گئے۔

صلح حدیبیہ:۔ مدینہ اور مشرکینِ مکہ کے درمیان مارچ 628ء کو ایک معاہدہ ہوا جسے صلح حدیبیہ (عربی میں صلح الحدیبیہ) کہتے ہیں۔ 628ء (6 ہجری) میں 1400 مسلمانوں کے ہمراہ حضرت محمد ﷺ مدینہ سے مکہ کی طرف عمرہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ عرب کے رواج کے مطابق غیر

مسلح افراد چاہے وہ دشمن کیوں نہ ہوں، کعبہ کی زیارت کر سکتے تھے جس میں رسومات بھی شامل تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان تقریباً غیر مسلح تھے۔ مگر عرب کے رواج کے خلاف مشرکینِ مکہ نے حضرت خالد بن ولید (جو بعد میں مسلمان ہو گئے) کی قیادت میں دو سو مسلح سواروں کے ساتھ مسلمانوں کو حدیبیہ کے مقام پر مکہ کے باہر ہی روک لیا۔ اس وقت تک مسلمان انتہائی طاقتور ہو چکے تھے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اس وقت مسلمان جنگ کی تیاری کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ اسی لیے بعض لوگ چاہتے تھے کہ جنگ ضرور ہو۔ خود مسلمانوں میں ایسے لوگ تھے۔ جن کو معاہدہ کی شرائط پسند نہیں تھیں۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان مکہ کے لوگوں کے کے پاس چلا جائے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا مگر کوئی مشرک مسلمان ہو کر اپنے بزرگوں کی اجازت کے بغیر مدینہ چلا جائے تو اسے واپس کیا جائے گا۔ مگر حضرت محمد ﷺ کی دانشمندی سے صلح کا معاہدہ ہو گیا۔ اس کی بنیادی شق یہ تھی کہ دس سال تک جنگ نہیں لڑی جائے گی اور مسلمان اس سال واپس چلے جائیں گے اور عمرہ کے لیے اگلے سال آئیں گے۔ چنانچہ مسلمان واپس مدینہ آئے اور پھر 629ء میں حج کیا۔ اس معاہدہ سے پہلے جب مسلمانوں کے ایک نمائندے کو مشرکین نے روک لیا تھا تو حضور ﷺ نے مسلمانوں سے اپنی بیعت بھی لی۔ جسے بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے۔ اس بیعت میں مسلمانوں نے عہد کیا کہ وہ مرتے دم تک حضور ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اس معاہدہ کے بہت سود مند اثرات بر آمد ہوئے۔

حکمرانوں کو خطوط:۔ صلح حدیبیہ کے بعد محرم 7ھ میں حضور ﷺ نے مختلف حکمرانوں کو خطوط لکھے اور اپنے سفیروں کو ان خطوط کے ساتھ بھیجا۔ ان خطوط میں اسلام کی دعوت دی گئی۔ ان میں سے ایک خط ترکی کے توپ کاپی نامی عجائب گھر میں موجود ہے۔ ان حکمرانوں میں فارس کا بادشاہ خسرو پرویز، مشرقی روم (بازنطین) کا بادشاہ ھرکولیس، حبشہ کا بادشاہ نجاشی، مصر اور اسکندریہ کا حکمران مقوقس اور یمن کا سردار شامل ہیں۔ پرویز نے یہ خط پھاڑ دیا تھا اور بعض روایات کے مطابق حضور ﷺ نے پیشینگوئی کی تھی کہ اس کی سلطنت اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ نجاشی نے حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی اور کہا کہ ہمیں انجیل میں ان کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ مصر اور اسکندریہ کے حکمران مقوقس نے نرم جواب دیا اور حضور ﷺ کی خدمت میں کچھ تحائف روانہ کیے اور حضرت ماریہ قبطیہ کو روانہ کیا جن سے حضور ﷺ کے بیٹے ابراہیم کی ولادت ہوئی (الطبقات الکبریٰ جلد اول صفحہ 260 تا 262)۔

فتح مکہ:۔ اگرچہ صلح حدیبیہ کی مدت دس سال طے کی گئی تھی تاہم یہ صرف دو برس ہی نافذ رہ سکی۔ بنو قزعہ کا حضرت محمد ﷺ سے اتحاد تھا جبکہ ان کے مخالف بنو بکر قریش مکہ کے ساتھ تھے۔ ایک رات بنو بکر کے کچھ آدمیوں نے شب خون مارتے ہوئے بنو قزعہ کے کچھ لوگ قتل کر دیے۔ قریش نے ہتھیاروں کے ساتھ اپنے اتحادیوں کی مدد کی جبکہ بعض روایات کے مطابق چند قریش بذات خود بھی حملہ آوروں میں شامل تھے۔ اس واقعہ کے بعد نبی اکرم ﷺ نے قریش کو ایک تین نکاتی پیغام بھیجا اور کہا کہ ان میں سے کوئی منتخب کر لیں: 1۔ قریش بنو قزعہ کو خون بہا ادا کرے، 2۔ بنو بکر سے تعلق توڑ لیں، 3۔ صلح حدیبیہ کو کالعدم قرار دیں۔

قریش نے جواب دیا کہ وہ صرف تیسری شرط تسلیم کریں گے۔ تاہم جلد ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ابوسفیان کو معاہدے کی تجدید کے لیے روانہ کیا گیا لیکن نبی اکرم ﷺ نے اس کی درخواست رد کر دی۔ نبی اکرم ﷺ اس وقت تک قریش کے خلاف چڑھائی کی تیاری شروع کر چکے تھے۔

630ء میں انہوں نے دس ہزار مجاہدین کے ساتھ مکہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ مسلمانوں کی ہیبت دیکھ کر بہت سے مشرکین نے اسلام قبول کر لیا اور نبی اکرم ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا۔ ایک چھوٹی سی جھڑپ کے علاوہ تمام کارروائی پر امن انداز سے مکمل ہو گئی اور نبی اکرم ﷺ فاتح بن کر مکہ میں داخل ہو گئے۔ داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے آپ نے کعبہ میں موجود تمام بت توڑ ڈالے اور شرک و بت پرستی کے خاتمے کا اعلان کیا۔

حجۃ الوداع:۔ حضور ﷺ نے اپنی زندگی کا آخری حج سن 10ھ میں کیا۔ اسے حجۃ الوداع کہتے ہیں۔ آپ 25 ذی القعدہ 10ھ (فروری 632ء) کو مدینہ سے روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ کی ازواج آپ کے ساتھ تھیں۔ مدینہ سے 9 کلومیٹر دور ذوالحلیفہ کے مقام پر آپ ﷺ نے احرام پہنا۔ دس دن بعد آپ ﷺ مکہ پہنچ گئے۔ حج میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ تھی۔ عرفہ کے دن ایک خطبہ دیا اور اس سے اگلے دن منیٰ میں ایک یادگار خطبہ دیا جو خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اس خطبہ میں انہوں نے اسلامی تعلیمات کا ایک نچوڑ پیش کیا اور مسلمانوں کو گواہ بنایا کہ انہوں نے پیغامِ الٰہی پہنچا دیا ہے۔ اور یہ بھی تاکید کی کہ یہ باتیں ان لوگوں کو بھی پہنچائی جائیں جو اس حج میں شریک نہیں ہیں۔ اس خطبہ میں انہوں نے یہ فرمایا کہ شاید مسلمان انہیں اس کے بعد نہ دیکھیں۔ انہوں نے فرمایا کہ مسلمان پر دوسرے مسلمان کا جان و مال حرام ہے۔ اور یہ بھی کہ نسل کی بنیاد

پر کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہے۔ انہوں نے اسلام کے حرام و حلال پر بھی روشنی ڈالی۔ خطبہ کے آخر میں انہوں نے تاکید کی کہ جو حاضر ہے وہ غائب تک اس پیغام کو پہنچائے۔ ان دو خطبات کے علاوہ آپ ﷺ نے غدیرِ خم کے مقام پر بھی خطبہ دیا جو خطبہ غدیر کے نام سے مشہور ہے۔ اس حج کے تقریباً تین ماہ بعد آپ ﷺ اللہ کو پیارے ہو گئے (سیرت ابن ھشام جلد 3 صفحہ 603)۔

وفات:۔ حجۃ الوداع کے فوراً بعد آپ ﷺ کچھ بیمار ہوئے پھر ٹھیک ہو گئے مگر کچھ عرصہ بعد حضرت محمد ﷺ پھر بیمار پڑ گئے اور کئی روز تک ان کے سر میں درد ہوتا رہا۔ بالاخر روایات کے مطابق مئی یا جون 632ء میں حضرت محمد ﷺ انتقال کر گئے۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر 63 برس تھی۔ حضرت علیؓ وغیرہ نے غسل و کفن دیا اور اصحاب کی مختلف جماعتوں نے یکے بعد دیگرے نمازِ جنازہ ادا کی اور حضرت محمد ﷺ کو مسجد نبوی کے ساتھ ملحق ان کے حجرے میں اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں ان کی وفات ہوئی تھی۔ یہ اور اس کے ارد گرد کی تمام جگہ اب مسجدِ نبوی میں شامل ہے۔

آپ ﷺ کو منگل کے روز کپڑے اتارے بغیر غسل دیا گیا۔ رسول اللہ کو غسل دینے والے افراد میں سیدنا عباس، حضرت اسامہ، اوس بن خولیٰ، حضرت عباس کے دو صاحبزادے قثم اور فضل اور رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام شقران شامل تھے۔ حضرت عباس اور ان کے دونوں صاحب زادے رسول اللہ ﷺ کی کروٹ بدل رہے تھے، حضرت اسامہ اور شقران پانی بہا رہے تھے۔ حضرت علیؓ غسل دے رہے تھے اور حضرت اوس نے آپ ﷺ کو اپنے سینے پر ٹیک رکھا تھا (سنن ابن ماجہ، الکتاب الجنائز، حدیث 1628)۔

رسول اللہ کو پانی اور بیری کے پتوں سے تین بار غسل دیا گیا۔ پانی عرس نامی قباء میں واقع حضرت سعد بن خثیمہ کے کنویں کا تھا۔ آپ ﷺ اپنی حیات مبارکہ میں بھی پینے کے لیے اس کنویں کا پانی استعمال فرماتے تھے (طبقات ابن سعد)۔

پھر آپ ﷺ کو تین سفید سوتی یمنی چادروں میں کفنایا گیا۔ ان میں کرتا اور پگڑی نہ تھی بس آپ کو صرف چادروں میں لپیٹا گیا (طبقات ابن سعد)۔

حضرت ابو طلحہؓ نے آپ کی قبر اسی جگہ کھودی جہاں آپ نے وفات پائی تھی۔ قبر لحد والی کھودی پھر آپ کی چارپائی قبر کے کنارے رکھ دی گئی اور پھر دس دس صحابہ اندر داخل ہوتے جاتے اور فرداً فرداً نماز ادا کرتے، کوئی امام نہ تھا۔ سب سے پہلے آپ کے خانوادے نے نماز پڑھی، پھر مہاجرین نے، پھر انصار نے اور پھر بچوں نے، پھر عورتوں نے یا پہلے عورتوں نے پھر بچوں نے (صحیح البخاری، حدیث: 1264)۔

نماز جنازہ پڑھنے میں منگل کا پورا ہی دن اور منگل کی بیشتر رات گزر گئی جس کے بعد رات کے اواخر میں رسول اقدس ﷺ کو سپرد خاک کر دیا گیا (موطا امام مالک 1/231، وطبقات ابن سعد 292۔298)۔

امہات المومنین اور اولاد نبوی ﷺ

حضور ﷺ کی مختلف روایات میں گیارہ ازواج کے نام ملتے ہیں۔ جن عورتوں سے آپ ﷺ نے عقد فرمایا ان کی تعداد گیارہ تھی۔ جن میں سے نو عورتیں آپ ﷺ کی رحلت کے وقت حیات تھیں۔ اور دو عورتیں آپ ﷺ کی زندگی ہی میں وفات پا چکی تھیں۔ (یعنی حضرت خدیجہؓ اور ام المساکین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہما) ان کے علاوہ مزید دو عورتیں ہیں جن کے بارے میں اختلاف ہے کہ آپ ﷺ کا ان سے عقد ہوا تھا یا نہیں لیکن اس پر اتفاق ہے کہ انہیں آپ ﷺ کے پاس رخصت نہیں کیا گیا (الرحیق المختوم (اردو) صفحہ نمبر 634)۔

نبی کریم ﷺ کی ازواج میں زیادہ تر پہلے بیوہ تھیں اور عمر میں بھی زیادہ تھیں اور زیادہ شادیوں کا عرب میں عام رواج تھا۔ مؤرخین کے مطابق اکثر شادیاں مختلف قبائل سے اتحاد کے لیے یا ان خواتین کو عزت دینے کے لیے کی گئیں۔ ان میں سے اکثر سن رسیدہ تھیں۔ اس لیے حضور ﷺ پر کثرت ازدواج کا الزام لگانے والوں کی دلیلیں ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے صرف حضرت خدیجہ اور حضرت ماریہ قبطیہ سے اولاد ہوئی۔ حضور ﷺ کی ازواج کو امہات المؤمنین کہا جاتا ہے یعنی مؤمنین کی مائیں۔ ان کے نام اور کچھ حالات درج ذیل ہیں۔

حضرت خدیجہؓ: آنحضرت ﷺ کی پہلی شادی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنھا سے ہوئی۔ شادی کے وقت آپ ﷺ کی عمر پچیس سال تھی۔ اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی۔ ان کے جیتے جی آپ ﷺ نے کوئی اور شادی نہیں کی۔ آپ ﷺ کی اولاد میں حضرت ابراہیم کے ماسوا تمام صاحبزادے اور صاحبزادیاں حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھیں۔ صاحبزادگان میں سے تو کوئی زندہ نہ بچا۔ البتہ صاحبزادیاں حیات رہیں۔ ان کے نام یہ ہیں : زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ ۔ زینبؓ کی شادی ہجرت سے پہلے ان کے پھوپھی زاد بھائی حضرت ابو العاص بن ربیع سے ہوئی۔ رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما کی شادی یکے بعد دیگرے حضرت عثمانؓ سے ہوئی۔ حضرت فاطمہؓ کی شادی جنگ بدر اور جنگ احد کے درمیانی عرصہ میں حضرت علی بن

ابی طالب سے ہوئی۔ اور ان کے بطن سے حسن، حسین رضی اللہ عنہما، زینب اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما پیدا ہوئیں (الرحیق المختوم (اردو) صفحہ نمبر 634)۔

حضرت سودہ بنت زمعہ ؓ: ان سے رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہ ؓ کی وفات کے تقریباً ایک مہینہ بعد نبوت کے دسویں سال ماہ شوال میں شادی کی۔ آپ ﷺ سے پہلے حضرت سَوْدَہ ؓ اپنے چچیرے بھائی سکران بن عَمرو کے عقد میں تھیں۔ اور وہ انہیں بیوہ چھوڑ کر انتقال کر چکے تھے۔ حضرت سودہ کی وفات شوال 54ھ میں مدینہ کے اندر ہوئی (الرحیق المختوم (اردو) صفحہ نمبر 635)۔

حضرت زینب بنت خزیمہ ؓ: یہ قبیلہ بنو ہلال بن عامر بن صَعْصَعہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ مسکینوں پر رحم و مروت اور رقّت و رأفت کے سبب ان کا لقب اُمّ المساکین پڑ گیا تھا۔ یہ حضرت عبد اللہ بن جحش ؓ کے عقد میں تھیں۔ وہ جنگ اُحد میں شہید ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے 4ھ میں ان سے شادی کر لی۔ مگر صرف تین ماہ یا آٹھ ماہ رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں رہ کر ربیع الآخر یا ذی قعدہ 4ھ میں وفات پا گئیں۔ نبی ﷺ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اور انہیں بقیع میں دفن کیا گیا۔

حضرت ام سلمہ ہند:۔ یہ ابو سلمہ ؓ کے عقد میں تھیں۔ جمادی الآخر 4ھ میں حضرت ابو سلمہ ؓ کا انتقال ہو گیا تو ان کے بعد شوال 4ھ میں رسول اللہ ﷺ نے ان سے شادی کر لی۔ فقیہ ترین اور نہایت عقلمند خاتون تھیں۔ چوراسی سال کی عمر میں 59ھ میں اور کہا جاتا ہے کہ 62ھ میں وفات پائی۔ اور بقیع میں دفن کی گئیں (الرحیق المختوم (اردو) صفحہ نمبر 635)۔

حضرت صفیہ بنت حی بن اخطب :۔ یہ بنی اسرائیل سے تھیں۔ اور خیبر میں قید کی گئیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنے لیے منتخب فرمالیا۔ اور آزاد کر کے شادی کر لی۔ یہ فتح خیبر 7ھ کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد خیبر سے بارہ میل کی دوری پر مدینہ کے راستہ میں سد صہباء کے پاس انہیں رخصت کرایا۔ 50ھ میں اور کہا جاتا ہے کہ 52ھ میں اور کہا جاتا ہے کہ 36ھ میں وفات پائی۔ اور بقیع میں مدفون ہوئیں۔

حضرت جویریۃ بنت الحارث :۔ ان کے والد قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو المصطلق کے سردار تھے۔ حضرت جویریہ بنو المصطلق کے قیدیوں میں لائی گئی تھیں۔ اور حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ کے حصے میں پڑی تھیں۔ انہوں نے حضرت جویریہؓ سے مکاتبت کرلی۔ یعنی ایک مقررہ رقم کے عوض آزاد کر دینے کا معاملہ طے کر لیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف سے مقررہ رقم ادا فرمادی اور ان سے شادی کرلی۔ یہ شعبان 5ھ یا 6ھ کا واقعہ ہے۔ اس شادی کے نتیجے میں مسلمانوں نے بنو المصطلق کے سو گھرانے آزاد کر دیے اور کہا کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے سسرالی ہیں۔ چنانچہ یہ اپنی قوم کے لیے ساری عورتوں سے بڑھ کر بابرکت ثابت ہوئیں۔ ربیع الاول 56ھ یا 55ھ میں وفات پائی۔ عمر 65 برس تھی (الرحیق المختوم (اردو) صفحہ نمبر 636)۔

حضرت میمونۃ بنت الحارث الہلالیۃ :۔ یہ ام الفضل لبابہ بنت حارثؓ کی بہن تھیں۔ ان سے رسول اللہ ﷺ نے ذی قعدہ 7ھ میں عمرۂ قضاء سے فارغ ہونے... اور صحیح قول کے مطابق احرام سے حلال ہونے کے بعد شادی کی اور مکہ سے 9 میل دور مقام سرف میں انھیں رخصت کرایا۔ 61ھ اور کہا جاتا ہے کہ 63ھ میں وہیں ان کی وفات بھی ہوئی۔ اور وہیں دفن بھی کی گئیں۔ ان کی قبر کی جگہ آج بھی وہاں معروف ہے (الرحیق المختوم (اردو) صفحہ نمبر 636)۔

حضرت ام حبیبہ رملہ :۔ یہ عبید اللہ بن جحش کے عقد میں تھیں۔ اور اس کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ بھی گئیں تھیں۔ لیکن عبید اللہ نے وہاں جانے کے بعد مرتد ہو کر عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اور پھر وہیں انتقال کر گیا۔ مگر اُم حبیبہؓ اپنے دین اور اپنی ہجرت پر قائم رہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے محرم 7ھ میں عَمرو بن اُمیہ ضمریؓ کو اپنا خط دے کر نجاشی کے پاس بھیجا تو نجاشی کو یہ پیغام بھی دیا کہ اُم حبیبہؓ سے آپ ﷺ کا نکاح کر دے۔ اس نے امِ حبیبہؓ کی منظوری کے بعد ان سے آپ ﷺ کا نکاح کر دیا۔ اور شُرحبیل بن حسنہ کے ساتھ انہیں آپ ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا۔ نبی ﷺ نے خیبر سے واپسی کے بعد ان کی رخصتی کرائی۔ 43ھ یا 44ھ یا 50ھ میں وفات پائی۔

حضرت حفصہ بنت عمر :۔ آپ حضرت عمر کی بیٹی تھیں۔ ان کے پہلے شوہر خنیس بن حذافہ سہمیؓ تھے جو بدر اور احد کے درمیانی عرصہ میں رحلت کر گئے اور وہ بیوہ ہو گئیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے شادی کر لی، شادی کا یہ واقعہ 3ھ کا ہے۔ شعبان 45ھ میں ساٹھ سال کی عمر میں مدینہ کے اندر وفات پائی۔ اور بقیع میں دفن ہوئیں۔

حضرت عائشہ بنت ابی بکر :۔ آپ حضرت ابو بکر کی بیٹی تھیں اور کم عمر تھیں۔ ان سے رسول اللہ ﷺ نے نبوت کے گیارھوں برس ماہ شوال میں شادی کی، یعنی حضرت سودہؓ سے شادی کے ایک سال بعد۔ اور ہجرت سے دو برس پانچ ماہ پہلے۔ اس وقت ان کی عمر چھ برس تھی۔ پھر ہجرت کے سات ماہ بعد شوال 1ھ میں انہیں رخصت کیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر نو برس تھی۔ اور وہ باکرہ تھیں۔ ان کے علاوہ کسی اور باکرہ عورت سے آپ ﷺ نے شادی نہیں کی۔ حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی سب سے محبوب بیوی تھیں۔ اور امت کی عورتوں میں علی الاطلاق سب سے زیادہ فقیہ اور صاحب علم تھیں۔ عورتوں پر ان کی فضیلت ایسے ہی ہے جیسے تمام کھانوں پر ثرید کی فضیلت۔ 17 / شعبان 57ھ یا 58ھ میں حضرت عائشہؓ نے وفات پائی۔ اور بقیع میں دفن کی گئیں۔

حضرت زینب بنت جحش :۔ یہ قبیلہ بنو اسد بن خزیمہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی کی صاحبزادی تھیں۔ ان کی شادی پہلے حضرت زید بن حارثہ سے ہوئی تھی۔ جنہیں رسول اللہ ﷺ کا بیٹا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن حضرت زیدؓ سے نباہ نہ ہو سکا اور انہوں نے طلاق دیدی۔ خاتمۂ عدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی:۔

" فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا " (الاحزاب: 37) جب زید نے ان سے اپنی ضرورت ختم کر لی تو ہم نے انہیں آپ کی زوجیت میں دے دیا۔

انہیں کے تعلق سے سورۂ احزاب کی مزید کئی آیات نازل ہوئیں جن میں مُتَبَنّیٰ (لے پالک) کے قضیے کا دوٹوک فیصلہ کر دیا گیا۔ حضرت زینبؓ سے رسول اللہ ﷺ کی شادی ذی قعدہ 5ھ میں اور کہا جاتا ہے کہ 4ھ میں ہوئی۔ یہ سب عورتوں سے بڑھ کر عبادت گزار اور صدقہ کرنے والی خاتون

تھیں۔20ھ میں وفات پائی۔اس وقت ان کی عمر 53 سال تھی۔اور یہ رسول اللہ ﷺ کے بعد امہات المؤمنین میں پہلی بیوی ہیں جن کا انتقال ہوا۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور انہیں بقیع میں دفن کیا گیا۔

یہ گیارہ بیویاں ہوئیں جو رسول اللہ ﷺ کے عقد نکاح میں آئیں۔اور آپ ﷺ کی صحبت ورفاقت میں رہیں۔ان میں سے دو بیویاں،یعنی حضرت خدیجہ اور حضرت زینب ام المساکینؓ کی وفات آپ ﷺ کی زندگی ہی میں ہوئی۔اور نو بیویاں آپ ﷺ کی وفات کے بعد حیات رہیں۔ان کے علاوہ دو اور خواتین جو آپ ﷺ کے پاس رخصت نہیں کی گئیں۔ان میں سے ایک قبیلہ بنو کلاب سے تعلق رکھتی تھیں۔اور ایک قبیلہ کندہ سے،یہی قبیلہ کِندہ والی خاتون جونیہ کی نسبت سے معروف ہیں۔ان کا آپ ﷺ سے عقد ہوا تھا یا نہیں اور ان کا نام ونسب کیا تھا اس بارے میں اہلِ سیر کے درمیان میں بڑے اختلافات ہیں۔

جہاں تک لونڈیوں کا معاملہ ہے تو مشہور یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دو لونڈیوں کو اپنے پاس رکھا۔ایک ماریۃ القبطیۃ کو جنہیں مقوقس فرمانروائے مصر نے بطور ہدیہ بھیجا تھا۔ان کے بطن سے آپ ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے۔جو بچپن ہی میں 28 یا 29 شوال 10ھ مطابق 27 جنوری 632ء کو مدینہ کے اندر انتقال کر گئے(الرحیق المختوم(اردو) صفحہ نمبر 637)۔

دوسری لونڈی ریحانہ بنت زید تھیں۔جو یہود کے قبیلہ بنی نضیر یا بنی قریظہ سے تعلق رکھتی تھیں۔یہ بنو قریظہ کے قیدیوں میں تھیں۔رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنے لیے منتخب فرمایا تھا اور وہ آپ ﷺ کے زیر دست تھیں۔ان کے بارے میں بعض محققین کا خیال ہے کہ انہیں نبی ﷺ نے بحیثیت لونڈی نہیں رکھا تھا بلکہ آزاد کر کے شادی کر لی تھی لیکن ابن قیم کی نظر میں پہلا قول راجح ہے۔ابو عبیدہ نے ان دو لونڈیوں کے علاوہ مزید دو لونڈیوں کا ذکر کیا ہے۔جس میں سے ایک کا نام جمیلہ بتایا جاتا ہے،جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آئی تھیں۔اور دوسری کوئی اور لونڈی تھیں جنہیں حضرت زینب بنت جحش نے آپ کو ہبہ کیا تھا(زاد المعاد 1/29)۔

مدنی زندگی سے حاصل ہونے والے اسباق

رسول اللہ ﷺ کسی خاص زمانے یا خاص قوم کی طرف معبوث نہیں ہوئے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام زمانوں اور تمام انسانیت کے لئے نبی بنا کر بھیجا۔ قرآن مجید اللہ کا آخری اور ابدی پیغام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت قرآنی احکامات کی عملی تفسیر اور مکمل پیروی کا نام ہے۔ قرآن مجید کی آفاقیت کو آپ کی سیرت نے اپنے اندر سمو لیا ہے۔ اس لئے ہر زمانے اور معاشرے کا انسان آپ کی سیرت سے استفادہ کر سکتا ہے۔ آپ کی سیرت مبارکہ زندگی کے ہر پہلو میں ہماری راہنمائی کرتی ہے۔

جس کو مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

رد عمل نہیں عمل

حضور ﷺ کی سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ زندگی کی بنیاد عمل پر رکھنی چاہیے۔ میں نے پہلی بات جو عرض کی وہ دوسری بات سے بالکل جدا ہے۔ رد عمل کی سوچ اجتماعی عمل کو بانجھ کر دیتی ہے، قوم رد عمل کیلئے کسی بڑے حادثے کا انتظار کرتی ہے۔ جب کوئی حادثہ ہوا' قوم اٹھتی ہے، رد عمل ظاہر کرتی ہے اور پھر سو جاتی ہے، اسے اس خواب غفلت سے پھر کوئی حادثہ ہی اٹھا سکتا ہے۔ رد عمل کا رویہ قوم کے اعصاب وارادوں کو شل کر کے رکھ دیتا ہے۔ حضور ﷺ ایک خدائی پروگرام کے مطابق احسن طریقے سے اپنے مقصد کی طرف بڑھتے رہے، آپ عمل کرتے رہے، مخالف رد عمل کرتے رہے، آپ نے قرآن مجید سنایا، انہوں نے رد عمل میں شاعری کا الزام لگایا، آپ نے توحید کی تعلیم دی، انہوں نے شرک کا پرچار کیا، آپ نے اسلام کی دعوت دی، کفار نے دعوت کا انکار کیا، مسلمانوں نے ہجرت کی انہوں نے تعاقب کیا، مسلمانوں نے سرِعام تلاوت کی، کفار نے اذیت دی، آپ ﷺ نے معاہدات کیے انہوں نے معاہدہ شکنی کی، اسلام پھیلتا رہا وہ روکنے کی کوشش میں لگے رہے، پیغمبر خدا اور مسلمان عمل میں رہے، کفار و مشرکین رد عمل میں رہے، وقت نے ثابت کر دیا کہ جیت عمل کرنیوالوں کی ہوتی ہے۔ رد عمل کرنیوالے ناکام ہوتے ہیں کیونکہ انکو بیدار رکھنے کیلئے ہمیشہ ایمرجنسی حالات کی ضرورت ہے اور ایسے حالات ہمیشہ رہتے نہیں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی خفیہ صلاحیتوں کو جگایا، انہیں ایک باعمل انسان بنایا، انہیں وہ سوچ دی جو عمل پر مبنی تھی۔ اس حوالے سے بہت سارے واقعات ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ کسی کافر، منافق یا مشرک نے آپ کی شان میں گستاخی کی، صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کی ہمیں حکم

دیجئے، ہم اس گستاخ کی گردن سر تن سے جدا کر دیں۔ لیکن آپ نے منع فرمایا اور معاف کرنے کو ترجیح دی چونکہ یہ رد عمل کا نتیجہ تھا، اس لئے آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور ہمیں تعلیم دی کہ نا قابل برداشت حالات میں رد عمل نہیں۔ عمل کی بنیاد پہ سوچو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے عمل کو عارضی غصہ، وقتی کیفیت اور جذباتی حالت ختم کر دے، تم اپنی طاقت وصلاحیت کو عمل کیلئے جوڑ کر رکھو، یہ دنیوی اور اخروی ترقی کیلئے ذریعہ بنے گی۔

حضرت علی دوران جنگ ایک کافر سپہ سالار کے سینے پہ قتل کرنے کیلئے چڑھ بیٹھے، اس نے فوراً تھوک دیا، آپ اسی وقت اس کے سینے سے اٹھ گئے، اس نے کہا میں خدا کا دشمن ہوں اور میں نے آپ کی بھی گستاخی کی، آپ مجھے بیدردی سے قتل کر دیتے لیکن آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا میں اس لئے اٹھ کھڑا ہوا کہ میری دشمنی کی وجہ یہ ہے کہ تو دشمنِ خدا ہے لیکن جب تو نے تھوکا تو میری ذاتی عداوت بھی اس میں شامل ہو گئی۔ یہ واقعہ حضرت علیؓ کے حوالے سے ہے لیکن اس سے حضور ﷺ کی سیرت کا یہ پہلو بھی اجاگر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کی تعلیم وتربیت کیسی کی تھی؟ حضور ﷺ نے انہیں عمل کرنا سکھایا تھا۔ امت مسلمہ کو سیرت سے یہی سبق حاصل کرنا ہے کہ بین الاقوامی معاملات ہوں یا ملکی، سیاسی ہوں یا مذہبی، رد عمل کی پالیسی اختیار نہیں کرنی اور نہ ہی اپنی سوچ اور رویے کو اس کے تابع کرنا ہے۔ بس ہم نے عمل کیے جانا ہے کیونکہ عمل میں Originality ہے۔ رد عمل اشتعال وبرانگیختی کا نام ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے وقت اور صلاحیت کو ضائع کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔

تصادم سے گریز

آپ ﷺ نے ٹکراؤ اور تصادم سے احتراز کیا، مکی زندگی ہو یا مدنی زندگی آپ نے بلا تفریق سب سے صلح جوئی کا راستہ اختیار کیا۔ مخالف فریق کی شرائط کو تسلیم کیا اگرچہ وہ خود آپ ﷺ کے اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے خلاف تھیں، آپ ﷺ نے اس حد تک جا کر بھی یہ بتا دیا کہ میں کسی قیمت میں تصادم نہیں چاہتا۔ مثلاً صلح حدیبیہ کے موقع پر جو شرائط لکھی گئیں وہ بظاہر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی سے "خیر" پیدا فرما دی۔ آپ نے ہمیشہ امن وسلامتی کی تمنا فرمائی۔ Confrontation سے آپ نے ہمیشہ گریز کیا۔ جہاں تک جنگوں کا سوال ہے وہ بھی مسلمانوں پر مسلط کی گئیں، جب کفار ومشرکین نے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا ارادہ کر لیا تو مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی، رب تعالیٰ کی

طرف سے مدنی دور میں جنگ کی اجازت دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اجازت دشمن کی جنگی تیاریوں اور ان کی طرف سے ہونے والے مذہبی جبر کے باعث دی گئی۔ حضور ﷺ نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے "عافیت" کا سوال کیا اور اسی بات کی تلقین فرمائی۔ فتح مکہ کے دن جب کسی نے اسے جنگ و سزا کا دن قرار دیا تو آپ نے فرمایا نہیں یہ رحمت کا دن ہے، حالانکہ فتح مکہ کے روز کفار آپ کے سامنے محکوم قوم کی حیثیت رکھتے تھے لیکن آپ نے اس دن بھی ٹکراؤ سے پرہیز کیا بلکہ سب کو معاف فرمادیا۔ مسلمانوں کی حالت کوئی بھی ہو اسے ہر طرح جانی، مالی نقصان سے خود کو بچانا ہے، اپنے آپ کو خوامخواہ مشکل اور امتحان میں ڈالنا خدا اور رسول کو پسند نہیں ہے۔ اس لئے حضور ﷺ کے سامنے دو راستوں کا اختیار ہوتا تو آپ دونوں میں سے وہ راستہ اختیار فرماتے جو سب سے زیادہ آسان ہوتا۔ آپ نے یہی فرمایا "آسانیاں پیدا کرو، تنگی پیدا نہ کرو، بشارت دو، متنفر نہ کرو۔" ممکنہ حد تک غیر مسلم اقوام سے تصادم سے بچنا یہ سیرت رسول ﷺ کی تعلیم ہے، تصادم سے پرہیز ہی دعوت اسلام کے امکانات کو بڑھاتا ہے، ٹکراؤ سے بچنا ہی غیروں کے دلوں میں مقام بنانے کا سبب ہے، اسلام محبت سے پھیلا اور اب بھی پھیلے گا۔

نظامِ اجتماعی

رسول اللہ ﷺ نے مکہ و مدینہ کے نظام اجتماعی کو یکلخت نہیں بدلا۔ آپ نے ایک ہی وقت میں سب محاذ نہیں کھولے، آپ نے مکہ میں لوگوں کو توحید کی دعوت دی، انہیں خدا کی طرف بلایا، جو رویے بنیادی حقوق کے خلاف تھے ان کی نشاندہی فرمائی اور چند افراد ایسے تیار فرمائے جو "بنیادی حقوق" کا خیال رکھنے والے اور غیر انسانی رویوں سے پاک تھے۔ آپ نے ان کے سیاسی نظام کو جو قبائلی نظام پہ مشتمل تھا، اسے غیر اسلامی قرار نہیں دیا کیونکہ اس نظام میں خوبیاں بھی تھیں۔ اس نے لوگوں کو آپس میں باندھ کر رکھا ہوا تھا۔ اس نظام میں سردار و قبیلہ کا تصور موجود تھا، لوگ بڑوں کے فیصلے کو سنتے اور مانتے تھے۔ وہ قوم صحرا و ریگستان کے ماحول میں پرورش پاتی اور جوان ہوتی تھی' ان کی عادات و خصائل میں وہی وسعت و جفاکشی موجود تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی صلاحیتوں کو اسلام کیلئے استعمال فرمایا، ایسا طریقہ کار اختیار نہ فرمایا اور نہ اپنے ماننے والوں کو اختیار کرنے دیا جو نظامِ اجتماعی کے خلاف ہو جس سے کچھ کرنے کے مواقع کم اور خوامخواہ کے مسائل کے اضافے کے امکانات زیادہ ہوں۔

یہ نکتہ اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ ہمارے مصلحین و مبلغین معاشرے کو اخلاقی بنیادوں پر کھڑا نہیں کرتے اور نہ ہی لوگوں کی اصلاح کا کام کرتے ہیں، لیکن نظامِ اجتماعی جو اپنی بسیار خامیوں خوبیوں کے ساتھ کام کر رہا ہوتا ہے، اس کو بدلنے کیلئے ایک ایسی جنگ چھیڑ بیٹھتے ہیں، جس سے خرابیوں میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں اور قیمتی وقت کو بے فائدہ جنگ میں جھونک دیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے سب سے پہلے لوگوں کی اخلاقی اقدار کی بنیاد پر اصلاح کا کام کیا، اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں کرپشن، بدعنوانی، جھوٹ، فریب، دغا بازی، زناکاری، شراب نوشی، حق تلفی، ظلم و زیادتی، انسانی حقوق کی پامالی، زمینوں پر قبضہ، غبن مال، ملاوٹ، رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی جیسی برائیاں ہیں۔ لوگ معاملات میں کمزور ہیں، لوگوں کی فقط اخلاقی حالت ہی نہیں بلکہ علمی، فکری صلاحیت بھی زنگ آلود ہو چکی ہے، اصابت رائے اور وسعت خیال ناپید ہو چکے ہیں، جہاں لوگوں کے کردار کا یہ عالم ہو تو سب سے پہلے ایک مفکر، مصلح یا انقلابی شخصیت کو کیا کرنا چاہیے؟ واضح بات ہے ہر شخص یہی کہے گا کہ اسے معاشرے کی اصلاح کرنی چاہیے، وہ اصلاح علم، اخلاق اور فکر کی بنیاد پہ ہونی چاہیے۔ جب مصلحین یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں، اگلے مرحلے کیلئے معاشرہ خود تیار ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا کیا کہ سب سے پہلے افراد سازی کا فریضہ سرانجام دیا، افراد سازی کے بعد معاشرے کے نظامِ اجتماعی میں جو خرابیاں تھیں ان کا علاج بھی خود بخود ہوتا چلا گیا۔

مسلم ممالک میں ہماری ترجیحات اس کے برعکس ہیں۔ جو کام ہمیں سب سے پہلے سرانجام دینا ہے، اس کے نشانات دور دور تک دکھائی نہیں دیتے اور جو کام نتیجتاً خود بخود ہو جاتا ہے، اس کیلئے ہم اپنا سب کچھ کھپا دیتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم نظام کو چیلنج کرتے ہیں۔ جس وجہ سے مسلم ممالک میں غیر ضروری مسائل نے جنم لیا ہوا ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت رہنمائی کرتی ہے کہ سب سے پہلے نظام نہیں افراد بدلے جاتے ہیں ایسے افراد تیار کیے جاتے ہیں جو نظام اجتماعی میں ترمیم کرتے، اس کی خوبیوں کو باقی رکھتے اور خامیوں کو دور کرتے ہیں۔

پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے جو بہترین نظامِ زندگی اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر قیامت تک کے لیے ہو سکتا تھا، وہ اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء کے ذریعے اپنی کامل اور اکمل ترین شکل میں دے دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنی بعثت کے بعد عمر بھر جس لگن اور ذمے داری کے ساتھ اپنے فرض کو پورا کر کے انسانیت کو پستی سے نکال کر رفعت تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیا، اس کی مثال تاریخِ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا مثالی طرزِ حکمرانی، جس نے داخلی و خارجی سطح پر بکھرے یثرب کو دنیا کی بہترین اسلامی فلاحی ریاست مدینہ میں تبدیل کر دیا، اُس کی جھلک ہمہ

وقت ہمارے سامنے ہونی چاہیے، تاکہ ان مشکل ترین حالات میں ہم اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں اپنے مسائل حل کر سکیں۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم نے نبیِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے اُن پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، جو ایک اسلامی فلاحی ریاست کے قیام میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

معاشی انصاف قائم کرنے کے بعد حضور اکرم ﷺ نے اسلامی مملکت کی داخلی سیاسی پالیسی کا اعلان فرمایا۔ آپ ﷺ نے مدینہ اور اس کے نواحی علاقوں پر مشتمل خطے کو ایک وحدت قرار دیا۔ اس وحدت میں بسنے والے غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ فرمایا۔ ان غیر مسلموں کو مکمل شہری حیثیت دی گئی۔ امورِ داخلہ میں آپ ﷺ نے خصوصی توجہ استحکامِ امن اور اخلاقی تربیت کی بنیاد رکھی۔ شہری ریاست کو اندرونی خلفشار سے بچانے اور استحکام بخشنے کے لیے آپ ﷺ نے مسلسل تدابیر اختیار کیں۔

حضورِ اکرم ﷺ کی شخصیت میں عام تقسیم کے مطابق دینی و دنیاوی دونوں حیثیتیں جامع طور پر موجود تھیں۔ آپ ﷺ کی حکومت اساسی طور پر دینی تھی، اس لیے آپ کی سیاست بھی دینی تھی۔ انتظامِ سلطنت کے بعض امور وہ تھے جن کا تعلق وحی اور الہام سے ہوتا، اس میں آپ کو کسی مشورے کی ضرورت نہیں تھی، باقی امور میں آپ ﷺ کا معمول تھا کہ مختلف معاملات میں صحابہ کرام ﷺ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم آپ ﷺ کی الہامی حیثیت کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ ”ہم نے آپ ﷺ پر برحق کتاب اتاری، تاکہ آپ ﷺ لوگوں کے درمیان اللہ کے احکام کے مطابق حکومت فرمائیں“ (النساء:۱۰۵)۔

اخلاق نبوت

آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ کے بارے میں خلق خدا سے کیا پوچھنا؟ جب کہ خود خالق اخلاق نے یہ فرمادیا کہ ”اِنَّكَ لَعَلٰي خُلُقٍ عَظِيْمٍ“ یعنی اے حبیب! بلاشبہ آپ اخلاق کے بڑے درجہ پر ہیں۔

آج تقریباً چودہ سو برس گزر جانے کے بعد دشمنانِ رسول کی کیا مجال کہ آپ ﷺ کو بداخلاق کہہ سکیں اس وقت جب کہ آپ ﷺ اپنے دشمنوں کے مجمعوں میں اپنے عملی کردار کا مظاہرہ فرمارہے تھے۔ خداوندِ قدوس نے قرآن میں اعلان فرمایا: ۔

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ"(آلِ عمران)۔

(اے حبیب) خدا کی رحمت سے آپ لوگوں سے نرمی کے ساتھ پیش آتے ہیں اگر آپ کہیں بد اخلاق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے ہٹ جاتے۔

دشمنانِ رسول نے قرآن کی زَبان سے یہ خدائی اعلان سنا مگر کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ اس کے خلاف کوئی بیان دیتا یا اس آفتاب سے زیادہ روشن حقیقت کو جھٹلاتا بلکہ آپ ﷺ کے بڑے سے بڑے دشمن نے بھی اس کا اعتراف کیا کہ آپ ﷺ بہت ہی بلند اخلاق، نرم خو اور رحیم و کریم ہیں۔

بہر حال حضور نبی کریم ﷺ محاسنِ اخلاق کے تمام گوشوں کے جامع تھے۔ یعنی حلم و عفو، رحم و کرم، عدل و انصاف، جود و سخا، ایثار و قربانی، مہمان نوازی، عدم تشدد، شجاعت، ایفاء عہد، حسن معاملہ، صبر و قناعت، نرم گفتاری، خوش روئی، ملنساری، مساوات، غمخواری، سادگی و بے تکلفی، تواضع و انکساری، حیاداری کی اتنی بلند منزلوں پر آپ ﷺ فائز و سرفراز ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک جملے میں اس کی صحیح تصویر کھینچتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ یعنی تعلیمات قرآن پر پورا پورا عمل یہی آپ ﷺ کے اخلاق تھے۔

ریاستِ مدینہ

پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے جو بہترین نظامِ زندگی اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر قیامت تک کے لیے ہو سکتا تھا، وہ اللہ تعالیٰ نے خاتمُ الانبیاء کے ذریعے اپنی کامل اور اکمل ترین شکل میں دے دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنی بعثت کے بعد عمر بھر جس لگن اور ذمے داری کے ساتھ اپنے فرض کو پورا کر کے انسانیت کو پستی سے نکال کر رفعت تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیا، اس کی مثال تاریخِ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا مثالی طرز حکمرانی، جس نے داخلی و خارجی سطح پر بکھرے یثرب کو دنیا کی بہترین اسلامی فلاحی ریاست مدینہ میں تبدیل کر دیا، اُس کی جھلک ہمہ وقت ہمارے سامنے ہونی چاہیے تاکہ ان مشکل ترین حالات میں ہم اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں اپنے مسائل حل کر سکیں۔ نبی اکرم ﷺ کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے بعد فوری طور پر مسجد نبوی کی بنیاد رکھی گئی، دوسرے لفظوں میں ریاست کے لیے سیکرٹریٹ قائم کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ معاشرے کے معاشی مسائل کے حل کو اولیت دی گئی۔ ایک طرف ریاست میں ہنگامی حالت تھی تو دوسری طرف انصار مدینہ تھے جن میں متوسط بھی

تھے اور کافی مالدار بھی، یعنی عملی طور پر جو شکل آج پاکستان کی ہے کچھ ایسی ہی شکل مدینہ منورہ کی تھی۔ ہمارے ہاں بھی ایک طبقہ معاشی ظلم کی وجہ سے بدحالی کا شکار ہے اور دوسرا طبقہ کافی متمول ہے۔ ایسی حالت میں محسن انسانیت ﷺ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ ایک ٹیم موجود تھی جو اسلامی فلاحی نظام پر پختہ یقین رکھتی تھی۔ اس ٹیم میں شامل لوگوں نے ایک دوسرے کے لیے قربانیاں دیں اور اس طرح دو طبقوں میں جو غیر معقول معاشی فرق تھا وہ ختم ہو گیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان دنوں مدینہ منورہ کی معیشت کا سارا انحصار یہودیوں کے سودی کاروبار پر تھا مگر حضور اکرم ﷺ نے مہاجرین سے یہ نہیں فرمایا کہ تم بھی یہودیوں سے سود پر قرض لے کر اپنا کاروبار شروع کر دو کیونکہ اس طرح معاشی انصاف پر مبنی معاشرے کی تشکیل ناممکن تھی بلکہ آپ ﷺ نے انصارِ مدینہ سے فرمایا کہ اپنے بھائیوں کی مدد کرو اور پھر قرضِ حسنہ کا نظام رائج فرمایا اور جب معاشرے کے افراد عملاً باہمی تعاون کے ذریعے بلا سود قرضوں پر معیشت کو قائم کرنے میں لگ گئے تو آپ ﷺ نے سود کو مکمل طور پر حرام قرار دے کر اس لعنت کو ختم کر دیا۔

مدنی زندگی کا مرحلہ حکمت

آپ ﷺ کی مدنی زندگی بھرپور مصروفیت کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ انتہائی مشکل اوقات میں بھی آپ ﷺ نے اپنی خداداد بصیرت سے سلامتی کی راہیں نکالیں۔ مدینہ طیبہ میں تشریف لانے کے بعد آپ ﷺ کی حیثیت مکے سے مختلف ہو گئی تھی، کیونکہ مکہ میں مسلمان ایک مختصر اقلیت کے طور پر رہ رہے تھے جب کہ یہاں انہیں اکثریت حاصل تھی۔ پھر آپ ﷺ نے شہریت کی اسلامی تنظیم کا آغاز کیا جس میں آپ ﷺ کو منتظم ریاست کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ مکی زندگی کے مقابلے میں یہ بڑی کامیابی تھی، لیکن پرسکون معاشرے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔

مواخات

مدینہ سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے گھر بار اور مال و دولت چھوڑ کر مدینہ آ گئے تھے۔ لہٰذا ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے آپ ﷺ نے مواخات مدینہ کا درس دے کر رہتی دنیا تک کے حکمرانوں کے لیے مثال قائم کر دی کہ معاشرے سے غربت و تنگ دستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے۔

مواخات کے طرزِ عمل نے مسلم معاشرے کو استحکام بخشا اور اسے ہر جارحیت کے خلاف مجتمع ہو کر لڑنے میں مدد دی۔ جن لوگوں میں مواخات قائم کی گئی تھی ان کے متعلق دل چسپ اور حیرت انگیز تفصیلات کتب سیرت میں موجود ہیں کہ کس طرح انصار نے اپنے مال و دولت میں مہاجرین کو شریک ٹھہرایا یہاں تک کہ جن کے پاس دو بیویاں تھیں اس نے ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کے عقد میں دے دی۔ رسول اکرم ﷺ کو مسلمانوں کے درمیان مواخات قائم ہو جانے سے طمانیت سکون حاصل ہوا۔ منافقین نے مہاجرین و انصار کے درمیان منافرت پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر مواخات نے ان کی چالیں ناکام بنا دیں۔

انتظامی اور بیرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے حکمت عملی

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اہل مدینہ کو بیرونی خطرات سے بچانے کے لیے مسلم اور غیر مسلم کس خاص نکتے پر متفق ہوتے ہیں، جس سے اہل مدینہ کے باہمی اختلافات کو بھی ہوا نہ ملے اور مدینہ کے باہر کے لوگ بھی مدینہ منورہ پر حملے کی جرأت نہ کر سکیں۔ انہی اغراض و مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے حضور اکرم ﷺ نے ہجرت کے چند ماہ بعد ہی ایک دستاویز مرتب فرمائی جسے اسی دستاویز میں کتاب اور صحیفہ کے نام سے یاد کیا گیا۔ اس دستاویز کو متعلقہ اشخاص سے گفت و شنید کے بعد لکھا گیا۔

دستاویز کے ذریعے شہر مدینہ کو پہلی مرتبہ شہری مملکت قرار دینا اور اس کے انتظام کا دستور مرتب کرنا تھا۔ اس معاہدے سے نبی کریم ﷺ نے مدینہ کی شہری ریاست کو ایک مستحکم نظام عطاء کیا اور خارجی خطرات سے نمٹنے کی بنیاد قائم کی۔ اس دستاویز نے نبی کریم ﷺ کو ایک منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے پیش کیا اور یہ آپ ﷺ کی زبردست کامیابی تھی۔ دستاویز میں ایک بار لفظ دین بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ میں بیک وقت مذہب اور حکومت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا اہم امر ہے کہ اس کو پیش نظر رکھے بغیر مذہب اسلام اور سیاسیات اسلام کو اچھی طرح سمجھا نہیں جا سکتا۔

بقول محمد حسین ہیکل یہ تحریری معاہدہ ہے جس کی رو سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے آج سے چودہ سو سال قبل ایک ایسا معاشرتی ضابطہ قائم کیا جس سے شرکائے معاہدہ میں سے ہر گروہ اور ہر فرد کو اپنے اپنے عقیدے کی آزادی کا حق حاصل ہوا۔ اس سے انسانی زندگی کی حرمت قائم ہوئی، اموال کے تحفظ کی ضمانت مل گئی۔ ارتکاب جرم پر گرفت اور مواخذے نے دباؤ ڈالا اور معاہدین کی یہ بستی (شہر مدینہ) اس میں رہنے والوں کے لیے امن کا

گہوارہ بن گئی۔ غور فرمایئے کہ سیاسی اور مذہبی زندگی کو ارتقاء کا کتنا بلند مرتبہ حاصل ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاست اور مدنیت (دونوں) پر دست استبداد مسلط تھا اور دنیا فساد و ظلم کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

اسلامی ریاست کا تصور

یہ معاہدہ اسلامی ریاست کی بنیاد تھا، یہاں سے حضور اکرم ﷺ کی زندگی نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ اب تک آپ ﷺ کے تدبر و فراست کے تمام پہلو ایک ایسے مرکز کے قیام کے لیے تھے جہاں سے دعوت اسلام موثر طریق سے دی جا سکے۔ آپ ﷺ کی سابقہ کوششیں ایک مدبر کی تھیں لیکن اب آپ منتظم ریاست کے طور پر سامنے آرہے ہیں، لہٰذا آپ کے تدبر کا مطالعہ اسی زاویے سے کرنا ہو گا۔

داخلہ پالیسی

معاشی انصاف قائم کرنے کے بعد حضور اکرم ﷺ نے اسلامی مملکت کی داخلی سیاسی پالیسی کا اعلان فرمایا۔ آپ ﷺ نے مدینہ اور اس کے نواحی علاقوں پر مشتمل خطے کو ایک وحدت قرار دیا۔ اس وحدت میں بسنے والے غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ فرمایا۔ ان غیر مسلموں کو مکمل شہری حیثیت دی گئی۔ امور داخلہ میں آپ ﷺ نے خصوصی توجہ استحکام امن اور اخلاقی تربیت کی بنیاد رکھی۔ شہری ریاست کو اندرونی خلفشار سے بچانے اور استحکام بخشنے کے لیے آپ ﷺ نے مسلسل تدابیر اختیار کیں۔

مواخات اور میثاق مدینہ کے علاوہ قریبی قبائل سے معاہدے کیے۔ اس طرح مدینے کے گرد و نواح میں دوستوں کا اضافہ ہوا اور مخالفتوں میں مسلسل کمی ہوتی چلی گئی۔ آپ ﷺ نے ایک تدبیر اختیار فرمائی کہ عرب میں جو شخص خاندان یا قبیلہ مسلمان ہو تو وہ ہجرت کر کے مدینہ یا مضافات میں آبسے تاکہ آبادی بڑھنے سے فوجی و سیاسی پوزیشن مضبوط ہو۔ اس طرز عمل کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان فوج کے لیے محفوظ رضاکاروں میں روز افزوں اضافہ ہوا اور نو مسلموں کے لیے تعلیم و تربیت کا انتظام ہوا۔

خارجہ پالیسی

خارجہ پالیسی کے لیے حضور اکرم ﷺ نے امن عامہ اور بین الاقوامی اتحاد کو بنیاد بنایا۔ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی جغرافیائی حدود میں وسعت اور جنگ وجدل پر مبنی نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو حدیبیہ کے مقام پر صلح کا معاہدہ طے نہ پاتا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس وقت مسلمان کمزور تھے اور غیر مسلموں کی قوت سے خوف زدہ تھے کیونکہ صحابہ کرامؓ نے تو جانیں قربان کر دینے کی قسمیں کھائی تھیں۔ مگر ہادی کونین ﷺ نے غیر مسلموں کی تمام شرائط مان کر صلح کر لینا ہی بہتر سمجھا۔

اسلام کی خارجہ پالیسی کا اصول یہ ہے کہ باوقار زندگی کے لیے پُرامن جدوجہد جاری رکھی جائے۔ اگر کوئی شر پسند اس راہ میں حائل ہو تو اس حد تک اس کے خلاف کارروائی کی جائے جس حد تک اس کی ضرورت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے مختلف اقوام کے ساتھ دوستی کے معاہدے کیے۔ جو قومیں غیر جانبدار رہنا پسند کرتی تھیں ان کی غیر جانبداری کا احترام کیا۔

نظام قانون

ریاست مدینہ دنیا کی اولین ریاست تھی جس میں قانون سب کے لیے تھا اور سب انسان قانون کی نظر میں برابر تھے۔ ریاست مدینہ کی تشکیل و تاسیس تک تو کسی ریاست نے اس بات کا دعوی بھی نہیں کیا تھا اس کے ہاں سب برابر ہیں۔ لیکن اس کے بعد آج کی ریاستوں میں کاغذی دعوے تو کیے جاتے ہیں لیکن قانون سب کے لیے یکساں کا رواج عملاً کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ عیسائی راہبات کے لیے سکارف کی اجازت ہے جبکہ مسلمان خواتین کے لیے اس قانون میں کوئی گنجائش نہیں، گوروں کے لیے مالیاتی و سفارتی قوانین الگ ہیں جبکہ کالوں کے لیے اور سانولوں کے لیے مطلقاً جدا جدا ہیں جبکہ ریاست مدینہ ایسی ریاست تھی جس میں مسلمان قاضی کا فیصلہ یہودی کے لیے برات کا اور مسلمان کے لیے گردن زنی کا تھا۔ جب محسنِ انسانیت ﷺ سے مجرم کے لیے قانون میں رعایت مانگی گئی تو فرمایا میری بیٹی بھی ایسا جرم کرتی تو یہی سزا پاتی۔ بذات خود عمر کے آخری ایام میں مسلمانوں کے درمیان براجمان ہوئے اور فرمایا میں نے کسی کے ساتھ زیادتی کی ہو تو بدلہ لے لے۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں آپ ﷺ کے درسِ مساوات نے ہی اس معاشرے کو عدل فاروقی کی منزل سے روشناس کرایا۔

ریاست مدینہ کا نظام تعلیم

اسلامی ریاست میں نظام تعلیم کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ آپ ﷺ نے ہجرت سے قبل ہی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو معلم بنا کر مدینہ بھیج دیا تھا اور ہجرت کے بعد مسجد نبوی ﷺ کو باقاعدہ درس گاہ کا درجہ حاصل ہو گیا۔ غیر مقامی طلبہ کے لیے چبوترہ ڈالا گیا جس کو صفہ کہا گیا۔ یہاں یہ طلبہ قیام کرتے تھے۔ عرب میں چوں کہ لکھنے کا رواج نہیں تھا اس لیے مسجد نبوی میں ہی عبد اللہ بن سعید بن العاص اور عبادہ بن صامت کو لکھنا سکھانے پر مامور کیا گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مختلف زبانیں سکھائی گئیں اور فنون جنگ کی تعلیم ہر جوان کے لیے ضروری قرار دی گئی۔ خواتین گھریلوں صنعتوں کے ساتھ علاج معالجے کا انتظام بھی کرتی تھیں، حتیٰ کہ ایک صحابیہؓ نے مسجد نبوی ہی میں خیمہ لگا دیا تھا جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی کی جاتی تھی۔ دنیاوی علوم سیکھنے کے لیے قیدیوں کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ انھیں اپنی رہائی کے بدلے مسلمانوں کو پڑھانا ہو گا۔

امورِ سلطنت میں مشاورت کا عمل

ریاست مدینہ کی ایک اور شاندار بنیاد مشاورت تھی، آج صدیوں کے بعد جمہوریت کے نام پر اکثریت کی بات کو تسلیم کرنے کا رواج پیدا ہوا جبکہ ریاست مدینہ کا حکمران محسنِ انسانیت ﷺ نے تاریخ انسانی میں سب سے پہلے اپنی رائے کی قربانی دے کر اور اکثریت کی رائے پر فیصلہ کر کے ثابت کیا کہ جمہور کا فیصلہ قابلِ اقتدا ہوا کرتا ہے جبکہ یہ وہ دور تھا جب دنیائے انسانیت میں سرداری و بادشاہی نظام نے پنجے گاڑھ رکھے تھے اور حکمران سے اختلاف تو بڑی دور کی بات تھی، اس کے سامنے بولنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ گویا اس وقت کے بادشاہوں کی تلوار آج کے سیکولر ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کی مانند تھی کہ جس نے اختلاف کیا اس کا وجود ہی دنیا سے ختم کر دو اور اوپر سے جمہوریت اور آزادی رائے اور بے باک صحافت کا راگ الاپ کر دنیا کو خوب بے وقوف بناتے رہو لیکن ریاست مدینہ کا وجود صحیح آزادی رائے کا مجسم نمونہ تھا، جس میں معاشرے کے ہر طبقے خواہ وہ غلام ہوں، خواتین ہوں یا شہری سب کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے مکمل مواقع میسر تھے اور ان پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ فجر کی نماز کے بعد محسنِ انسانیت مسلمانوں کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جاتے اور مرد و خواتین میں سے جو بھی جو پوچھنا چاہتا اسے ادب و احترام کی حدود کے اندر مکمل آزادی تھی۔

افسروں کا انتخاب

حضور اکرم ﷺ کے عہد میں چوں کہ یمن اور حجاز اسلامی حکومت میں شامل ہو چکے تھے۔ اس لیے آپ ﷺ ان علاقوں میں والی مقرر کرتے ہوئے ان کے تقویٰ، علم و دانش، عقل و عمل اور فہم کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ امراء کے انتخاب میں حضور اکرم ﷺ کی حکمت عملی کا ایک اہم جزء یہ تھا کہ جو لوگ والی بننے کی درخواست کرتے ان کی درخواست رد کر دیتے۔ افسروں کے انتخاب کے سلسلے میں آپ ﷺ کی حکمت عملی قرآن پاک کی اس آیت کی تعبیر تھی:۔

"ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا"

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ عہدے ان کے اہل لوگوں کو دیے جائیں (النساء)۔

احتساب

اگرچہ رسول اکرم ﷺ کے عہد میں احتساب کا کوئی مستقل محکمہ قائم نہیں تھا۔ مگر حضور اکرم ﷺ یہ فرض خود انجام دیا کرتے تھے۔ تجارتی معاملات کی بھی نگرانی فرماتے۔ عرب میں تجارتی معاملات کی حالت نہایت قابلِ اصلاح تھی۔ مدینہ منورہ میں آنے کے بعد آپ ﷺ نے ان اصلاحات کو جاری کر دیا۔ آپ ﷺ تمام لوگوں سے اصلاحات پر عمل کراتے، جو باز نہیں آتے انہیں سزائیں دیتے۔ آپ ﷺ کے عہد میں کوئی باقاعدہ جیل خانہ نہیں تھا۔ اس لیے صرف اتنا خیال کیا جاتا تھا کہ مجرم کو کچھ مدت کے لیے لوگوں سے ملنے جلنے اور معاشرتی تعلقات قائم نہ رکھنے دیے جائیں۔

اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ مجرم کو کسی گھر یا مسجد میں بند کر دیا جاتا تھا اور اس کے مخالف کو اس پر متعین کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ مجرم کو لوگوں سے ملنے نہ دے۔ صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کے عہد میں دیکھا کہ لوگ تخمیناً غلہ خریدتے تھے۔ ان کو اس بات پر سزا دی جاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے اس کو خود ہی وہاں بیچ ڈالیں جہاں اس کو خریدا تھا (بخاری شریف)۔

آپ ﷺ عمال پر کڑی نگاہ رکھتے، کسی عامل کی شکایت پہنچتی تو فوراً تحقیقات کراتے کیونکہ حکمران کی حیثیت ایک داعی کی ہے۔ اگر سلطنت عدل کی جگہ ظلم و تشدد قبول کرلے تو سلطنت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔

اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی

جب آپ نے مدینہ منورہ کو ریاست بنایا تو آپ نے حکومتی اختیارات کو نچلی سطح تک یوں منتقل کیا کہ ہر دس افراد پر ایک نقیب مقرر کیا، دس نقیبوں پر ان کا سربراہ عریف بنایا اور پھر سو عرفاء پر مشتمل پارلیمنٹ بنائی، اس طرح عوام کو براہ راست پارلیمنٹ میں شراکت دے کر ان کی آواز ایوان تک پہچانے کا ذریعہ بنا دیا۔

مرکز حکومت

حضور اکرم ﷺ کا سیکرٹریٹ یا مرکز حکومت مسجد نبوی تھا۔ آپ ﷺ تمام وفود اور سفیروں سے یہیں ملاقات کیا کرتے تھے۔ گورنروں اور عمائدین حکومت کو ہدایات مسجد نبوی سے روانہ کی جاتیں۔ سیاسی و دیگر معاملات میں صحابہ کرامؓ سے یہیں مشورہ کرتے۔ ہر قسم کی سیاسی اور مذہبی تقاریب کا انعقاد مسجد نبوی میں ہوتا۔ تاریخ عرب میں ہے مسجد مسلمانوں کی مشترکہ عبادت، فوج اور سیاسی اجتماع کی جگہ تھی۔ نماز پڑھانے والا امام ہی اہل ایمان کی فوج کا سپہ سالار ہوتا تھا اور جملہ مسلمانوں کو حکم تھا کہ ساری دنیا کے مقابلے میں ایک دوسرے کے محافظ و معاون رہیں۔ مال غنیمت مسجد نبوی میں آتا تھا اور یہیں پر نبی کریم ﷺ اسے مستحقین میں تقسیم کیا کرتے تھے، آج ہماری مسجد اور امام مسجد معاشرے کی بہتری کے لیے کیا کردار اداء کر رہا ہے سب کے سامنے ہے۔

یہ تھا ایک مثالی حکمران کا طرز حکومت۔ وہی حکمران جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے کامل ترین نمونہ بنا کر بھیجا۔ آج عالم گیر رسالت کے حامل عالم گیر رسولِ رحمت ﷺ کا طرز حکمرانی ہی ہمارے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔

عدل و انصاف

انسان ایک معاشرتی حیوان یا یوں کہیں کہ ہمیشہ سے مدنی الطبع رہا ہے اور اپنی فطرت میں جماعتی زندگی کا محتاج ہے۔ بغیر اجتماعیت کے اس کی زندگی ناممکن ہے۔ انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت تک معاشرے کا محتاج ہے۔ اس کا جسم عقل اور خلق جیسے اہم عطیات بھی خالقِ کائنات نے جماعتی علائق کیلئے عطا فرمائے ہیں۔ دنیا میں آتے ہی خاندان میں آنکھ کھولتا ہے۔ اپنی پرورش کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے (بھائی، بہن، یار شتہ دار وغیرہ کا) پھر ہوش سنبھالتے ہی اسے ایک سوسائٹی سے، ایک برادری سے، ایک قوم سے، ایک تمدن سے، نظام معیشت سے اور نظام سیاست سے واسطہ پڑتا ہے نیز فرد یا انسان اپنی ہر متعلقہ شے مثلاً خوراک، لباس، مکان اور زندگی کے ہر دوسرے شعبے میں جماعت کا دست نگر ہے۔ اور اگر اس سے وہ تمام علائق حذف کر دیے جائیں جو جماعت کی بدولت اس کو حاصل ہوتے ہیں تو پھر اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہتا۔ اس کی حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے انسان کے اعمال اغراض اور عادات کی جماعتی زندگی کے بغیر کوئی قیمت نہیں ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہونی چاہیے کہ عدل وانصاف کا جو جامع نظریہ اسلام نے پیش کیا اور جس کا نمونہ آقا کریم ﷺ کی ذات مبارکہ ہے اس کی نظیر دنیا کے قدیم وجدید دساتیر اور مجموعہ ہائے قوانین پیش نہیں کر سکتے۔ صرف اسلامی نظام عدل کی برتری گزشتہ زمانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ انسانیت کا کارواں چودہ صدیاں بعد بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکا جس پر آقا کریم ﷺ کے فیض یافتہ آپ ﷺ کی نگاہِ فیض اور حسنِ تربیت سے عرب کے اکھڑ مزاج جاہل بدو پہنچ گئے تھے۔

سبق نمبر 7

خلافت راشدہ اور اس کی خصوصیات اور دورِ بنو اُمیہ اور بنو عباس

خلافت راشدہ

حضرت محمد ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عہد خلافت خلافتِ راشدہ کہلاتا ہے۔ اس عہد کی مجموعی مدت تیس سال ہے۔ جس میں حضرت ابو بکر صدیق اولین اور حضرت علی آخری خلیفہ ہیں۔ اس عہد کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ یہ قرآن و سنت کی بنیاد پر قائم نظام حکومت تھا۔

خلافت راشدہ کا دور اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس زمانے میں اسلامی تعلیمات پر عمل کیا گیا اور حکومت کے اصول اسلام کے مطابق رہے۔ یہ زمانہ اسلامی فتوحات کا بھی ہے۔ اور اسلام میں جنگ جمل اور جنگ صفین جیسے واقعات بھی پیش آئے۔ جزیرہ نما عرب کے علاوہ ایران، عراق، مصر، فلسطین اور شام بھی اسلام کے زیر نگیں آ گئے۔

خلافتِ راشدہ کی خصوصیات

جمہوریت

اس دور کی پہلی خصوصیت جمہوریت تھی۔ حضرت ابو بکرؓ سے حضرت علیؓ تک کی خلافت کے لیے نامزدگی میں جمہوری روح کار فرما تھی۔ ان میں کوئی خلیفہ ایسا نہ تھا جس کو امیر مقرر کرنے میں مسلمانوں کی عام رائے اور مرضی شامل نہ ہو یا جسے مسلمانوں پر زبردستی مسلط کر دیا گیا ہو۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں مسلمانوں کا حضرت ابو بکر صدیقؓ کو نامزد کرنا، حضرت عمر فاروقؓ کے لیے حضرت ابو بکرؓ کی تمام صحابہ کرامؓ سے رائے لینا اور مسلمانوں کا

ان کے لیے متفق ہونا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی چھ صحابہ کرامؓ کی کمیٹی میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کے لیے متفق ہونا اور حضرت علیؓ سے مسلمانوں کا خلافت کا بار اٹھانے پر اصرار۔ یہ تمام طریقے اسلامی سلطنت میں خلیفہ کے انتخاب کے لیے جمہوریت کی انتہائی عمدہ اور واضح مثالیں ہیں۔ پھر ان کے عہد میں ہر موقع پر اس نظام میں جمہوریت کی روح کار فرما رہی۔

شوریٰ

خلافت راشدہ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس کا نظام ایک شورائی نظام تھا۔ مجلس شوریٰ کی بنیاد پر عام مسلمانوں سے رائے لی جاتی اور مشوروں پر عمل کیا جاتا۔ ہر مسلمان کو مشورہ اور رائے کا حق حاصل تھا اور حکومت پر نکتہ چینی کا حق بھی رکھتا تھا۔ صدیوں کے حُکام اور والی بھی لوگوں سے مشورے کے بعد مقرر ہوتے اور لوگوں کی شکایات پر ان کی تبدیلی بھی کر دی جاتی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ راشدہ میں عوام سے مشورے اور رائے کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔

عوام کے حقوق

خلافتِ راشدہ میں تمام عوام کو بنیادی حقوق حاصل تھے۔ ان کی شخصی و سیاسی آزادی کی حفاظت کی جاتی تھی۔ مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے حقوق یکساں تھے اور ان حقوق کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری تھی۔ کوئی شخص کسی دوسرے کی حق تلفی نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی پر زیادتی کی اجازت دی جاتی تھی۔ غیر مسلموں کو مذہبی آزادی دینے کے ساتھ ساتھ ان کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت بھی کی جاتی تھی۔ غرض سلطنت اسلامیہ میں اس عہد میں کوئی ایک فرد بھی اپنے حقوق سے محروم نہ تھا۔

عدل و انصاف

خلافت راشدہ میں عدل وانصاف فراہم کرنا ایک بڑی خصوصیت تھی۔ اس عدل کے لیے سب برابر تھے۔ نہ کوئی امیر تھا اور نہ کوئی غریب۔ نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ کوئی رعایا۔ نہ کوئی گورا تھا اور نہ کوئی کالا اور نہ ہی رنگ و نسل اور طبقہ کا امتیاز قائم تھا۔ سب برابر کا درجہ رکھتے تھے۔ مجرم مجرم ہی تھا خواہ کوئی ہی کیوں نہ ہو۔

فلاحی ریاست

خلافتِ راشدہ میں فتوحات کا سلسلہ بھی جاری ہوا اور سلطنت وسیع ہوئی۔ نظامِ حکومت کی طرف بھی توجہ دی گئی اور ایک مکمل نظام جمہوریت کے مطابق قائم ہوا۔ اندرونی فتنوں کو بھی دبایا گیا اور بیرونی خطرات کا مقابلہ بھی ہوا لیکن ان تمام کاموں میں ایک چیز مشترک تھی وہ یہ کہ ان کا مقصد عوام کی فلاح، ان کی خوشحالی و آسودہ حالی، ان کو امن و سکون اور اسلامی ریاست و اسلام کا تحفظ تھا۔ یہ ایک مکمل فلاحی ریاست تھی۔ جس میں ہر شخص کے حقوق و فرائض اور ان کی ادائیگی کے طریقۂ کار مقرر تھے۔ اس ریاست کا مقصد آئینی فلاح اور اسلامی تصور فراہم کرنا تھا جو اس کی بڑی خصوصیت تھی۔

حکام اور عمال کی باز پرس

اس عہد میں نظام حکومت کی توسیع کے ساتھ ہر صوبے میں حکام اور عمال کا تقرر ہوتا تھا۔ جس کو خلیفہ خود مقرر کر کے بھیجتے لیکن ان کی طرف سے غفلت نہیں برتی جاتی تھی۔ ان کے لیے تاکیدی احکامات ہوتے اور ان کی نگرانی ہوتی۔ ان کے خلاف کسی بھی قسم کی شکایت کے لیے حج کے موقع پر تمام عماد کو جمع کرنے کی تاکید ہوتی اور اعلان کیا جاتا کہ جس کسی کو اپنے صوبے کے والی یا حاکم سے شکایت ہو کھلم کھلا پیش کرے۔ شکایات درج ہونے کے بعد ان کی تحقیق ہوتی اور درست ثابت ہونے پر ذمہ دار افراد کو سزا دی جاتی۔ حکام اور عمال کے خلاف اس طرح سختی سے باز پرس ہوتی جو اس کے بعد کے دور حکومت میں نظر نہیں آتی۔ ایک کامیاب حکومت کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اس کے عوام کے مقرر کردہ عمال سے مطمئن رہیں۔

خلفاء کا کردار

ان تمام خصوصیات کے علاوہ سب سے بڑی خصوصیت خلفائے راشدین کا بلند کردار ہے۔ کیونکہ حکومت کی کامیابی کا تمام تر دار و مدار خلیفہ کی ذات پر تھا۔ اگر سربراہ حکومت خوبیوں کا مالک نہ ہو، اس کا کردار بلند نہ ہو تو باوجود کوشش کے حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ خلفائے راشدین کے کردار کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ ایسا پاک وصاف اور بلند کردار کسی اور حکمران میں دیکھنے میں نہیں آیا۔

ایسا کردار جو ہر لمحہ امت کی بھلائی میں کوشاں رہے۔ عوام کی تکلیف پر خود تکلیف میں مبتلا ہو جائے۔ ذمہ داری کا احساس اتنا کہ بھوک پیاس نیند آرام سب کچھ بھول کر عوام کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھا۔ سادگی وانکسار اتنی کہ ان کی مثال خلافت راشدہ کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔ شرم وحیا جو وہ سخا کے پیکر، خدا ترسی اور ایثار وخلوص، عزم وحوصلہ اور بے لوث خدمت کے جذبے جیسی خصوصیات اور کردار کے مالک خلفائے راشدہ تھے جن کا ہر لمحہ اسلام کی بقا اور مسلمانوں کی فلاح کے لیے گذرا۔ خلافت راشدہ کے یہ خلفا اپنے بلند کردار کی وجہ سے دنیا کی دوسری تمام حکومتوں کے سربراہوں میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں جن کے کردار کی خوبیوں کی مثال کہیں اور تلاش کرنا ممکن نہیں۔

دینی حکومت

خلافتِ راشدہ تو ایک دینی حکومت تھی جس کی بنیاد قرآن وسنت پر استوار تھی۔ دنیاوی غرض اور لالچ سے پاک حکومت دین کو پھیلانے اور دینی علوم کو مسلمانوں تک پہنچانے کا کام کرتی رہی اس حکومت کے تمام فرائض دین کا جزو تھے۔ لوگوں کو قرآن و سنت کی تعلیم اور صحیح اسلامی تصور بہم پہنچانا اس حکومت کی ذمہ داری تھی۔ آنحضرت ﷺ کی قائم کی ہوئی اسلامی ریاست اور 23 سال کی جدوجہد سے قائم ہونے والا دین "دینِ اسلام" ہی اس حکومت کی بنیاد تھی۔

خلافت راشدہ کا دور ایک اہم دور تھا جس میں اسلام اور مسلمانوں کی بے لوث خدمت کا جذبہ تھا۔ اس دور کی تمام خصوصیات میں اس دور کو چلانے والی وہ مقدس ہستیاں تھیں جن کا نصب العین اسلامی ریاست کو سیاسی اور اجتماعی نظامِ دین کے اصولوں کے مطابق فراہم کرنا تھا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ

آپ کا اسلامی اسم گرامی عبد اللہ کنیت ابو بکر اور لقب صدیق اور عتیق ہیں۔ آپ کے والد کا نام عثمان اور کنیت ابو قحافہ ہے، والدہ کا نام سلمٰی اور اور کنیت ام الخیر ہے۔ آپ کا تعلق قبیلہ قریش کی شاخ بنو تمیم سے ہے۔ عہد جاہلیت میں آپ کا نام عبد الکعبہ تھا جو حضور نے بدل کر عبد اللہ رکھ دیا تھا۔[تاریخ مشائخ نقشبندیہ از پروفیسر صاحبزادہ محمد عبد الرسول للہی جلد 1 صفحہ 111] "عبد الکعبہ " کی وجہ تسمیہ کچھ یوں بیان کی جاتی ہے۔ بعض روایات کے مطابق آپ کے والدین کے لڑکے زندہ نہیں رہتے تھے، اس لیے انہوں نے نظر مانی کہ اگر ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور زندہ رہا تو وہ اس کا نام "عبد الکعبہ " رکھیں گے اور اسے خانہ کعبہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے۔ چنانچہ جب آپ پیدا ہوئے تو انہوں نے نذر کے مطابق آپ کا نام "عبد الکعبہ " رکھا اور جوان ہونے پر پر آپ عتیق (آزاد کردہ غلام) کے نام سے موسوم کیے جانے لگے کیونکہ آپ نے موت سے رہائی پائی تھی[حضرت ابو بکر صدیق از محمد حسین ہیکل صفحہ 26]۔

پیدائش

حضرت ابو بکر صدیق کی پیدائش عام الفیل سے دو سال چھ ماہ بعد اور ہجرت نبوی سے پچاس سال چھ ماہ پہلے مکہ شریف میں ہوئی۔ سالِ ولادت 573ء عیسوی ہے۔ آپ سرورِ عالم سے دو سال چھ ماہ چھوٹے تھے۔[سیرۃ خلیفۃ الرسول سیدنا حضرت ابو بکر صدیق از طالب ہاشمی صفحہ 37] اُم المومنین حضرت عائشہ بنت ابی بکرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق میرے پاس بیٹھے اپنی ولادت کا تذکرہ فرما رہے تھے آپ دونوں کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ، حضرت ابو بکر صدیقؓ سے عمر میں بڑے ہیں[سیرت سیدنا حضرت ابو بکر صدیق از محمد حسیب قادری صفحہ 12]۔

سلسلہ نسب

والد کی جانب سے سلسلہ نسب یہ ہے۔ ابو قحافہ عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تمیم بن مرہ بن کعب، والدہ کی جانب سے سلسہ نسب یہ ہے۔ ام لخیر سلمی بنت صخر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تمیم بن مرہ بن کعب، بعض لوگوں نے آپ کی والدہ کا سلسلہ نسب یہ بیان کیا ہے: سلمٰی بنت صخر بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تمیم بن مرہ مگر یہ غلط ہے اس لیے کہ اس صورت میں وہ ابو قحافہ کی بھتیجی ہو جائیں گی اور اہل عرب بھتیجی سے زمانہ

جہالت میں بھی نکاح نہیں کرتے تھے۔ آپ کے والد اور والدہ دونوں کی جانب سے حضور سے سلسلہ نسب ساتویں پشت میں مل جاتا ہے کیونکہ آپ کے والدین آپس میں عم زاد تھے۔ محمد بن سعد کا قول ہے کہ ابو بکر کی والدہ کا نام لیلی بن صخر بن تھا[اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ مصنف عزالدین بن الاثیر ابی الحسن بن محمد الجرزی اردو ترجمہ مولانا عبد الشکور فاروقی لکھنوی جلد دوم حصہ پنجم صفحہ 300]۔

کنیت ابو بکر کی وجہ تسمیہ

آپ کی کنیت ابو بکر کے بارے میں منقول ہے کہ چونکہ آپ اعلیٰ خصلتوں کے مالک تھے اس لیے آپ ابو بکر کے نام سے مشہور ہوئے جو بعد ازاں آپ کی کنیت ٹھہری۔ آپ کی کنیت ابو بکر کے بارے میں یہ سند پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتی کہ آپ کو سب سے پہلے ابو بکر کے نام سے کس نے پکارا۔ مورخین نے آپ کی کنیت کی مشہور ہونے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی کہ عربی میں بکر جوان اونٹ کو کہتے ہیں اور آپ کو چونکہ اونٹوں کی غور و پرداخت میں بہت دلچسپی تھی اور ان کے علاج و معالجے میں بہت واقفیت رکھتے تھے۔ اس لیے لوگوں نے آپ کو ابو بکر کہنا شروع کر دیا جس کے معنی ہیں اونٹوں کا باپ۔[حضرت ابو بکر صدیق از محمد حسین ہیکل صفحہ 27اور28] ابو کے معنی والا اور بکر کے معنی اولیت ہے اسی سے بکرہ یا باکرہ ہے۔ ابو بکر کے معنی ہوئے اولیت والے۔ چونکہ آپ ایمان، ہجرت، حضور کی وفات کے بعد وفات میں اور قیامت کے دن قبر کھلنے وغیرہ سب کاموں میں آپ ہی اول ہیں اس لیے آپ کو ابو بکر کہا گیا[مرآۃ المناجیح اردو ترجمہ و شرح مشکوٰۃ المصابیح از مفتی احمد یار خان نعیمی جلد 8 صفحہ 318]۔

صدیق کی وجہ تسمیہ

آپ کے لقب صدیق کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ معراج کے بعد واپس آئے اور قریشِ مکہ کو اپنی معراج سے آگاہ فرمایا تو انہوں نے آپ کی تکذیب کی۔ جب سیدنا ابو بکرؓ کو واقعہ معراج کے بارے میں پتا چلا تو آپ نے فرمایا: میں حضور نبی کریم ﷺ کے معراج پر جانے کی تصدیق کرتا ہوں۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے آپ کی اس تصدیق کی وجہ سے آپ کو صدیق کا لقب عطا فرمایا۔ امام نوویؒ نے سیدنا علی المرتضیٰؓ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ابو بکر کا لقب صدیق اس وجہ سے ہے کہ آپ ہمیشہ سچ بولا کرتے تھے، آپ نے نبی کریم ﷺ کی نبوت کی تصدیق میں جلدی کی اور آپ سے کبھی کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ جب معراج شریف میں حضور نبی کریم کو آسمانوں کی سیر کرائی گئی تو

آپ نے جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا کہ میری اس سیر کو کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔ جبرائیل نے عرض کیا آپ کی تصدیق سیدنا ابو بکر کریں گے کیونکہ وہ صدیق ہیں۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جبل احد پر تشریف لے گئے اور آپ کے ہمراہ ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنھم بھی تھے۔ احد پہاڑ پر زلزلہ آگیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے پیر کی ٹھوکر لگائی اور فرمایا اے اُحد! ٹھہر جا، تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید موجود ہیں۔ سیدنا علی المرتضیٰؓ نے سیدنا ابو بکر صدیقؓ کے وصال پر فرمایا کہ اللہ عزوجل نے ابو بکر کا نام صدیق رکھا اور پھر آپ نے سورۃ الزمر کی آیت ذیل تلاوت فرمائی: "وہ جو سچائی لے کر آیا اور وہ جس نے اس سچائی کی تصدیق کی وہی متقی ہیں" (سیرت سیدنا حضرت ابو بکر صدیق از محمد حسیب قادری صفحہ 9 اور 10)۔

عتیق کی وجہ تسمیہ

سید ابو بکر صدیقؓ کے اسم گرامی کے بارے میں اکثر محدثین کا خیال ہے کہ آپ کا نام عتیق تھا۔ عتیق کا مطلب آزاد۔ جبکہ بیشتر محدثین کرام کا خیال ہے کہ عتیق آپ کا لقب تھا اور اس ضمن میں ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی روایت بیان فرماتے ہیں۔ آپؓ سے مروی ہے کہ ایک روز میں اپنے حجرہ مبارک میں موجود تھی اور باہر صحن میں کچھ صحابہ کرامؓ، حضور نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تشریف فرما تھے۔ اس دوران میں سیدنا ابو بکرؓ تشریف لائے تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو لوگ کسی عتیق (آزاد) کو دیکھنا چاہیں وہ ابو بکر صدیقؓ کو دیکھ لیں۔ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا ابو بکر صدیقؓ کے بارے میں فرمایا کہ اللہ عزوجل نے سیدنا ابو بکر صدیقؓ کو آگ سے آزاد کر دیا ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کے بعد آپ عتیق کے لقب سے بھی مشہور ہوئے۔ حضرت لیث بن سعد سے منقول ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیقؓ کو عتیق حسن وصورت وجہ سے کہا جاتا ہے۔ بعض علما کا قول ہے کہ چونکہ آپ کے نسب میں کوئی بھی ایسی بات نہیں جو عیب سمجھی جا سکے پس سلسلہ نسب کے بے عیب ہونے کے سبب آپ کا نام عتیق مشہور ہوا۔

قبل اسلام

آپ بچپن سے اعتدال، پاکباز اور بلند اخلاق کے مرقع تھے۔

بچپن

آپ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ کفر و شرک اور فسق و فجور کا دور تھا، خانہ کعبہ کا متولی اور محافظ قبیلہ قریش بھی عرب کے دوسرے قبیلوں کی طرح کفر و شرک میں گلے تک دھنسا ہوا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ جب ابو بکرؓ کی عمر چار سال تھی تو آپ کے والد ابو قحافہ آپ کو اپنے ساتھ بت خانہ لے گئے اور وہاں پر نصب ایک بڑے بت کی طرف اشارہ کر کے آپ سے فرمایا:۔

''یہ ہے تمہارا بلند و بالا خدا اس کو سجدہ کرو''۔

ننھے ابو بکر نے بت کو مخاطب بنا کر کہا:۔

''میں بھوکا ہوں مجھے کھانا دے، میں ننگا ہوں مجھے کپڑے دے، میں پتھر مارتا ہوں اگر خدا ہے تو اپنے آپ کو بچا''۔

بھلا وہ پتھر کیا جوب دیتا ابو بکر نے اس کو ایک پتھر اس زور سے مارا کہ وہ گر پڑا۔ ابو قحافہ یہ دیکھ کر غضبناک ہو گئے۔ انہوں نے ننھے ابو بکر کو رخسار پر تھپڑ مارا اور وہاں سے گھسیٹے ہوئے ام الخیر کے پاس لائے۔ انہوں نے ننھے بچے کو گلے لگا لیا اور ابو قحافہ سے کہا:۔

''اسے اس کے حال پر چھوڑ دو جب یہ پیدا ہوا تھا تو مجھے اس کے بارے میں غیب سے کئی اچھی باتیں بتائی گئی تھیں''۔

اس وقعے کے بعد کسی نے آپ کو بت پرستی وغیرہ پر مجبور نہیں کیا اور آپ کا دامن شرک سے پاک رہا۔ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اور بحثیت مجموعی عرب ایک ان پڑھ قوم تھے، البتہ خال خال لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے اور سیدنا ابو بکر ان میں سے ایک تھے۔ قیاس یہ ہے کہ ابو قحافہ نے اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ اس طرح آپ صرف نہ پڑھنا لکھنا جان گئے بلکہ شرفاء کے دوسرے اچھے مشاغل میں بھی آپ کو دسترس حاصل ہو گئی مثلاً لڑنے کا ڈھنگ، ہتھیاروں کا استعمال، شعر گوئی اور شعر فہمی، تجارت وغیرہ۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی لیکن آپ عیش و عشرت اور شراب خوری جیسے ذمائم سے ہمیشہ نفور رہے۔

جوانی کے حالات

قریش کی ساری قوم تجارت پیشہ تھی اور اس کا ہر فرد اس شغل میں مصروف تھا۔ چنانچہ آپ نے بھی جوان ہو کر کپڑے کی تجارت شروع کر دی جس میں آپ کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا اور آپ کا شمار بہت جلد مکہ کے نہایت کامیاب تاجروں میں ہونے لگا۔ تجارت میں آپ کی کامیابی میں آپ کی جاذب شخصیت اور بے نظیر اخلاق کو خاصا دخل تھا۔ جب ابو بکر صدیق کی عمر اٹھارہ سال تھی تو آپ حضور نبی کریم کے ہمراہ تجارت کی غرض سے ملک شام گئے اور ایک مقام پر بیری کے درخت کے نیچے تشریف فرما ہوئے۔ قریب ہی ایک اہل کتاب راہب رہتا تھا سیدنا ابو بکر اس کے پاس گئے تو اس نے پوچھا کہ بیری کے درخت کے نیچے کون ہے؟ آپ نے جواب دیا:۔

محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب

اس راہب نے کہا واللہ یہ نبی ہیں۔ اس درخت کے سائے میں حضرت مسیح کے بعد سوائے حضرت محمد نبی اللہ کے اور کوئی نہیں بیٹھا۔ یہ بات آپ کے دل میں جم گئی اور اسی دن سے انہوں نے حضور نبی کریم کی صحبت و محبت اختیار کر لی۔ ایک مرتبہ حضرت ابو بکر صحن کعبہ میں کھڑے تھے۔ اتنے میں امیہ بن ابی صلت ثقفی شاعر جو جاہلی دور میں موحدانہ نظمیں کہا کرتا تھا وہاں آیا اور آپ سے خطاب کر کے کہنے لگا جس نبی کی آمد کا انتظار ہے وہ ہم (اہل طائف) میں مبعوث ہو گا یا تم (قریش مکہ) میں؟ آپ نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ اس گفتگو کے بعد آپ تصدیق حال کے لیے ورقہ بن نوفل کے پاس گئے۔ یہ اکثر آسمان کی طرف دیکھتے رہتے تھے اور منہ میں کچھ گنگنایا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر نے امیہ بن ابی اصلت کا مقولہ پیش کر کے ان کا خیال معلوم کرنا چاہا۔ ورقہ بن نوفل نے کہا:۔

"ہاں بھائی مجھے علوم سموی پر عبور حاصل ہے جس نبی کی آمد کا انتظار ہے وہ وسطِ عرب کے ایک خاندان سے ظاہر ہو گا اور چونکہ میں علم نسب کا بھی ماہر ہوں اس بنا پر کہتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر ہو گا"۔

ورقہ کا بیان سن کر آپ کا اشتیاق و انتظار اور بڑھ گیا۔

حضرت ابو بکر صدیق نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ ایک چاند مکہ پر نازل ہو کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور اس کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک گھر میں داخل ہوا پھر یہ ٹکڑے باہم مل گئے اور مکمل چاند آپ کی گود میں آ گیا۔ آپ بیدار ہوئے تو رؤیا کی تعبیر میں مہارت رکھنے والے ایک شخص کے پاس

گئے اور اس سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی۔ اس نے بتایا کہ اس نبی آخر الزمان کی پیروی کروگے جس کا انتظار کیا جارہا ہے اور تم اس نبی کے پیروؤں میں سب سے افضل ہوگے۔

ابن عساکر نے حضرت کعب سے روایت کی ہے کہ حضرت ابو بکر ایک مرتبہ بغرض تجارت ملک شام گئے، وہاں ایک عجیب خواب دیکھا۔ اس کی تعبیر دریافت کرنے کے لیے وہاں کے ایک مشہور راہب بحیرا راہب کے پاس گئے۔ بحیرا نے خواب سن کر کہا تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ آپ نے جواب دیا مکہ۔ بحیرا نے پوچھا کس خاندان سے ہو؟ آپ نے فرمایا قریش سے۔ بحیرا نے پوچھا کیا کام کرتے ہو؟ آپ نے فرمایا تاجر ہوں۔ بحیرا نے کہا: "تو پھر سنو تمہارا خواب سچا ہے۔ تمہاری قوم میں ایک عظیم الشان رسول مبعوث ہوں گے تم ان کی زندگی میں ان کے وزیر اور وفات کے بعد ان کے خلیفہ ہو گے۔" عہد جاہلیت میں قبیلہ قریش کی شاخ بنو تمیم کے متعلق دیت اور تاوان کا فیصلہ تھا۔ بنو تمیم میں حضرت ابو بکر صدیق خون بہا اور تاوان کا فیصلہ کرتے تھے جس کو آپ مان لیتے تمام قریش اس کو تسلیم کرتے اگر کوئی دوسرا اقرار کرتا تو کوئی بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ آپ اس شرف وفضیلت کے کہ وہ اپنے قبیلے کے سردار اور منجملہ دس سرداران قریش کے ایک سردار تھے۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی بڑے متمول اور صاحب اثر تھے۔ آپ قریش میں بڑے بامروت اور لوگوں پر احسان کرنے والے تھے۔ مصائب کے وقت صبر و استقامت سے کام لیتے اور مہمانوں کی خوب مدارات و توضع بجالاتے۔ لوگ اپنے معاملات میں آپ سے آکر مشورہ لیا کرتے اور اپ کو اعلیٰ درجے کا صائب الرائے سمجھتے تھے۔ آپ انساب اور اخبار عرب کے بڑے ماہر تھے۔

شراب کی حرمت

آپ طبعاً برائیوں اور کمینہ خصلتوں سے محترز رہتے تھے۔ آپ نے جاہلیت میں اپنے اوپر شراب حرام کرلی تھی۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے کبھی شراب پی؟ آپ نے فرمایا نعوذ باللہ کبھی نہیں۔ اس نے پوچھا کیوں؟ آپ نے فرمایا میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے بدن میں سے بو آئے اور مروت زائل ہو جائے۔ یہ گفتگو نبی کریم کی مجلس میں روایت ہوئی تو آپ نے دو مرتبہ فرمایا کہ ابو بکر سچ کہتے ہیں۔ ام امومنین حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیق نے دور جاہلیت سے ہی اپنے اوپر شراب کو حرام قرار دیا تھا اور آپ نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔

حضرت ابو بکر صدیق فرماتے ہیں کہ دور جاہلیت میں میرا گزر ایک مدہوش آدمی کے پاس سے ہوا جو غلاظت میں اپنا ہاتھ ڈالتا اور پھر اسے منہ کے پاس لے جاتا۔ جب اس کو اس غلاظت کی بدبو محسوس ہوتی تو وہ ہاتھ منہ میں ڈالنے سے رک جاتا۔ میں نے جب دیکھا تو اس وقت سے شراب کو خود پر حرام کر لی (معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ مصنف ملا معین واعظ الہروی مترجمین علامہ اقبال احمد فاروقی، حکیم اصغر احمد فاروقی جلد دوم صفحہ 229 تا 234)۔

قبول اسلام

حضرت ابو بکر صدیق کے ایمان لانے اور اس کے اسباب میں بہت سے اقوال ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعث سے بیس سال پہلے آپ نے خواب میں دیکھا تھا کہ چاند آسمان سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کعبہ میں گرا۔ مکہ کے ہر گھر ایک ایک ٹکڑا گرا پھر تمام ٹکڑے اکھٹے ہو کر پہلی شکل پر آ گئے اور آسمان کی طرف چلے گئے مگر وہ ٹکڑا جو آپ کے گھر آیا تھا وہیں رہ گیا اور دوسری روایت میں ہے کہ وہ تمام ٹکڑے مل کر آپ کے گھر آ گئے اور آپ نے آپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ ان انوار کے حالات دریافت کرنے کے لیے علی الصبح یہودی عالماء میں سے ایک عالم کے پاس گئے اور اس سے تعبیر پوچھی۔ یہودی عالم نے کہا یہ اضغاث واحلام میں سے ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں۔ کچھ عرصہ اسی طرح گزرا، اپنی تجارت کے سلسلے میں بحیرا راہب کی خانقاہ میں پہنچے اور راہب سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی۔ راہب نے کہا آپ کون ہیں؟ آپ نے کہا میں قریشی ہوں۔ راہب نے کہا مکہ میں تمہارے درمیان میں ایک پیغمبر ظاہر ہو گا اس کا نور ہدایت مکہ کے ہر گھر میں پہنچے گا، آپ ان کی زندگی میں ان کے وزیر ہوں گے اور پیغبر کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ ہوں گے۔ ابو بکر صدیق نے کہا میں خواب کو پوشیدہ رکھتا تھا یہاں تک کہ خدا تعالیٰ نے واقعی پیغبر کو خلق کی خدمت کے لیے بھیجا۔ جب مجھے آپ کے ظہور کی خبر ملی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آنحضرت نے مجھے اسلام کی دعوت دی، میں نے عرض کہ ہر پیغبر کی نبوت پر دلیل ہوتی تھی آپ کی کیا ہے؟ نبی کریم نے فرمایا کہ میری نبوت کی دلیل وہ خواب ہے جو تم نے دیکھا تھا اور یہودی عالم نے کہا تھا اس کا کوئی اعتبار نہیں بحیرا راہب نے اس کی اس طرح تعبیر کی تھی۔ میں نے ہو چھا آپ کو اس کی کس نے خبر دی ہے؟ آپ نے فرمایا مجھے جبرائیل نے اطلاع دی ہے۔ میں نے کہا اس سے زیادہ میں آپ سے کوئی دلیل و برہان نہیں پوچھتا اور آپ نے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔

قبول اسلام میں شرف

سیدنا ابو بکر صدیق اسلام قبول کرنے والے دوسرے شخص تھے۔ آپ سے پہلے حضور نبی کریم کی زوجہ ام امومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد نے اسلام قبول کیا تھا۔

حضرت علی المرتضی سے کسی نے پوچھا کہ مہاجرین وانصار نے سیدنا ابو بکر کی بیعت میں سبقت کیوں کی جبکہ آپ کو ان پر فوقیت حاصل تھی۔ علی المرتضیٰ نے جواب دیا کہ سیدنا ابو بکر کو چار باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ میں ان کا ہمسر نہیں تھا، اسلام کا اعلان کرنے میں، ہجرت میں پہل کرنے میں، غار میں حضور نبی کریم کے ساتھ ہونے اور علانیہ نماز پڑھنے میں وہ مجھ سے آگے تھے۔ انہوں نے اس وقت اسلام کا اظہار کیا جب میں اسے چھپا رہا تھا۔ قریش مجھ کو حقیر سمجھتے تھے جبکہ وہ ابو بکر کو پورا پورا وزن دیتے تھے۔ اللہ کی قسم! اگر سیدنا ابو بکر کی یہ خصوصیات نہیں ہوتی تو اسلام اس طرح نہ پھیلتا اور طالوت کے ساتھیوں نے نہر سے پانی پی کر جس کردار کا اظہار کیا تھا اسی طرح کے کردار کا اظہار لوگ یہاں بھی کرتے۔ دیکھتے نہیں کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں کو ڈانتا وہاں سیدنا ابو بکر کی تعریف بھی کی۔

امام جلال الدین سیوطی بیان کرتے ہیں کہ امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہ کی رائے ہے اور اس کی تائید ترمذی شریف کی حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے اسلام حضرت ابو بکر صدیق نے قبول کیا، عورتوں میں سب سے پہلے اسلام ام المومنین حضرت خدیجہ نے قبول کیا جبکہ بچوں میں سب سے پہلے اسلام سیدنا علی امر تضیٰ نے قبول کیا۔[سیرت سیدنا حضرت ابو بکر صدیق از محمد حسیب قادری صفحہ 21اور22] سب سے پہلے جن ہستیوں نے قبول اسلام کی دعوت پر لبیک کہا وہ تھیں----حضرت ابو بکر صدیق، حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت علی المرتضٰی اور حضرت زید بن حارثہ۔ حضرت خدیجہ نبی کریم کی اہلیہ تھیں، حضرت علی نبی کریم کے نابالغ چچازاد بھائی تھے اور آپ کے زیر کفالت تھے۔ حضرت زید بن حارثہ پہلے حضور نبی کریم کے غلام تھے پھر آپ نے ان کو آزاد کر دیا لیکن انہوں نے آپ کا خادم بن آپ کے پاس ہی رہنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ حضور نبی کریم نے ان کو اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ اس لحاظ سے تینوں حضور نبی کریم کے گھر کے افراد تھے۔ ابو بکر صدیق گھر سے باہر کے آدمی تھے تاہم انہوں نے عامۃ الناس میں سب سے پہلے قبول اسلام کا شرف کیا، اس لیے اول المسلمین کہلائے[سیرۃ خلیفۃ الرسول سیدنا حضرت ابو بکر صدیق از طالب ہاشمی صفحہ 44اور45]۔

صدیق کی کوششوں سے اسلام لانے والے

بزرگان فن سیر نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق مسلمان ہونے کے بعد اپنے پرانے رفیقوں اور دوستوں میں سے جس سے بھی ملتے اسے ہدایت کا راستہ اختار کرنے کی ترغیب دیتے۔ واضح نشانات اور مضبوط دلائل کے ساتھ پیغمبر کی نبوت کی صداقت کو ان کے سامنے پیش کرتے، اکابر قریش اور عرب کے سرداروں کی ایک جماعت آپ کی مبارک ہمت کی برکت سے گمراہی کی وادی سے چشمہ ہدایت پر پہنچی۔

حضرت صدیق اکبر کی بیٹی اسماء بنت ابی بکر ذات النطاقین فرماتی ہیں کہ ہمارے اباجان جس روز ایمان لائے گھر آئے اور ہم سب کو اسلام کی دعوت دی جب تک ہم سب دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہو گئے اور رسول اللہ کی تصدیق اور دین توحید کو قبول نہیں کر لیا مجلس سے نہیں اٹھے۔

عشرہ مبشرہ میں سے پانچ آدمی عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ، سعد بن ابی وقاص اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنھم اجمین آپ کی راہنمائی اور ترغیب سے دولت اسلام سے سرفراز ہوئے۔

غرباء، مساکین اور مظلوموں کی امداد

اعلان نبوت کے چوتھے سال جب علانیہ دعوت اسلام کا حکم نازل ہو تو رسول اللہ نے لوگوں کو علانیہ حق کی جانب بلانا شروع کر دیا۔ اس پر مشرکین قریش بھڑک اٹھے اور انہوں نے مسلمانوں پر بے تحاشا ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیے۔ بالخصوص اسلام قبول کرنے والے غلاموں اور لونڈیوں پر انہوں نے ایسے ایسے ظلم ڈھائے کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی۔ ظلم و ستم کے اس دور میں حضرت ابو بکر صدیق نے بے دریغ مال خرچ کر کے متعدد مظلوم غلاموں اور لونڈیوں کو ان کے سنگدل آقاؤں سے خرید خرید کر آزاد کروایا۔

ہجرت حبشہ کا قصد

حضرت ابو بکر صدیق کو نماز اور ذکر الٰہی سے بے حد شغف تھا وہ اس سوز و گداز سے نماز پڑھتے اور تلاوت کرتے کہ قریش کے بیوی بچے متاثر ہو کر ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ اس سے قریش کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے متعلقین اپنے آبائی دین سے منحرف ہو کر اسلام کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ وہ ابو بکر صدیق کو نماز پڑھنے سے روکتے اور اذیت پہنچاتے [سیرۃ خلیفۃ الرسول سیدنا حضرت ابو بکر صدیق از طالب ہاشمی صفحہ 54]۔

ہجرت کی اجازت

امام واقدی کا بیان ہے کہ قریش ظلم وتعدی کے عادی ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کی ایذا رسانی جب رسول اللہ کے صحابہ پر عام ہو گئی اور ان کا ظلم و ستم انتہا درجہ کو پہنچ گیا، صحابہ کرام نے نبی کریم کی خدمت میں شکایت کی۔ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ ایک دن ابو بکر صدیق نبی کریم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:۔

''یارسول اللہ! اگر آپ حاطب بن عمیر بن عبد شمس پر ظلم و ستم کو دیکھتے تو ضرور مہربانی فرماتے''۔

نبی کریم نے ہجرت کی اجازت فرمادی، صدیق نے عرض کی:۔

یارسول اللہ! آپ کس طرف ہجرت کا حکم فرماتے ہیں؟

نبی کریم نے حبشہ کی جانب راہنمائی فرمائی کیونکہ صحابہ کرام مسافت کم ہونے اور وہاں کی آب وہوا ام القری مکہ کے مناسب ہونے کی وجہ سے اس طرف ہجرت کرنا مناسب سمجھتے تھے[معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ مصنف ملا معین واعظ الہروی مترجمین علامہ اقبال احمد فاروقی، حکیم اصغر احمد فاروقی جلد دوم صفحہ 262]۔

مالک بن دغنہ کی پناہ میں

جب مسلمانوں پر اہل مکہ کے ظلم و ستم حد سے بڑھ گئے تو بعث نبوت کے پانچویں اور چھٹے سال بہت سے مسلمانوں نے حبش کی طرف ہجرت کی تا کہ وہاں آرام وسکون سے اپنے مذہب پر عمل کیا جاسکے۔ حضرت ابو بکر نے بھی حبشہ کی طرف ہجرت کی مگر جب آپ مقام "برک الغماد" میں پہنچے تو قبیلہ قارہ کا سردار مالک بن دغنہ راستے میں ملا اور دریافت کیا کہ کیوں؟ اے ابو بکر! کہاں چلے؟ آپ نے اہل مکہ کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا میں اب اپنے وطن مکہ کی زمین کو چھوڑ کر خدا کی لمبی چوڑی زمین میں پھرتا رہوں گا اور خدا کی عبادت کرتا رہوں گا۔ ابن دغنہ نے کہا کہ اے ابو بکر! آپ جیسا آدمی نہ شہر سے نکل سکتا ہے نہ نکالا جاسکتا ہے۔ آپ دوسروں کا بار اٹھاتے ہیں، مہماناں حرم کی مہمان نوازی کرتے ہیں، خود کما کر مفلسوں اور

محتاجوں کی مالی امداد کرتے ہیں، حق کے کاموں میں سب کی مدد واعانت کرتے ہیں۔ آپ میرے ساتھ مکہ واپس چ لیے میں آپ کی پناہ لیتا ہوں۔ ابن دغنہ آپ کو زبردستی مکہ واپس لائے اور تمام کفار سے کہہ دیا کہ میں نے ابو بکر کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ لہذا خبردار! کوئی ان کو نہ ستائے۔ کفار نے کہا کہ ہم کو اس شرط پر منظور ہے کہ ابو بکر اپنے گھر میں چھپ کر قرآن پڑھیں تاکہ ہماری عورتوں اور بچوں کے کان میں قرآن کی آواز نہ پہنچے۔ ابن دغنہ نے کفار کی شرط کو منظور کر لیا۔ ابو بکر صدیق نے چند دنوں تک اپنے گھر کے اندر قرآن پڑھتے رہے مگر آپ کے جذبہ اسلامی اور جوش ایمانی نے یہ گوارا نہیں کیا کہ معبودان باطل لات وعزی کی عبادت تو علی الاعلان ہو اور معبود برحق اللہ تعالی کی عبادت چھپ کر گھر کے اندر کی جائے۔ چنانچہ آپ نے گھر کے باہر اپنے صحن میں ایک مسجد بنالی اور اس مسجد میں علی الاعلان نمازوں میں بلند آواز سے قرآن پڑھنے لگے اور کفار مکہ کی عورتیں اور بچے بھیڑ لگا کر قرآن پاک سننے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر کفار مکہ نے ابن دغنہ کو مکہ بلایا اور شکایت کی کہ ابو بکر گھر کے باہر قرآن پڑھتے ہیں۔ جس کو سننے کے لیے ان کے گھر کے گرد ہماری عورتوں اور بچوں کا میلہ لگ جاتا ہے۔ اس سے ہم کو بڑی تکلیف ہوتی ہے لہذا تم ان سے کہے دو کہ یا تو وہ گھر میں قرآن پڑھیں ورنہ تم اپنی پناہ کی ذمہ داری سے دست بردار ہو جاؤ۔ چنانچہ ابن دغنہ نے ابو بکر سے کہا کہ اے ابو بکر! آپ گھر کے اندر چھپ کر قرآن پڑھیں ورنہ میں اپنی پناہ سے کنارہ کش ہو جاؤ گا اس کے بعد کفار مکہ آپ کو ستائیں گے تو میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ یہ سن کر ابو بکر نے فرمایا کہ اے ابن دغنہ! تم اپنی پناہ کی ذمہ داری سے الگ ہو جاؤ مجھے اللہ تعالی کی پناہ کافی ہے اور میں اس کی مرضی پر راضی برضا ہوں۔

ابی بن خلف کے ساتھ شرط باندھنا

نبوت کے آٹھویں سال مکہ میں یہ خبر عام ہوئی کہ اہل فارس نے اہل روم پر فتح حاصل کر لی۔ مشرکین اس خبر سے بہت خوش ہوئے، کہنے لگے رومی اہل کتاب ہیں اور فارسی آتش پرست، جس طرح کسری نے قیصر پر لشکر کشی کی ہم بھی محمد (ﷺ) کی فوج پر جو اہل کتاب ہے، غالب آئیں گے۔ مسلمانوں کے دل ان کی باتیں سننے سے غمگین ہوتے تھے، پس جبرائیل امین خدا تعالی کے حکم سے یہ پیغام لائے:۔

"الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ○ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ"۔(سورۃ الروم: 1 تا 3)

مسلمان اس آیت کے اترنے سے خوشی کا اظہار کرتے تھے، ناسمجھ کفار اس صورت حال کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کلمات محمد (ﷺ) کے گھڑے ہوئے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ابو بکر صدیقؓ نے ابی بن خلف کافر کے ساتھ شرط باندھی کہ اگر تین سال تک اور ایک روایت کے مطابق چھ سال تک رومیوں کو غلبہ حاصل ہوا تو ابو بکر دس جوان اونٹ اس لعین سے لے گا اور اگر غلبہ حاصل نہ ہوا تو دس اونٹ اس کو دے گا۔ جب رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ کو اس شرط کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ کلمہ "بِضع" میں ابہام ہے کیونکہ عرف عرب میں یہ تین یا نو عدد میں استعمال ہوتا ہے۔ پس اس کلمہ کا تعین اور کم از کم مدت مناسب نہیں تھی، کیونکہ ممکن ہے کہ رومیوں کو نو سال کا عرصہ گزرنے سے پہلے غلبہ حاصل نہ ہو اور ایک روایت میں ہے کہ اس مدت کو نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ، اونٹوں کی تعداد بڑھا دو اور اسی طرح مدت میں بھی اضافہ کر دو۔ چنانچہ ابو بکرؓ اس کے پاس گئے اور کہا سالوں کو بھی زیادہ کرتا ہوں اور مال کو بھی، نو سال کی مدت اور سو اونٹ مقرر ہوئے اور طرفین اس پر راضی ہوئے۔ اس وقت شرط باندھنا حرام نہیں ہوا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس خوف سے کہ ابو بکرؓ شہر سے چلے نہ جائیں۔ عبد الرحمن بن ابی بکرؓ کو ضامن مقرر کیا اور جب ابی بن خلف جنگ احد میں شریک ہونے کے لیے گیا تو عبد الرحمن نے کہا ضامن دو، اس نے ضامن دے دیا۔ جنگ احد میں ابی بن خلف حضور نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں مارا گیا۔ صلح حدیبیہ یا غزوہ خیبر کے روز رومیوں کے فارسیوں پر فتح مند ہونے کی خبر پہنچی۔ عبد الرحمن نے ابی بن خلف کے ضامن سے اونٹ لیے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لایا۔ نبی کریم ﷺ نے اسے تصرف میں لانے کا حکم دیا۔

آپؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہجرت کی۔ انہوں نے اپنی تمام دولت راہ خدا میں خرچ کر دی۔ اسلام لانے کے بعد آپ کی زیادہ تر زندگی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں گزری۔ جب نبی اکرم ﷺ کی بیماری نے شدت اختیار کی تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ ابو بکرؓ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ ایک دن ابو بکرؓ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ حضرت بلالؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو نہ پا کر حضرت عمرؓ سے نماز پڑھانے کو کہا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو بکرؓ کہاں ہیں؟ اللہ اور مسلمان یہ بات پسند کرتے ہیں کہ ابو بکرؓ نماز پڑھائیں۔

امارت حج

غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد حج کا موسم آیا تو سرکار عالم ﷺ نے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ حج کے لیے مکہ مکرمہ بھیجا۔ اس قافلے کا امیر آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو مقرر فرمایا چونکہ حضور خود بعض ضروری دینی کاموں کی وجہ سے حج کے لیے نہ جا سکے۔ آپ ﷺ نے قربانی کے لیے جانور بھی ابو بکرؓ کے ساتھ بھیج دیے۔ ایک روایت کے مطابق ان جانوروں (اونٹوں) کی تعداد بیس تھی۔ نبی کریم ﷺ نے ان جانوروں کی گردنوں میں اپنے دست مبارک سے پٹکے باندھے اور قربانی کے نشان لگائے۔ ان کے علاوہ ابو بکر صدیقؓ نے اپنے پانچ جانور بھی ساتھ لیے۔ حضور ﷺ نے کچھ دوسرے ضروری کام سعد بن ابی وقاص، جابر بن عبد اللہ انصاری اور ابو ہریرہ کے سپرد کیے۔ ایک اور روایت کے مطابق آپ نے ان کو معلم اور منادی مقرر فرمایا۔ حضرت ابو بکر صدیق نے امیر کے تمام فرائض ادا کیے اور اپنے ساتھیوں کے کھانے، سونے اور پینے کا برابر انتظام کرتے رہے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو اس طرح سے منظم کیا کہ دشمنان اسلام یہی سمجھتے رہے کہ مسلمان تعداد میں زیادہ ہیں۔

سیدنا ابو بکر صدیق بحثیت امام

حضرت سہل بن سعدؓ سے مروی ہے کہ بنو عمرو بن عوفؓ کے درمیان میں جھگڑا ہو گیا۔ حضور نبی کریم ﷺ کو جب علم ہوا تو آپ ﷺ نماز ظہر کے بعد ان کے درمیان میں صلح کروانے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے جاتے ہوئے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ بلال! اگر مجھے دیر ہو جائے اور عصر کا وقت ہو جائے تو ابو بکرؓ سے کہنا کہ وہ نماز عصر میں لوگوں کی امامت کریں۔ چنانچہ نماز عصر کا وقت ہو گیا اور حضرت بلالؓ نے نماز کے لیے اقامت کہی اور سیدنا ابو بکرؓ امامت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس دوران میں حضور ﷺ بھی تشریف لے آئے۔ آپ صفوں کو پھلانگتے ہوئے ابو بکر کے پیچھے آ کھڑے ہوئے۔ اس دوران میں صحابہ کرامؓ نے ابو بکر صدیقؓ کو متوجہ کرنے کے لیے سیٹیاں بجائیں کیونکہ سیدنا ابو بکرؓ جب نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تو پھر کسی جانب متوجہ نہ ہوتے تھے۔ ابو بکرؓ نے جب دیکھا کہ لوگ سیٹیاں بجانے سے رک نہیں رہے تو انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حضور ﷺ کو تشریف فرما دیکھا۔ آپؓ نے حضور ﷺ کے لیے جگہ چھوڑنی چاہی تو حضور ﷺ نے اشارہ سے فرمایا کہ امامت کرتے رہو۔ سیدنا ابو بکرؓ نے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر پیچھے ہٹ گئے تو حضور ﷺ آگے بڑھے اور امامت فرمائی۔ نماز پڑھنے کے بعد حضور ﷺ نے ابو بکر صدیقؓ سے فرمایا کہ ابو بکر! تم نے امامت کیوں نہ کروائی؟ ابو بکرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! (ﷺ) ابو قحافہ کے بیٹے کا اتنا مقام کیا کہ وہ آپ ﷺ کا امام بنے۔

اس موقع پر حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ وہ اگر نماز میں کوئی ایسا فعل دیکھیں تو بجائے سیٹیاں بجانے کے سبحان اللہ کہیں۔ ام المومنین عائشہؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا مرض شدید ہو گیا تو حضرت بلالؓ نماز کی اطلاع دینے آئے فرمایا ابو بکرؓ کو حکم دو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! ابو بکرؓ غمگین آدمی ہیں وہ جب آپ ﷺ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگوں کو قرآن نہ سنا سکیں گے، اگر آپ ﷺ عمرؓ کو حکم دے دیں (تو مناسب ہو) فرمایا: ابو بکرؓ ہی کو حکم دو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ میں نے حفصہ بنت عمرؓ سے کہا کہ تم آپ سے کہو کہ ابو بکرؓ غمگین آدمی ہیں وہ جب آپ ﷺ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگوں کو قرآن نہ سنا سکیں گے، اس لیے آپ ﷺ عمرؓ کو حکم دیں تو بہتر ہو۔ حفصہؓ نے عرض کی تو فرمایا: بے شک تم لوگ یوسف علیہ السلام کی ساتھ والیاں ہوں، ابو بکرؓ ہی کو حکم دو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ حفصہؓ نے عائشہؓ سے کہا کہ میں ایسی نہیں ہوں کہ مجھے تم سے کوئی خیر پہنچے۔ لوگوں نے ابو بکرؓ کو حکم دیا کہ نمازیں پڑھائیں۔ چنانچہ ابو بکر صدیقؓ نے سترہ نمازیں پڑھائیں۔ ایک دن ظہر کی نماز کے وقت مرض میں کچھ افاقہ محسوس ہوا تو نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ سات پانی کی مشکیں میرے اوپر ڈالی جائیں۔ جب آپ ﷺ غسل فرما چکے تو حضرت عباسؓ بن عبد المطلب اور حضرت علیؓ بن ابی طالب آپ ﷺ کے مقدس بازو تھام کر آپ ﷺ کو مسجد میں لائے۔ سیدنا ابو بکرؓ نماز پڑھا رہے تھے آہٹ پا کر پیچھے ہٹنے لگے مگر آپ ﷺ نے اشارہ سے ان کو روکا اور ان کے پہلو میں نماز پڑھائی۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر ابو بکرؓ اور دوسرے مقتدی لوگ ارکان نماز ادا کرتے رہے۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا جس میں بہت سی وصیتیں اور احکام اسلام بیان فرما کر انصار کے فضائل اور ان کے حقوق کے بارے میں کچھ کلمات ارشاد فرمائے اور سورہ العصر اور ایک آیت بھی تلاوت فرمائی۔

فضیلت

جب حضرت محمد ﷺ حجۃ الوداع سے واپس تشریف لائے تو منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا: لوگو! بے شک ابو بکرؓ نے کبھی مجھے تکلیف نہیں دی، پس تم ان کا مرتبہ پہچانو۔ لوگو! میں ان سے راضی ہوں۔

حضرت محمد ﷺ (ایک دن) اپنی مرض وفات کے دنوں میں سر مبارک پر پٹی باندھ کر تشریف لائے اور منبر پر بیٹھ کر حمد و ثنا بیان کی، پھر نحیف آواز میں فرمایا: لوگوں میں ابو بکرؓ کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جس نے اپنی جان اور مال کے ذریعہ مجھ پر بہت احسان کیا ہو، اگر میں لوگوں میں سے کسی کو اپنا

خلیل بنا سکتا تو ابو بکرؓ کو اپنا خلیل بناتا لیکن اسلام کی اخوت سب سے بہتر ہے، پھر آپ ﷺ نے حکم دیتے ہوئے فرمایا: ابو بکرؓ کے دروازہ کے سوا اس مسجد کے تمام دروازے بند کر دو۔

زمانہ خلافت صدیقی

نبی ﷺ کی وفات کا صدمہ اس قدر گہرا تھا کہ اسے خود برداشت کر لینا اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی غمگین امت کو درست سمت میں لے کر چلنا ایسا کارنامہ تھا جو حضرت ابو بکرؓ ہی انجام دے سکتے تھے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ مسلمانوں کے پہلے خلیفہ مقرر ہوئے۔ خلافت کا منصب سنبھالتے ہی آپؓ کو مرتدوں کے فتنے اور اسامہ کے لشکر کی مشکل پیش آئی۔ (مرتد اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جو حضور ﷺ کے دور میں ایمان لا کر دوبارہ کافر ہو جائے۔ اکثر علما اس کو بھی مرتد کہتے ہیں جو اسلام چھوڑ کر غیر مسلم ہو جائے) نبی ﷺ کی وفات کے بعد عربوں کی بدوی فطرت بیدار ہو گئی۔ وہ مرکز مدینہ سے آزاد ہو کر دوبارہ کفر کی طرف لوٹنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف اسامہ کے لشکر کا مسئلہ بن آیا۔ اس لشکر کو خود نبی اکرم ﷺ نے شام کی سرحد پر رومیوں سے جنگ کے لیے تیار کیا تھا۔ لیکن اب بعض صحابہؓ اس لشکر کی روانگی کے خلاف تھے جبکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر مجھے یہ یقین ہو کہ جنگل کے درندے مجھے اٹھا کر لے جائیں گے تو بھی میں اسامہؓ کے اس لشکر کو روانہ ہونے سے نہیں روک سکتا۔ اس کے علاوہ آپؓ کے زمانہ خلافت میں بہت سے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے بھی پیدا ہو گئے۔ آپؓ نے اپنی دور اندیشی اور فہم و فراست سے ان معاملات کو بڑے اچھے طریقے سے حل کیا۔ سیدنا ابو بکرؓ نے اپنی خلافت کی ذمہ داریاں انتہائی تقویٰ و امانت کے ساتھ ادا کیں۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کی اہلیہ نے حلوہ کھانے کی فرمائش کی تو مسلمانوں کے بیت المال پر بوجھ ڈالنا منظور نہ کیا، بلکہ روزانہ ملنے والے وظیفے میں سے کچھ رقم پس انداز کی تب حلوہ بنایا۔ آپ کا دور خلافت تقریباً ستائیس ماہ رہا۔ آپ کے دور خلافت میں مسلمانوں کو متعدد فتوحات ہوئیں۔

وفات اور مدفن

آپؓ (22 جمادی الثانی 13ھ) 23 اگست 634 میں مدینہ میں فوت ہوئے۔ اپنی وفات سے پہلے آپ نے مسلمانوں کو ترغیب دی کی وہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ تسلیم کرلیں۔ لوگوں نے آپ کی ہدایت پر حضرت عمرؓ کو خلیفہ تسلیم کرلیا۔ وفات کے وقت آپؓ کی عمر مبارک 61 سال تھی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وفات کے بعد حضرت محمد ﷺ کے روضہ مبارک میں آپ ﷺ کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا جو کہ ایک بہت بڑی سعادت تھی۔

حضرت عمر فاروقؓ

عمر بن خطاب) عربی : أبو حفص عمر بن الخطاب العدوي القريشي (ملقب بہ فاروق) پیدائش 586 :ء تا 590 ء کے درمیان مکہ میں۔ وفات 6 : نومبر، 644 ء مدینہ میں (ابو بکر صدیق کے بعد مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ راشد، محمد ﷺ کے خسر اور تاریخ اسلام کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک ہیں۔ عمر بن خطاب عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، ان کا شمار علماوزاہدین صحابہ میں ہوتا تھا۔ ابو بکر صدیق کی وفات کے بعد 23 اگست سنہ 634 ء مطابق 22 جمادی الثانی سنہ 13 ھ کو مسند خلافت سنبھالی۔ عمر بن خطاب ایک باعظمت، انصاف پسند اور عادل حکمران مشہور ہیں، ان کی عدالت میں مسلم و غیر مسلم دونوں کو یکساں انصاف ملا کرتا تھا، عمر بن خطاب کا یہ عدل و انصاف انتہائی مشہور ہوا اور ان کے لقب فاروق کی دیگر وجوہ تسمیہ میں ایک وجہ یہ بھی بنی۔

ابتدائی زندگی

آپؓ مکہ میں پیدا ہوئے اور ان چند لوگوں میں سے تھے جو لکھ پڑھ سکتے تھے۔ جب حضور اکرم ﷺ نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو ابتدا میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ ﷺ کی سخت مخالفت کی۔ آپ ﷺ کی دعا سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کرلیا۔ اس لیے آپ کو مرادِ رسول بھی کہا جاتا ہے. ہجرت کے موقع پر کفار مکہ کے شر سے بچنے کے لیے سب نے خاموشی سے ہجرت کی مگر آپ کی غیرت ایمانی نے چھپ کر ہجرت کرنا گوارہ نہیں کیا۔ آپ نے تلوار ہاتھ میں لی، کعبہ کا طواف کیا اور کفار کے مجمع کو مخاطب کر کے کہا: تم میں سے اگر کوئی شخص یہ

چاہتا ہو کہ اس کی بیوی بیوہ ہو جائے، اس کے بچے یتیم ہو جائیں تو وہ مکہ سے باہر آ کر میرا راستہ روک کر دیکھ لے مگر کسی کافر کی ہمت نہ پڑی کہ آپؓ کا راستہ روک سکتا۔ رسول کریم ﷺ نے آپؓ کے حوالے سے فرمایا: "اگر میرے بعد کوئی اور نبی مبعوث ہونا ہوتا تو وہ عمر بن خطاب ہوتے۔" ایک اور موقع پر فرمایا: "جس راستے پر عمر ہو وہاں سے شیطان راستہ بدل لیتا ہے۔" مزید ایک موقع پر فرمایا: "اللہ نے عمر کی زبان پر حق کو جاری کر دیا ہے"۔

دورِ خلافت

مرضُ الموت میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خلیفہ کا انتخاب کرنا ضروری سمجھا۔ آپؓ نے حضرت عبد الرحمن بن عوف، حضرت عثمان، حضرت سعید بن زید اور دوسرے اصحاب رسول کے مشورے سے حضرت عمر بن خطابؓ کو اپنا جان نشین مقرر کیا۔ آپؓ کی بیعت کا سلسلہ تین دن تک چلتا رہا۔

حضرت عمرؓ اہل ایمان کے ساتھ اولاد کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ انھیں ہر دم خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے دکھوں کا اسی طرح مداوا کرتے جس طرح ایک باپ کرتا ہے۔ آپؓ کے دور خلافت میں ایک دفعہ قحط پڑ گیا۔ جس کی وجہ سے کئی امراض پھیل گئے کئی لوگ چل بسے اور کئی بیمار پڑ گئے۔ آپؓ مریضوں کا علاج معالجہ اور مردوں کی تجہیز و تکفین خود کراتے۔ آپؓ رات کو گلی کوچوں میں چکر لگاتے اور اپنی رعایا کی خبر گیری رکھتے اور اگر کسی کو مصیبت میں مبتلا پاتے تو خود اس کی مدد کرتے۔ عدل فاروقی ضربُ المثل مانا جاتا ہے۔ اس لیے کہ حضرت عمر میں حد درجہ اللہ تعالیٰ کا خوف پایا جاتا تھا۔

آپؓ کے عہد خلافت میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ فتوحات ہوئیں۔ عمر بن خطاب ہجری تقویم کے بانی ہیں، ان کے دور خلافت میں عراق، مصر، لیبیا، سرزمین شام، ایران، خراسان، مشرقی اناطولیہ، جنوبی آرمینیا اور سجستان فتح ہو کر مملکت اسلامی میں شامل ہوئے اور اس کا رقبہ بائیس لاکھ اکاون ہزار اور تیس (22,51,030) مربع میل پر پھیل گیا۔ عمر بن خطابؓ ہی کے دورِ خلافت میں پہلی مرتبہ یروشلم فتح ہوا، اس طرح ساسانی سلطنت کا مکمل رقبہ اور بازنطینی سلطنت کا تقریباً تہائی حصہ اسلامی سلطنت کے زیرِ نگین آ گیا۔ عمر بن خطابؓ نے جس مہارت، شجاعت اور عسکری صلاحیت سے ساسانی سلطنت کی مکمل شہنشاہیت کو دو سال سے بھی کم عرصہ میں زیر کر لیا، نیز اپنی سلطنت و حدود سلطنت کا

انتظام، رعایا کی جملہ ضروریات کی نگہداشت اور دیگر امور سلطنت کو جس خوش اسلوبی اور مہارت و ذمہ داری کے ساتھ نبھایا وہ ان کی عبقریت کی دلیل ہے۔

وفات

آپؓ کی عمر کے بارے میں 53 سے لے کر 63 سال تک کے اقوال پائے جاتے ہیں۔ آپؓ کا دورِ خلافت 10 سال سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ بدھ 26 ذوالحجہ 23ھ کی فجر ہوئی۔ سیدنا عمرؓ نماز پڑھانے مسجد نبوی میں آئے۔ ابھی صفیں سیدھی نہ ہوئی تھیں کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے عیسائی غلام ابولؤلو فیروز نے آپؓ پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس نے چھ وار کیے، ایک زیر ناف لگا جو مہلک ثابت ہوا۔ جمعرات 27 ذی الحجہ (ایک قول) کی صبح آپؓ کو نبی ﷺ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے چھ سال چھوٹے تھے۔ عام الفیل کے چھ برس بعد 576ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپؓ کا نام عثمان، کنیت ابو عبد اللہ اور ابو عمرو تھی۔ والد کا نام عفان تھا۔ قریش کی شاخ بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پانچویں پشت عبد مناف پر ان کا نسب نبی ﷺ کے شجرے سے جا ملتا ہے۔ آپؓ نے زمانہ جاہلیت ہی میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ بڑے نیک فطرت تھے۔ جاہلیت کی کسی برائی سے دامن آلودہ نہ ہوا۔ آپؓ کا پیشہ تجارت تھا۔ آپؓ پہلے اسلام قبول کرنے والے لوگوں میں شامل ہیں۔ آپؓ ایک خدا ترس اور غنی انسان تھے۔ آپؓ فراخ دلی سے اللہ کی راہ میں دولت خرچ کرتے، اسی بنا پر حضور اکرم ﷺ نے آپؓ کو غنی کا خطاب دیا۔ مسلمانوں نے جب پہلی ہجرت حبشہ کی تو اس میں آپؓ بھی شامل تھے۔ آپؓ کو ذوالنورین (دو نوروں والا) اس لیے کہا جاتا ہے کہ نبی ﷺ کی دو صاحب زادیاں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ آپؓ کے عقد نکاح میں آئیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ انھیں ملاء اعلیٰ میں بھی ذوالنورین پکارا جاتا ہے۔ یہ وہ واحد اعزاز ہے جو کسی اور حاصل نہ ہو سکا۔

اسلام کے تیسرے خلیفہ، دامادِ رسول اور جامع قرآن تھے۔ عثمان غنی سابقین اسلام میں شامل اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے، عثمان غنیؓ پہلے صحابی ہیں جنھوں نے سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کی، بعد میں دیگر صحابہ بھی آپ کے پیچھے حبشہ پہنچے۔ بعد ازاں دوسری ہجرت مدینہ منورہ کی جانب کی۔ رسول اکرم ﷺ عثمان غنی پر مکمل اعتماد اور ان کی فطری حیاء و شرافت اور جو انھوں نے اپنے مال کے ذریعہ اہل ایمان کی نصرت کی تھی، اس کی انتہائی قدر کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے دیگر صحابہ کے ساتھ ان کو بھی جنت اور شہادت کی موت کی خوش خبری دی۔

خلافت

(سنہ 23 ھ 644) ء) میں عمر بن خطاب کی شہادت کے بعد مشورہ سے آپ کو خلافت کی ذمہ داری سونپی گئی، جسے انھوں نے 644 ء سے 656 ء تک انجام دی۔ خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ تندرست تھے کہ کچھ اہل ایمان نے انھیں اپنا جانشین مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے کچھ غور و فکر کے بعد انھیں اندیشہ ہوا کہ اگر اہل ایمان کی رہنمائی نہ کی گئی تو وہ اختلاف میں مبتلا ہو جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے کسی فرد کو نامزد کرنے کی بجائے عشرہ مبشرہ (وہ صحابی جن کو دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی گئی تھی) میں سے چھ صحابہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زبیر بن العوام، حضرت طلحہ بن عبید، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبد الرحمان بن عوف کی مجلس بنانا پسند کی اور فرمایا کہ تم باہمی رضامندی اور آپس میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لو۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت عثمانؓ کا بطور خلیفہ کے انتخاب عمل میں آیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسلام کے تیسرے خلیفہ راشد تھے۔ آپؓ نے بارہ سال خلافت کی ذمہ داریاں انجام دیں۔ آپ کے دور خلافت میں ایران اور شمالی افریقہ کا بہت سا علاقہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوا۔ آپؓ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے لوگوں کے وظائف بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے عہد خلافت میں جمع قرآن مکمل ہوا، مسجدِ حرام اور مسجد نبوی کی توسیع ہوئی اور قفقاز، خراسان، کرمان، سیستان، افریقہ اور قبرص فتح ہو کر سلطنت اسلامی میں شامل ہوئے۔ نیز انھوں نے اسلامی ممالک کے ساحلوں کو بیزنطینیوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اولین مسلم بحری فوج بھی بنائی۔

شہادت

اسلام کے دشمنوں خاص کر مسلمان نما منافقوں کو خلافت راشدہ ایک نظر نہ بھاتی تھی۔ یہ منافق رسول اللہ ﷺ سے بھی دنیوی بادشاہوں کی طرح یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ بھی اپنا کوئی ولی عہد مقرر کریں گے۔ ان منافقوں کی ناپاک خواہش پر اس وقت کاری ضرب لگی جب امت نے حضرت ابو بکرؓ کو اسلام کا پہلا متفقہ خلیفہ بنالیا۔ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت راشدہ کے بعد امت نے کامل اتفاق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ اسلام چن لیا۔ حضرت عمرؓ کے بعد آپؓ کا خلافت کا منصب سنبھالنا بھی ان منافقوں کے لئے جان لیوا صدمے سے کم نہ تھا۔ انھوں نے آپؓ کی نرم دلی کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور آپؓ کو شہید کرنے کی ناپاک سازش کی اور ایسے وقت میں کاشانہ خلافت کا محاصرہ کیا جب اکثر صحابہ کرامؓ حج کے لیے مکہ گئے ہوئے تھے۔ آپؓ نے اپنی جان کی خاطر کسی مسلمان کو مزاحمت کرنے کی اجازت نہ دی۔ اور چالیس روز تک بند رہے۔ 18 ذوالحج کو باغی آپؓ کے گھر میں داخل ہو گئے اور آپؓ کو اس وقت شہید کر دیا جب آپؓ قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے۔ اس دلخراش سانحہ میں آپؓ کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا کی انگلیاں مبارک بھی شہید ہو گئیں۔ سنہ 35 ھ، 18 ذی الحجہ، بروز جمعہ بیاسی سال کی عمر میں انھیں ان کے گھر میں قرآن کریم کی تلاوت کے دوران شہید کر دیا گیا اور مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ بن ابی طالب فاطمہ بنت اسد کے بطن سے ایک روایت کے مطابق اندرون خانہ کعبہ چھٹی صدی عیسوی میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی میں بعض وجوہ کی بنا پر حضور ﷺ کی کفالت میں آ گئے اور دربارِ نبوت سے آخر تک جڑے رہے۔ دس سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بتوں کی پوجا کبھی نہیں کی اور آنحضرت ﷺ کے بعد مجھ سے پہلے کسی نے خدا کی عبادت نہیں کی۔ ابتدائی عمر سے ہی حضور ﷺ سے از حد زیادہ محبت کرتے تھے۔ جب کوہِ صفا پر چڑھ کر حضور ﷺ نے اعلان نبوت کیا تو آپکی آواز پر کسی نے بھی کان نہیں دھرا، مگر حضرت علیؓ جو اس وقت عمر میں صرف ۱۵/ سال کے تھے یا اس سے بھی کم عمر کے تھے، کہا: ”گو کہ میں عمر میں چھوٹا ہوں اور مجھے آشوبِ چشم کا عارضہ ہے، اور میری ٹانگیں پتلی ہیں، تاہم آپ ﷺ کا باور دست و بازو بنوں گا۔ جس وقت آپ کی عمر ۲۲ سال کی تھی آپؓ اپنی جان کی بازی لگا کر حضور ﷺ کے بستر پر پوری رات لیٹے رہے اور حضور ﷺ ہجرت کے لیے نکل گئے۔ اس کے تین دن بعد خود بھی حضور ﷺ سے جا ملے۔ مدینہ

پہنچنے کے بعد جب نبی ﷺ کا جو مظاہرہ کیا اور جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ آپؓ کی زندگی کا اہم باب ہے۔ سوائے ایک جنگ کے آپؓ نے ہر جنگ میں شرکت کی اور دادِ شجاعت دیا۔ غزوہ تبوک کے موقع پر حضور ﷺ نے آپؓ کو جنگ میں شرکت سے روک دیا اور اہلِ بیت کی حفاظت و نگرانی کے لیے مدینہ ہی میں رہنے کا حکم دیا تو اس کا آپؓ کو بہت قلق ہوا، مگر حضور ﷺ نے یہ کہہ کر ان کے اعزاز کو بلند کیا کہ "علیؓ تم اسے پسند نہیں کرتے کہ میرے نزدیک تمہارا وہ مقام اور درجہ ہو جو ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک تھا۔" حضرت علیؓ کی اہمیت حضور ﷺ کے نزدیک کتنی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ بالعموم اہم اور مشکل ترین امور کی انجام دہی کے لیے حضرت علیؓ کو مامور فرماتے۔ جب تک حضور ﷺ زندہ رہے، دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر لحاظ سے حضور کی فرماں برداری اور اطاعت کرتے رہے۔ اسی جاں نثاری کو دیکھ کر حضور نے غدیر خم کے خطبہ میں فرمایا کہ: جو علی کا دشمن ہے وہ میرا بھی دشمن ہے اور جو علی کا دوست ہے وہ میرا بھی دوست ہے۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد خلیفہ سوم کے زمانے تک میں بھی اہم کارنامے اور خدمات انجام دیں اور جنگی معرکے سر کیے۔ اور جب خود خلیفہ بنے تو باوجود پورے ملک میں بدامنی اور خلفشاری کے حالات پر قابو پائے، مگر دشمنوں نے آپؓ کو زیادہ دن حکومت کرنے نہیں دیا اور آپؓ کو قتل کر دیا۔ آپؓ کا انتقال ۴۰ھ میں ہوا۔ کل ۴/ سال نو مہینے حکومت کر سکے۔

نبی ﷺ کے اخلاق کا اثر

حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ آپ خلقِ خدا کو ادب و احترام اور اخلاقی اقدار و تہذیب کی تعلیم دیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خود ہی فرمایا: "**انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق**" (میں اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں) اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس خوبی کو قرآن کریم میں اس انداز میں بیان کیا ہے: "**وانک لعلی خلق عظیم**" (اے نبی! آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں) جب حضور ﷺ اس دارِ فانی سے رخصت فرما گئے، تو کچھ لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ معلوم کرنا چاہا کہ آپ ﷺ کا اخلاق کیسا تھا، تو انھوں نے جواب دیا: "کان خلقہ القرآن" یعنی جو کچھ قرآن میں بیان کیا گیا ہے وہی آپ ﷺ کا اخلاق تھا۔

اسی پس منظر میں حضرت علی کرم اللہ وجہ کے اخلاق و کردار اور ان کی تعلیمات کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔ چوں کہ آپؓ درِ رسالت سے ابتدائی عمر سے آخر تک جڑے رہے، اس لیے ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے جو طرزِ عمل اور اخلاق و کردار حضور ﷺ کا تھا، اسی کو حضرت علیؓ نے اپنی زندگی میں نافذ کیا۔ چنانچہ علامہ سید ابوالحسن ندویؒ اس نکتہ پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

''رسول اللہ ﷺ سے خاندانی اور نسبی تعلق، ایک عمر کی رفاقت اور روزمرہ کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کی وجہ سے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو آپ ﷺ کے مزاج افتادِ طبع سے اور ذاتِ نبوی کی خاص صفات و کمالات سے گہری مناسبت ہو گئی تھی، جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی برحق ﷺ کو نوازا تھا، وہ آپ ﷺ کے میلانِ طبع اور مزاج کے رخ کو بہت باریک بینی اور چھوٹی بڑی باتوں کی نزاکتوں کو سمجھتے تھے، جن کا آپؓ کے رجحان پر اثر پڑتا ہے، یہی نہیں بلکہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو ان کے بیان کرنے اور ایک ایک گوشہ کو اجاگر کر کے بتانے میں مہارت تھی، آپؓ نے رسول ﷺ کے اخلاق و رجحان اور طریق تامّل کو بہت ہی بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے''۔

اخلاقِ فاضلانہ کی اعلیٰ مثال

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اخلاق اور ان کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے وقت ان عوامل کو بھی اذہان و قلوب میں مستحضر کرنا چاہئے کہ جن کی وجہ سے آپؓ اپنے اصحاب میں ممتاز و منفرد نظر آتے ہیں۔ باوجود خانگی ذمہ داریوں کے حُب نبی ﷺ میں سرشار اور حضور ﷺ کی راحت رسانی کے لیے ہر وقت بے چین اور مضطرب نظر آتے ہیں۔ اپنے گھر فاقہ ہے مگر حضور ﷺ کو اس حالت میں دیکھنا ایک پل کے لیے گوارہ نہیں۔ یہاں تک کہ محنت و مشقت اور مزدوری کر کے حضور ﷺ کی راحت رسانی کا انتظام فرماتے۔ ابن عساکر کی روایت ہے:۔

''ایک روز رسول اللہ ﷺ کے گھر میں فاقہ تھا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو معلوم ہوا تو وہ مزدوری کی تلاش میں نکل گئے، تاکہ اتنی مزدوری مل جائے کہ رسول خدا ﷺ کی ضرورت پوری ہو جائے۔ اس تلاش میں ایک یہودی کے باغ میں پہنچے اور اس کے باغ کی سینچائی کا کام اپنے ذمہ لیا، مزدوری یہ تھی کہ ایک ڈول پانی کھینچنے کی اجرت ایک کھجور، حضرت علیؓ نے سترہ ڈول کھینچے۔ یہودی نے انہیں اختیار دیا کہ جس نوع کی کھجور چاہیں لے لیں، حضرت علیؓ نے سترہ عجوہ لیے اور رسول خدا ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ فرمایا: یہ کہاں سے لائے؟، عرض کیا: یا نبی اللہ مجھے معلوم ہوا ہے

کہ آج گھر میں فاقہ ہے اس لیے مزدوری کے لیے نکل گیا تا کہ کچھ کھانے کا سامان کر سکوں۔ رسول ﷺ نے فرمایا: تم کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت نے اس پر آمادہ کیا تھا۔ عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! رسول ﷺ نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرنے والا ایسا کوئی نہیں جس پر افلاس اس تیزی سے آیا ہو جیسے سیلاب کا پانی اپنے رخ پر تیزی سے بہتا ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرے اس کو چاہیے کہ مصائب کے روک کیلئے ایک چھتری بنالے، یعنی حفاظت کا سامان کر لے"۔

اندرونِ خانہ اخلاق و کردار کا مظاہرہ

ازدواجی زندگی میں شوہر اور بیوی کی مثال گاڑی کے اس پہیے کی طرح ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو تھوڑی دیر کے لیے اسے گھسیٹا تو جا سکتا ہے مگر چلایا نہیں جا سکتا۔ ازدواجی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہوں اور دونوں ایک دوسرے کی ضروریات و حقوق کا پاس کرتے ہوں۔ تب ہی دونوں کی زندگی آرام و سکون سے بسر ہو سکتی ہے۔ آج کے معاشرہ پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں کتنی بے چینی اور خلفشاری ہے، بالخصوص موڈرن طبقہ میں تو دونوں ایک دوسرے کو کسی خاطر میں نہیں لاتے اور مغرب میں تو یہ چیز فیشن بن گئی ہے، جس کے نتیجہ میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ حضرت علیؓ کے اخلاق و کردار کا مطالعہ کریں اور اس پر عمل کریں، جو مشعل راہ ہیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ باوجود غربت و افلاس کے اپنی زوجہ محترمہ خاتونِ جنت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی راحت رسانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، خود بھوکے رہ جاتے مگر اپنی اہلیہ کے خورد و نوش کا انتظام فرماتے۔ یہاں تک ان کی راحت رسانی کے لیے اپنے دونوں بیٹے حضرت حسن اور حسین کو بھی ان سے دن بھر کے لیے جدا کر دیتے تا کہ بچے کی محبت سے ماں کی ممتا متاثر نہ ہو سکے۔ طبرانی کی روایت ہے:۔

"حضرت فاطمہ نے بتایا کہ ایک روز رسول خدا ﷺ ان کے گھر آئے اور فرمایا میرے بچے کہاں ہیں؟ (یعنی حسنؓ اور حسینؓ) فاطمہ نے کہا: آج ہم لوگ صبح اٹھے تو گھر میں ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جس کو کوئی چکھ سکے۔ ان کے والد نے کہا: میں ان دونوں کو لیکر باہر جاتا ہوں اگر گھر پر رہیں گے تو تمہارے سامنے روئیں گے اور تمہارے پاس کچھ ہے نہیں کہ کھلا کر خاموش کرو۔ چنانچہ وہ فلاں یہودی کی طرف گئے ہیں۔ رسول ﷺ وہاں تشریف

لے گئے، دیکھا یہ دونوں بچے ایک صراحی سے کھیل رہے ہیں اور ان کے سامنے بچا کھچا ادھ کٹا قسم کا کھجور ہے۔ رسول ﷺ نے فرمایا: علیؓ اب بچوں کو گھر لے چلو، دھوپ بڑھ رہی ہے۔ انھوں نے کہا: یا رسول اللہ آج صبح سے گھر میں ایک دانہ نہیں ہے، تو اگر آپ تھوڑی دیر تشریف رکھیں تو میں فاطمہ کے لیے کچھ بچے کھچے کھجور جمع کر لوں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ بیٹھ گئے، یہاں تک کہ فاطمہ کے لیے کچھ بچے کھچے کھجور جمع ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے کھجور ایک کپڑے میں باندھ لیے"۔

بڑے اور چھوٹے کا دائرہ کار

ایک صالح معاشرہ کی تشکیل میں بڑے اور چھوٹے کا ادب و احترام اور شفقت و ہمدردی از حد ضروری ہے۔ ایک باپ کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے بچوں کے ساتھ ہی اچھا برتاؤ کرے اور ان کے ساتھ شفقت و ہمدردی سے پیش آئے اس کی دلجوئی اور اس کے کھیل کود، سیر و تفریح کے مواقع بھی فراہم کرے بلکہ سماج کے اور دوسرے بچوں کے بھی اس کے دل میں محبت و ہمدردی ہونی چاہیے۔ اور اس کے برعکس چھوٹوں کو چاہیے کہ وہ ادب و احترام کا مظاہرہ کریں۔ دراصل ایک گونہ ذمہ داری بڑوں کی ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں کی زندگی بنانے اور سنوارنے پر متوجہ ہوں۔ اس کو اچھی تعلیم دیں اور اس کی عمدہ سے عمدہ تربیت کریں لغویات سے بچائے رکھیں اور یہ تمام خوبیاں جو سراسر اخلاق پر مبنی ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں بدرجہ اتم موجود تھی، جس طرح حضور اکرم ﷺ بچوں کے حق میں بہت شفیق تھے، ان سے ہنسی کھیل کرتے، اور ان کی دل جوئی کرتے، ٹھیک یہی طرزِ عمل آپ ﷺ کا تھا۔ اور ایسے لوگوں کو پسند کرتے جو بچوں کی دلجوئی اور دل بستگی کی باتیں کرتے تھے، اور ان کے سامنے وہی بات اور کام کرتے جس کا مثبت اثر بچوں کی ذات پر پڑے۔ یہاں تک کہ اپنے اقوالِ حکیمانہ سے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے:۔

"باپ کا بیٹے پر اور بیٹے کا باپ پر حق ہے۔ باپ کا حق یہ ہے کہ بیٹا ہر حال میں اس کی اطاعت کرے، الا یہ کہ باپ کسی معصیت کی بات کا حکم دے، اس میں اس کا اتباع نہ کیا جائے، اور باپ پر بیٹے کا یہ حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے، اچھی تربیت کرے اور قرآن پڑھائے"۔

آج ہمارے معاشرہ میں باپ اور بیٹے دونوں کو ایک دوسرے سے شکایت ہے اور دونوں ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں اور بعضے وقت صورتِ حال بہت خراب ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم نے اس اخلاقی تعلیمات کو سرے سے بھلا رکھا ہے۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور باغبان درخت کو بنانے اور سنورانے میں کتنی محنت اور جاں فشانی کرتا ہے ہم اور آپ سبھی جانتے ہیں۔

حقوق النسا:۔

عصر حاضر میں یہ پروپیگنڈہ بڑے پیمانے پر پھیلایا جارہا ہے اور خاص کر مغربی ذہن رکھنے والے حضرات کہتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں کو کسی قسم کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، اسلام نے عورتوں کے ساتھ سختی کرنے اور انہیں ستانے کا حکم دیا ہے۔ ہم اس سلسلے میں تفصیل میں نہ جاکر صرف یہ کہتے ہیں کہ دنیا کے جتنے بھی مذاہب ہیں اور اس میں عورتوں کو جس قدر حقوق اور آزادی حاصل ہے وہ اسلام کا رہین منت ہے، اگر اسلام نہ آتا تو آج بھی عورت ذلیل وخوار ہی رہتی اور مغرب نے عورت کو جو آزادی دے رکھی ہے اس سے کہاں اس کی تحسین ہوتی ہے بلکہ تحقیر ہوتی ہے۔ اسلام نے ہر حال میں عورتوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ جنگ ہو یا امن کی حالت میں، گھر میں ہو یا کسی دینی محفل میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جس کے شواہد قرآن وحدیث میں موجود و محفوظ ہیں۔ یہاں تک کہ ''نہج البلاغہ'' جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعلیمات اور خطبات کا مجموعہ ہے اس میں بھی کئی مقامات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بلکہ حضرت علیؓ نے جنگ صفین کے موقع پر اپنے لشکروں کو رموز جنگ وحرب بتائے اس میں بھی اس بات پر زور دیا کہ ہر حال میں عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔ آپ نے فرمایا:۔

''لڑائی میں تم پہل نہ کرو، دشمن کو پہل کرنے دو، اس لیے کہ تم بحمد اللہ حق وحمایت پر استوار ہو، ان کے حملے سے پہلے تمہارا حملہ نہ کرنا ان پر تمہاری طرف سے ایک اور حجت ہو جائے گا، اگر بحکم خدا دشمن کو شکست ہو تو نہ بھاگنے والے کو قتل کرنا، نہ ہتھیار ڈال دینے والے کو، نہ کسی زخمی کو مارنا، نہ کسی عورت کو ستانا اگرچہ وہ تمہیں گالیاں دیں اور تمہارے افسروں کو کوسیں، عورتیں کمزور ہوتی ہیں اپنے جسم میں بھی نفس میں بھی۔ ہمیں عورتوں سے تعرض نہ کرنے کا حکم دیا جاتا تھا، حالانکہ وہ مشرکین تھیں۔ جاہلیت میں بھی اگر کوئی آدمی عورت کو پتھر یا لاٹھی سے مار دیتا تھا تو خود بھی رسوا ہو جاتا تھا اور اس کی نسلوں کو بھی نام دھرا جاتا تھا''۔

احترامِ مسلم

آپ نے زمانہ حکومت سنبھالتے ہی اس بات پر زور دیا کہ ہر حال میں مسلمانوں کا احترام کیا جائے اور ان کے خون کا ضیاع نہ ہو۔ حالانکہ جس خلفشاری اور بے چینی کے عالم میں آپ مسندِ خلافت پر آراستہ ہوئے اس کا تقاضا تھا کہ ہر طرف جنگ وجدال کا بازار گرم ہو جائے، مگر آپ نے بڑے ہی دور اندیشی اور خیر اندیشی سے کام لیکر حالات پر کسی حد تک قابو پایا اور اخلاق و کردار کا جو مظاہرہ آپ نے اس حالت میں کیا وہ سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ آپ نے اپنے ابتدائی خطبہ میں جمعہ کے دن منبر پر چڑھ کر لوگوں کو خطاب کیا اس میں اخلاقی قدروں کی جلوہ نمائی ہے جو دل کی زبانی ہے۔ فرمایا:۔

''اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کو ہادی بنا کر بھیجا ہے، جو خیر و شر کو وضاحت کے ساتھ بتاتی ہے، لہٰذا خیر کو اختیار کیجئے اور شر سے کنارہ کش رہیے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزوں کو حرمت کا درجہ دیا ہے، ان میں سب سے فائق حرمتِ مسلمان کی ہے۔ توحید و اخلاص کے ذریعہ مسلمانوں کے حقوق کو اللہ نے مضبوطی سے مربوط کر دیا ہے۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے تمام مسلمان محفوظ رہیں، الا یہ کہ دین و احکام شریعت ہی کا تقاضا ہو کہ مسلمان کا احتساب کیا جائے اور اس پر قانونِ شرعی جاری کیا جائے''کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو ایذا پہنچائے، الا یہ کہ ایسا کرنا واجب ہو، عوام و خواص دونوں کے حقوق ادا کرنے میں عجلت سے کام لیجیے، لوگ آپ کے سامنے ہیں اور پیچھے قیامت ہے جو آگے بڑھ رہی ہے، اپنے آپ کو ہلکا پھلکا رکھیے کہ منزل تک پہنچ سکیں، آخرت کی زندگی لوگوں کی منتظر ہے، خدا کے بندوں اور ان کی سرزمین کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں اللہ سے ڈرتے رہیے، بہائم اور زمین کے بارے میں بھی (قیامت میں) آپ سے سوال ہو گا، پھر میں کہتا ہوں کہ اللہ کی اطاعت کیجیے اور اس کی معصیت و نافرمانی سے بچیئے، اگر آپ خیر کا کام دیکھیں اس کو اختیار کریں اور اگر شر دیکھیں تو اس کو چھوڑ دیں:۔

''وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ'' (اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے مغلوب پڑے ہوئے ملک میں ڈرتے کہ اچک لیں تم کو لوگ پھر اس نے تم کو ٹھکانا دیا اور قوت دی تم کو اپنی مدد سے اور روزی دی تم کو ستھری چیزیں تا کہ تم شکر کرو) (سورۃ الانفال)۔

ارکانِ سلطنت کی حکم عدولی

حضرت علیؓ نے ارکانِ سلطنت اور رعایا کی ان کمزوریوں اور حکم عدولیوں کا بھی احتساب کیا ہے جو اولی الامر کی آواز پر کان نہیں دھرتے اور مسلسل حکم عدولی کے مرتکب ہوتے ہیں جس سے سلطنت کے نظام میں خلل واقع ہوتا ہے۔ مگر آپ یہاں بھی اخلاقی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہیں اور مشیرانِ سلطنت کو بڑے ہی لطیف پیرائے میں نصیحت کرتے ہیں کہ ان کے اعمال وافعال سے سلطنت کے لیے مسائل ومشکلات پیدا ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی حکومت میں جو خلفشار پیدا ہوا وہ آپ کا حد سے زیادہ امرا اور ارکان سلطنت کے ساتھ نرمی وملاطفت کا معاملہ رہا۔ اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو ہمیشہ معاف اور نظر انداز کرتے رہے، مگر آپ نے اسے بھی اپنے لیے ایک آزمائش ہی سمجھا۔ آپ نے ایک موقع پر فرمایا:۔

''میری ان لوگوں کے ذریعہ آزمائش ہو رہی ہے جو اطاعت نہیں کرتے؛ جب انہیں حکم دیتا ہوں اور جواب نہیں دیتے جب پکارتا ہوں، تمہارا باپ مر جائے تمہیں اپنے پروردگار کی مدد کرنے میں کس بات کا انتظار ہے؟ کیا دین تمہیں اکٹھا نہیں کرتا اور کیا حمیت تمہیں نہیں کھینچتی؟ میں تمہارے اندر کھڑے ہو کر پکارتا ہوں اور تمہیں مدد کے لیے بلاتا ہوں مگر تم میری بات نہیں سنتے اور نہ میرا حکم مانتے ہو''۔

دنیا سے بے رغبتی

آپ کی زندگی کا یہ پہلو بھی بڑا ہی تابناک ہے کہ ان کے اندر دنیا سے بے رغبتی اور خشیت الٰہی کی موجیں ہر وقت ٹھاٹھیں مارتی رہتی تھی۔ انھوں نے پوری زندگی اس سادگی سے گزاری اور بسر کی کہ دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا تھا۔ آپ کی سادگی، نفس کشی اور دنیا سے بے رغبتی کا اندازہ کرنے کے لیے زید بن وہب کی مندرجہ ذیل روایت ملاحظہ فرمائیں، وہ کہتے ہیں:۔

''ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے اس حال میں نکلے کہ ایک تہہ بند باندھے ہوئے تھے اور ایک چادر سے جسم ڈھکے ہوئے تھے، تہ بند کو کپڑے کے ایک چیتھڑے سے (کمر بند کی جگہ) باندھ رکھا تھا، ان سے کہا گیا آپ اس لباس میں کس طرح رہتے ہیں، تو فرمایا: یہ لباس اس لیے پسند کرتا ہوں کہ یہ نمائش سے بہت دور اور نماز میں عافیت دہ ہے اور مومن کی سنت ہے''۔

ایک دوسری روایت میں ہے جسے ابو عبیدہ نے عنترہ سے سنا ہے:۔

''میں خورنق میں علیؓ ابن ابی طالب کے پاس گیا، وہ ایک چادر اوڑھے ہوئے سردی سے کانپ رہے تھے، میں نے کہا امیر المومنین! اللہ نے آپؓ اور آپؓ کے افراد خانہ کے لیے اس مال میں حصہ رکھا ہے اور آپؓ سردی سے کانپ رہے ہیں۔ فرمایا: میں تمہارے مال میں سے کچھ نہیں لیتا، میری یہی چادر ہے جس کو میں اپنے گھر سے لیکر نکلا تھا''۔

بیت المال کی رقم سے احتراز

دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے کہ حاکمِ وقت اپنی ذات پر اور اہل وعیال پر کس قدر بے جا روپیہ خرچ کرتے ہیں اور اپنی رعیت کا بالکل ہی خیال نہیں کرتے اور گویا کہ پوری زندگی عیش کوشی اور لہو ولعب میں بسر ہوتی ہے۔ بس آخری کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح اعلیٰ منصب کو حاصل کیا جائے اور جب اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو خوفِ خدا ان کے دل سے نکل جاتا اور وہ ہر طرح کے اخلاقی جرائم اور گناہ میں ملوث ہو جاتے۔ ایسے افراد کے لیے یہ کہا جائے کہ وہ حضرت علیؓ کا اخلاق و کردار اپنے اندر نافذ کریں اور ان کے طریقہ حکومت پر عمل کریں۔ حضرت علیؓ نے اپنے پورے دورِ خلافت میں ایک حبہ بھی بیت المال کا اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا، بلکہ بعض لوگوں نے ان کو ہدایا دیئے اسے بھی خلقِ خدا کی امانت سمجھ کر بیت المال میں جمع کر دیا۔ آپ نے بیت المال کی رقم کی اس طرح حفاظت کی کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کو ایک صاحب نے ہدیہ دیا اور وہ ہدیہ کیا تھا وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں مگر اس کو بھی بیت المال میں پہنچا دیا۔ آپؓ نے ایک خطبہ میں صراحت کی ہے:۔

''لوگو! اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے تمہارے مال سے نہ تھوڑا لیا، نہ بہت سوائے اس شے کے اور جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر دکھائی، جس میں عطر یا کوئی خوشبو تھی'' حضرت علیؓ نے کہا مجھے ایک دہقان نے یہ ہدیہ دیا ہے۔ پھر وہ بیت المال تشریف لے گئے اور کہا یہ لو۔ (وہ شیشی بیت المال میں جمع کر دی) اور یہ شعر پڑھنے لگے:۔

''افلح من کانت لہ قوصرة یأکل منہا کل یوم تمرة''

علیؓ قاضی شریح کی عدالت میں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زرہ اسی جنگ میں گم ہو گئی اور اسے ایک یہودی کے ہاتھ میں دیکھی گئی، یہاں تک کہ یہ معاملہ قاضی شریح کی عدالت میں پہنچا، قاضی نے امیر المومنین سے گواہ طلب کیا، علیؓ نے حضرت حسن اور غلام قنبر کو گواہی کے لیے پیش کیا مگر قاضی نے دونوں کی گواہی کو رد کرتے ہوئے فیصلہ یہودی کے حق میں کر دیا۔

اس واقعہ سے جو درس ملتا ہے وہ اسلامی تعلیم کا شاہکار ہے جو حضرت علیؓ کے ذریعہ ظہور ہوا۔ وہ خود قاضی کے پاس آئے اور ان کے فیصلہ پر عمل کیا جو اخلاق و کردار کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس سے متاثر ہو کر یہودی نے نہ صرف زرہ واپس کر دی بلکہ کلمہ شہادت پڑھ کر حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا، مگر پھر حضرت علیؓ نے زرہ اسے واپس کر دی اور یہ شخص ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا اور صفین کے موقع پر شہید ہوا۔

اشاعتِ دین میں اخلاقی تعلیمات کی جلوہ گری

حضرت علیؓ شیر خدا خلیفۃ المسلمین ہیں، رعایا کی خبر گیری اور ان کی راحت رسانی میں ہمہ وقت مصروف ہیں، مگر ان کا دل ہر وقت اس کے لیے مضطرب ہے کہ کسی طرح سے ''**ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ** اور **کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنہون عن المنکر وتؤمنون باللہ**'' کی تعلیمات پر عمل ہو سکے۔ آپ نے اس فریضہ کی انجام دہی میں تلوار اور قتل و خوں ریزی کو جائز و بہتر نہیں سمجھا بلکہ آپ نے اپنے اخلاق اور مواعظ حسنہ کو ہی اولیت کا مقام دیا، جس کے اچھے نتائج بر آمد ہوئے۔ آپ کے اس عمل کی وضاحت کرتے ہوئے علی میاں ندوی لکھتے ہیں:۔

''حضرت علیؓ کوئی انتظامی امور کے حاکم اعلیٰ یا اس طرح کے عرفی خلیفہ نہیں تھے، جیسے اموی و عباسی خلیفہ تھے، بلکہ وہ شیخین (حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) کے انداز و نہج کے خلیفۃ المسلمین تھے۔ مسلمانوں کے حقیقی معنوں میں ولی الامر، معلم، مربی اور عملی مثال قائم کرنے والے اخلاقی و دینی امور کی نگرانی اور احتساب کرنے والے تھے، لوگوں کے رجحانات و خیالات و تصرفات پر نظر رکھتے کہ وہ کس حد تک اسلامی تعلیمات اور رسول

اللہ ﷺ کے اسوہ کے مطابق ہیں، اور کہاں تک اس اسوہ سے دور اور منحرف اور کس حد تک انھوں نے مغلوب اقوام اور مفتوحہ علاقوں کی تہذیب و تمدن کا اثر قبول کیا ہے، آپؓ لوگوں کو نماز پڑھاتے۔ ان کو نصیحتیں فرماتے، دین کے مسائل بتاتے اور دین کا فہم ان کے اندر پیدا کرتے۔ ان کو بتاتے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے کیا چاہتا ہے، اور کن باتوں کو پسند فرماتا ہے۔ آپ مسجد میں بیٹھتے، لوگ آپؓ کے پاس آیا کرتے، اپنے معاملات میں مشورہ لیتے، کوئی دینی مسئلہ پوچھتا تو اس کو بتاتے، دنیاوی امور میں صلاح و مشورہ دیتے، بازاروں میں چلتے پھرتے کاروباری لوگوں کی نگرانی کرتے کہ کس طرح خرید و فروخت کرتے ہیں، انکو نصیحت فرماتے اور کہتے: ''اللہ سے ڈرو اور ناپ تول کا پورا لحاظ رکھو، لوگوں کا حق نہ مارو''۔

قاتل کے ساتھ اخلاقِ عالیہ کا مظاہرہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ دشمن کے زد سے محفوظ نہ رہ سکے، یہاں تک کہ ابن ملجم نے زہر پلائی ہوئی تلوار سے آپ پر ایسی ضرب لگائی کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ مگر مرنے سے قبل ہی ملجم کو گرفتار کر لیا گیا، اور آپ کے سامنے حاضر کیا گیا، اس کی شکل و صورت کو دیکھتے ہی آپ نے حکم دیا کہ مقتول سے پہلے قاتل کی پیاس بجھائی جائے۔ اس جملے میں کتنی معنویت اور اخلاقی تعلیمات مضمر ہیں۔ یعنی کہ آپ کو بھی پیاس کی شدت تڑپا رہی ہے مگر حکم دیتے ہیں کہ پہلے میرے قاتل کی پیاس بجھائی جائے، آپ کے اس اخلاق سے ملجم بہت شرمندہ ہوا، اس کے بعد ابن ملجم کے حق میں اپنے بیٹے کو وصیت کی وہ حضرت علیؓ کے اخلاق کی اعلیٰ سے اعلیٰ مثال ہے اور یہ صرف ان ہی کے لیے زیب دیتا ہے کہ آپ اپنے فرزند کو وصیت کرتے ہیں:۔

''اے عبد المطلب کے فرزندو! مسلمانوں کا بے تکلف خون نہ بہانا، تم کہو گے کہ امیر المومنین قتل کر دیئے گئے، مگر خبردار سوائے میرے قاتل کے کسی کو قتل نہ کرنا، دیکھو اگر میں اس وار سے مر جاتا ہوں تو اس پر بھی ایک ہی وار کرنا، اس کا مثلہ نہ کرنا، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے: خبردار کسی ذی روح کو مار کر اس کا مثلہ نہ کیا جائے خواہ وہ کٹہا کتا ہی کیوں نہ ہو''۔

بلکہ آپ نے اس بات پر بھی زور دیا:۔

''اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائے، اگر زندہ رہا تو سوچوں گا، معاف کروں یا قصاص لوں اور اگر مر جاؤں تو ایک جان کا بدلہ ایک ہی جان لیا جائے، اس کا مثلہ ہرگز نہ کیا جائے''۔

حضرت علیؓ کے اخلاق و کردار کے مختلف پہلو اور اس کا اثر

اس سے پہلے کہ ہم نہج البلاغہ کے اقتباس کی روشنی میں حضرت علی کے افعال و کردار اور ان کے اعلیٰ اخلاقی اقدار کو پیش کریں، ضروری ہے کہ حضرت علیؓ کے معاصر ضرار بن مضمر نے حضرت ابو سفیانؓ کے اصرار پر مندرجہ ذیل تاثر بیان کیا اور ان کے انتقال کو مسلمانوں کے لیے ایک خطرہ قرار دیا اور ان کی حیات مسلمانوں کے لیے نعمت عظمیٰ بتاتے ہوئے ان کے اخلاق و کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے بیان کیا:۔

''ان کی نظر انتہائی دور رس تھی، ان کے قویٰ انتہائی مضبوط تھے، بات دوٹوک اور صاف کہتے اور فیصلے پورے عدل و انصاف کے ساتھ کرتے، ان کی شخصیت سے علم کے چشمے ابلتے تھے، دنیا اور دنیا کی دل آویزیوں سے متوحش رہتے، رات اور اس کی تاریکی سے دل لگاتے تھے، خدا گواہ ہے کہ (راتوں کو عبادت میں) ان کے آنسو تھمتے نہ تھے، دیر دیر تک فکر مند اور سوچتے رہتے، اپنے کفِ دست کو الٹتے پلٹتے اور اپنے آپ باتیں کرتے، موٹا جوڑا پہنتے، روکا سوکھا کھاتے، بخدا بالکل اپنے ہی ساتھیوں اور بے تکلف لوگوں کی طرح رہتے، جب کچھ پوچھا جاتا جواب دیتے، جب ان کے پاس جاتے تو خود بڑھ کر باتیں شروع کرتے، جب بلاتے تو حسبِ وعدہ آجاتے، لیکن ہم لوگوں کو (باوجود اس قربت اور رفاقت اور ان کی سادگی کے ان کا رعب ایسا تھا کہ) ان کے سامنے بولنے کی ہمت نہ ہوتی اور نہ کوئی گفتگو چھیڑتے، اگر وہ مسکراتے تو آپ کے دندان ایسے نظر آتے جیسے سفید موتیوں کی لڑی ہو، دینداروں کی توقیر کرتے، مساکین سے محبت کرتے کسی طاقتور انسان کی یہ جراءت نہ تھی کہ ان سے باطل کی تائید میں توقع رکھتا اور کوئی کمزور ان کے عدل و انصاف سے مایوس نہ ہوتا۔ اور میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان کی راتوں کے چند مناظر دیکھے ہیں کہ رات نے اپنی سیاہ چادر پھیلا دی ہے، تارے ڈوبنے لگے ہیں اور علیؓ محراب مسجد میں اپنی داڑھی ہاتھ سے پکڑے درد بھرے شخص کی طرح رو رہے ہیں اور اس طرح تڑپ رہے ہیں جیسے کوئی ایسا شخص تڑپے جس کو کسی زہریلے سانپ یا بچھو نے ڈس لیا ہو، مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کی آواز اب بھی سنائی دے رہی ہے، اور وہ کہہ رہے ہیں''۔:

”اے دنیا کیا تو مجھ سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے یا مجھ سے کوئی امید رکھتی ہے؟ مجھ سے کچھ امید نہ رکھ، میرے علاوہ کسی اور کو فریب دے، میں تو تجھے تین طلاقیں دے چکا ہوں، جس کے بعد تیری طرف رجعت کی گنجائش ہی نہیں، تیری عمر کوتاہ، تیری دی ہوئی کامرانی حقیر، تیرے خطرات بھیانک اور بڑے آلودہ، آہ! زادِ راہ کتنا کم ہے، سفر کتنا طویل ہے اور راستہ کس درجہ سنسان ہے“۔

اس تاثر کو روایت کرنے والے ابو صالح ہیں کہتے ہیں:۔

”یہ سن کر معاویہؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس کے قطرے ان کی داڑھی پر گرنے لگے، اپنی آستین سے وہ آنسو پونچھتے، اور رونے سے آواز حلق میں گھٹنے لگی، پھر معاویہؓ نے کہا: اللہ ابو الحسن پر رحم فرمائے، واقعی ان کا یہی حال تھا، ضرار تم اپنا حال کہو ان کی جدائی سے کیا محسوس کرتے ہو؟ کہا: مجھے ایسا غم ہے جیسا اس عورت کو ہو گا جس کا بچہ اس کی گود میں ذبح کر دیا گیا ہو، اور نہ اس کے آنسو تھمتے ہوں، نہ غم ہلکا ہوتا ہو“(ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ 10-11، جلد: 89 ، رمضان، شوال 1426 ہجری مطابق اکتوبر، نومبر 2005ء)۔

دورِ بنو امیہ اور بنو عباس

خلافتِ امویہ

بنو ہاشم کی طرح بنو امیہ بھی قریش کا ایک ممتاز اور دولت مند قبیلہ تھا، اسی خاندان نے خلافتِ راشدہ کے بعد تقریباً ایک صدی تک خلافت سنبھالی اور اسلامی فتوحات کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ جس کی سرحدیں ایک طرف چین اور دوسری طرف اسپین تک پھیلی ہوئی تھیں۔ البتہ مرکزی خلافت کے خاتمے کے باوجود اس خاندان کا ایک شہزادہ عبد الرحمن الداخل اسپین میں حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ جہاں 1492 ء تک اموی سلطنت قائم رہی۔

پس منظر

قریش کے تمام خاندانوں میں سے بنی ہاشم اور بنو امیہ کو عظمت و شہرت اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے نمایاں مقام حاصل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قبائلی دور ہونے کی وجہ سے زمانۂ جاہلیت میں کبھی بنو ہاشم سبقت لے جاتے اور کبھی بنو امیہ۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ میں مدت تک تولیت کعبہ کی سرداری کے سلسلے میں تنازعہ رہا۔ آخر بااثر لوگوں کی مداخلت سے ان دونوں میں انتظامی مامور تقسیم کر دیے گئے۔

اس خاندان کے جد اعلیٰ امیہ بن عبد شمس تھے۔ قریش کا سپہ سالاری کا منصب بنی مخزوم سے اس خاندان میں منتقل ہو گیا۔ زمانۂ جاہلیت میں سپہ سالاری کا عہدہ اس خاندان میں سے حرب بن امیہ اور پھر ابوسفیان کے پاس رہا۔ ابوسفیان نے فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کر لیا اور ان کے بیٹے امیر معاویہ کے ذریعے بنو امیہ کی حکومت کی بنیاد پڑی۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں بنو امیہ نے بڑے کارنامے سرانجام دیے۔ عمر فاروقؓ کے دور میں امیر معاویہؓ دمشق کے گورنر بنے اور عثمان غنیؓ کے دور میں وہ پورے صوبہ شام کے گورنر بنا دیے گئے۔ عثمانؓ کی شہادت کے بعد 35ھ میں امیر معاویہؓ نے قصاص عثمانؓ کے لیے آواز اُٹھائی اور مرکزی حکومت سے خود مختار ہو گئے۔ جنگ صفین کے بعد مسلم ریاست دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ آدھی خلافت جو علیؓ کے پاس رہی اور آدھی ملوکیت یا بادشاہت جو امیر معاویہؓ کے ہاتھ میں رہی۔ علیؓ کی شہادت کے بعد حسنؓ خود حکومت سے دست بردار ہوئے اس طرح امیر معاویہؓ مکمل اسلامی ریاست کے بادشاہ بن گئے۔

خلفاء بنو امیہ کی حکومت عروج کے زمانے میں

معاویہ بن ابوسفیان (661-680):۔

سلطنت بنو امیہ کے بانی امیر معاویہ تھے جو فتح مکہ کے موقع پر اپنے والد ابوسفیان رضي الله تعالي عنہ کے اسلام لانے کے بعد اپنے اہل خانہ کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ کا شمار ممتاز صحابہ میں ہوتا تھا اور آنحضرت ﷺ نے انہیں کاتب وحی ہونے کا اعزاز بخشا تھا۔ آپ ﷺ نے خلفائے راشدین کے دور میں بھی اسلامی سلطنت کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ آپ عمر فاروقؓ کے دور میں دمشق کے گورنر مقرر ہوئے اور عثمانؓ کے

دور میں ترقی کرتے ہوئے پورے شام کے گورنر بن گئے۔ اس بڑے عہدے نے ان کی طاقت کو کافی مستحکم کیا اور حضرت علیؓ کے دور میں ان کی خلیفۂ چہارم سے کشمکش شروع ہو گئی اور جنگِ صفین کی صورت میں اسلام کا ایک عظیم سانحہ رونما ہوا۔ در حقیقت اس جنگ کے فوراً بعد ہی آپؓ کی سلطنت کا آغاز ہو گیا تھا جبکہ باقاعدہ آغاز حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امام حسنؓ کی دستبرداری کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے جن اصولوں کے تحت خلافت کو چلایا وہ خلافتِ راشدہ سے بالکل مختلف تھے۔ ایرانی اور رومی طرز کی شخصی حکومت میں انہوں نے ایک بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی۔۔ بلکہ اگر انہیں بادشاہ کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کے دور میں خامیاں کم اور خوبیاں زیادہ نظر آئیں گی۔ ان کے دور کی خامیاں دراصل ملوکیت کے استبدادی نظام کی فطری خامیاں ہیں ان کی ذات کی خامیاں نہیں۔ تاریخِ اسلام میں ان کے مقام کا تعین کرنے میں ہمیں اس لیے مشکل پیش آتی ہے کہ وہ خلافت راشدہ کے مثالی دور کے فوراً بعد آتے ہیں جس کی وجہ سے خلفائے راشدین کے مقابلے میں ان کی شخصیت کئی عظیم الشان کارناموں کے باوجود گہنا گئی۔ انہوں نے شام کے شہر دمشق کو دارالخلافہ قرار دیا جہاں وہ خلافت سے قبل گورنر کی حیثیت سے قیام پذیر تھے۔ ان کے دور کے اہم ترین واقعات میں سندھ، ترکستان اور شمالی افریقہ کی فتوحات اور قسطنطنیہ پر حملہ شامل ہیں۔

یزید بن معاویہ (680-683):۔

امیر معاویہؓ نے اپنے بعد بیٹے یزید کو جانشیں مقرر کیا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں خلیفہ کا انتخاب مشورے سے کیا جاتا تھا اور کبھی کسی خلیفہ نے اپنے بیٹے کو خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ امیر معاویہؓ نے اس مسئلے پر ممتاز لوگوں سے مشورہ کر لیا تھا اور یزید کی بیعت حج کے موقع پر ہزاروں افراد نے کی تھی ۔

اس کا دور کا افسوسناک ترین واقعہ سانحۂ کربلا تھا جس میں نواسۂ رسول ﷺ امام حسینؓ اپنے اہل خانہ سمیت شہید کر دیے گئے۔ کربلا کا یہ واقعہ تاریخ اسلام کا بڑا افسوسناک حادثہ تھا۔ اس کی ذمہ داری یزید پر عاید ہو یا ابن زیاد پر لیکن مسلمانوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے رسول ﷺ کے پیارے نواسے سے ایسا سلوک کریں گے۔ چنانچہ کربلا کے اس واقعے کا حجاز میں سخت رد عمل ہوا اور وہاں کے لوگوں نے یزید سے بیعت توڑ کر مشہور

صحابی عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرلی۔ اس کے بعد دوسرا افسوسناک واقعہ " واقعۂ حرہ "پیش آیا جس میں امویوں کی فوج نے مدینے میں قتل عام کیا اور لوٹ مار مچائی۔ اس کے بعد اموی فوج نے مکے کا رخ کیا لیکن یزید کا انتقال ہو گیا اور فوج دمشق واپس آگئی۔

یزید کے انتقال کے بعد امیر معاویہ کے خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور یزید کے لڑکے نے حکومت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس صورتحال میں عوام کی نظریں عبداللہ بن زبیر (685-695) پر پڑیں اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی گئی اور مصر، شام، عراق بلکہ پوری اسلامی خلافت عبداللہ بن زبیر کے تحت آگئی لیکن تھوڑے ہی عرصے میں مرج راہط کے مقام پر عبداللہ بن زبیر اور بنی امیہ کے حامیوں کے درمیان ایک سخت جنگ ہوئی جس میں بنو امیہ کامیاب ہوئے اور شام سے عبداللہ بن زبیر کا اقتدار ختم ہو گیا تاہم باقی دنیائے اسلام پر ان کا اقتدار اگلے سات سالوں تک قائم رہا۔

اس کشمکش میں اموی حکمران عبدالملک کامیاب ہوئے اور مکہ پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ عبداللہ بن زبیر ایک سپہ سالار حجاج بن یوسف کے مقابلے میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد نظامِ خلافت کی بحالی کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔

عبدالملک بن مروان (685-705):۔

سفیانی خاندان کے بعد بنو امیہ کا جو دوسرا خاندان تخت خلافت پر بیٹھا وہ مروان بن حکم (684-685) کی اولاد سے تھا جو عثمان رضی اللہ کا کاتب رہ چکا تھا۔ مروان بن حکم کو حضور ﷺ نے مدینہ سے شہر بدر کر دیا تھا کیونکہ وہ حضور ﷺ کی نقلیں اتارا کرتا تھا۔ ابو بکرؓ اور عمرؓ نے اسے واپس مدینہ نہ آنے دیا تھا۔ مرج راہط کی جنگ کے بعد صرف 9 ماہ تک خلافت پر فائز رہا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک تخت پر بیٹھا۔ وہ عبداللہ بن زبیرؓ کو شکست دینے کے بعد پوری اسلامی مملکت کا حکمران بن گیا۔ اسے خاندان بنی امیہ کا حقیقی بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عہد کا ایک اور کارنامہ قبۃ الصخرہ کی تعمیر ہے جو فن تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

ولید بن عبدالملک (705-715):۔

عبد الملک کے بیٹے ولید کا زمانہ فتوحات کی وجہ مسلمانوں کا عظیم الشان زمانہ ہے جس کے دوران قتیبہ بن مسلم نے بخارا، سمرقند، خیوہ اور کاشغر فتح کیے، محمد بن قاسم نے سندھ کو اموی حکومت کا حصہ بنایا، تیسری لشکر کشی موسی بن نصیر اور طارق بن زیاد نے مغرب میں اسپین اور پرتگال پر کر کے اس کو خلافت کا حصہ بنایا۔ اس کے علاوہ مغربی بحیرۂ روم میں جزائر بلیلارک پر بھی قبضہ ہوا۔ اس طرح ولید کے دور میں اموی حکومت کاشغر سے بحیرہ اوقیانوس تک پھیل گئی۔ اس کے دور میں دارالحکومت دمشق میں ایک شاندار مسجد تعمیر کی گئی جو جامع اموی کہلاتی ہے۔ اس زمانے میں دنیا کی کوئی طاقت خلافت اسلامی کے سامنے آنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

سلیمان بن عبد الملک (715-717):۔

ولید کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبد الملک خلیفہ ہوا۔ اس نے اگرچہ صرف ڈھائی سال حکومت کی لیکن اس کے دور حکومت میں کئی اہم واقعات پیش آئے۔ جن میں ولید کے دور کے تین مشہور سپہ سالاروں محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر اور قتیبہ بن مسلم کا افسوسناک انجام بھی شامل ہے۔ اس کے دور کا دوسرا اہم واقعہ قسطنطنیہ کا ناکام محاصرہ ہے۔ اس کے دورِ خلافت کا تیسرا اور اہم ترین واقعہ عمر بن عبد العزیز کی جانشینی ہے۔

عمر بن عبد العزیز (717-720):۔

عمر بن عبد العزیز کا دورِ سلطنت بنو امیہ کا سب سے نرالا اور شاندار دور تھا جس نے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی۔ حالانکہ آپ کا دورِ خلافت محض دو سال پانچ ماہ کا رہا لیکن اس مختصر مدت میں انہوں نے وہ کارنامے انجام دیئے کہ مسلمان انہیں پانچواں خلیفۂ راشد قرار دیتے ہیں۔ عمر بن عبد العزیزؒ کا سب سے بڑا کارنامہ ظلم و زیادتی کا خاتمہ ہے۔ انہوں نے ظالم اور جابر عہدیداروں کو عہدوں سے ہٹایا، بیت المال کو رعایا کی ملکیت بنایا۔ اخلاق و کردار کی بلندی کے لحاظ سے وہ تابعین کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنے عمل میں صحابہ کرامؓ سے مشابہ تھا۔ خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کے دور میں ان کا عہد پہلی اور آخری مثال ہے کہ جب خلافت کے اسلامی تصور کی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ آپ نے علیؓ پر سب و شتم کی قبیح رسم کو بند کرایا اور نو مسلموں سے جزیہ وصول کرنے کی بھی بندش کرائی۔ عمر بن عبد العزیزؒ کی ان انقلابی اصلاحات نے ملوکیت کے اس استبدادی نظام اور اس کے تحت پرورش پانے والے مفاد پرست طبقے پر کاری ضرب لگائی تھی۔ اس طبقے کی رہنمائی شاہی خاندان کے افراد کر رہے تھے۔ عمرؒ کی ان تیز

رفتار اصلاحات سے ان کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ خاندانی بادشاہت بھی ختم کر دیں گے اور خلافت کو عام مسلمانوں کے حوالے کر جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے عمر بن عبد العزیزؒ کو زہر دے کر شہید کر دیا۔ شہادت کے وقت ان کی عمر محض 39 سال تھی۔

یزید بن عبد الملک (720-724):۔

عمر بن عبد العزیز کے بعد سلیمان بن عبد الملک کی وصیت کے مطابق یزید بن عبد الملک خلیفہ بنا۔ وہ محض چالیس روز تک سلطنت کو عمر ثانی کے اصولوں پر چلاتا رہا پھر یہ بھاری پتھر اس سے نہ اٹھ سکا اور تمام اصلاحات منسوخ کر کے وہی پرانا استبدادی نظام دوبارہ قائم کر دیا۔ 4 سال 4 ماہ حکومت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور اس کا بھائی ہشام بن عبد الملک خلیفہ ہو گیا۔

ہشام بن عبد الملک (724-743):۔

ہشام نے 20 سال حکومت کی اور وہ خاندان بنی امیہ کا آخری بڑا حکمران تھا۔ وہ بڑا پاکباز، منتظم، کفایت شعار اور بیدار مغز حکمران تھا بلکہ مورخین کہتے ہیں کہ اس میں امیر معاویہ کا علم و تدبر اور عبد الملک کی اولوالعزمی ایک ساتھ جمع ہو گئی تھی۔ اس کے زمانے میں سلطنت کی حدود داغستان، ایشیائے کوچک اور موجودہ سینیگال اور مالی تک پہنچ گئیں جبکہ مراکش کا انتہائی جنوبی حصہ بھی اسی کے دور میں سلطنت کا حصہ بنا۔ اس کے زمانے میں سندھ کے گورنر جنید کشمیر تک وہ تمام علاقہ فتح کر لیا جو اب پاکستان کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ اسنے ہندوستان میں مارواڑ، اجین، گجرات اور بھڑوج تک بھی علاوہ بھی فتح کیا۔ اس کے دور کا سب سے اہم واقعہ مسلمانوں کا فرانس پر ناکام حملہ تھا۔ جہاں مسلمان عبد الرحمان الغافقی کی قیادت میں کوہ پائرینیس عبور کر کے جنوبی اور مغربی فرانس فتح کرتے ہوئے ٹورس کے مقام تک پہنچے جو پیرس سے صرف ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں مسلمانوں کا یورپ کی متحدہ افواج سے مقابلہ ہوا جس میں امیر عبد الرحمان شہید ہو گیا اور مسلمانوں کو شکست ہو گئی۔

مروان ثانی (744-750):۔

ہشام کے بعد بنی امیہ کا زوال شروع ہو گیا اور بالآخر مروان ثانی کے عہد میں معرکۂ زاب میں شکست کے ساتھ ہی سلطنت امویہ کا خاتمہ ہو گیا۔ مروان شکست کھا کر مصر کی طرف بھاگا۔ عباسی فوجوں نے اس کا تعاقب کیا اور حیرہ کے مقام پر اس کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ابوالعباس السفاح پہلے عباسی خلیفہ کی حیثیت سے تخت پر بیٹھا۔

مروان کے قتل کے بعد بنوعباس نے چن چن کر امویوں کو قتل کیا اور مردوں کی قبروں کو اکھاڑ کر لاشوں کی بے حرمتی کی۔ صرف ایک اموی شہزادہ عبدالرحمن الداخل بچ کر اندلس جا پہنچا اور وہاں اس نے اموی حکومت کی بنیاد رکھی۔ سپین میں امویوں کی حکومت 138ھ سے 428ھ تک قائم رہی۔ ان میں جو بیس سلاطین گزرے جن میں بعض بڑے جلیل القدر حکمران تھے۔ اور ان کے عہد حکومت میں ہسپانیہ تہذیب و تمدن کی انتہائی بلندیوں پر جا پہنچا۔ قرطبہ اور دمشق کی رفیع الشان مساجد اور عمارات آج بھی امویوں کے شاہانہ عروج و کمال کی یاد دلاتی ہیں۔

خصوصیات

بنو امیہ کا نظامِ حکومت، بنو امیہ کے زوال کے اسباب اور اموی دور میں ثقافتی، سماجی و معاشرتی زندگی ملاحظہ کریں۔

سلطنت بنو امیہ کا آغاز عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد ہی سے ہو گیا تھا۔ گویا عثمان غنیؓ کی شہادت کا ایک نتیجہ بنو امیہ کی سلطنت کا آغاز بھی تھا۔ امیر معاویہؓ علیؓ کے آخری دور میں خلیفہ تسلیم کر لیے گئے اور سلطنت بنو امیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ امیر معاویہؓ کی حکومت خالص شخصی تھی۔ انہوں نے اس کے استحکام و بقاء کے لیے ہر ممکن تدبیر و طریقہ اختیار کیا لیکن کسی حالت میں ان کا قدم دنیاوی حکمرانی کے نقطۂ نظر سے جائز حدود سے باہر نہیں نکلا۔ علیؓ کے مقابلے میں ان کی صف آرائی اجتہادی غلطی کا نتیجہ تھی۔، آپؓ کے دور میں قاتلانِ عثمانؓ پر سب و شتم کی رسم جاری ہوئی جس کو خلافت کے دشمنوں نے علیؓ کی طرف منسوب کر کے فساد کا ایک نیا دروازہ کھولا۔ سب سے بڑی اجتہادی غلطی یزید بن معاویہ کو ولی عہد مقرر کر کے خلافت کو مکمل موروثیت کا درجہ دینا تھا۔ اس غلطی نے خلافت کی اصل روح اور جمہوریت کی آزادی جو خلفائے راشدین کے دور میں برقرار تھی، کا خاتمہ کر دیا۔ اور نہ صرف بنو امیہ بلکہ ان کے بعد آنے والی دیگر خلافتیں بھی اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چلیں۔

خاندان بنو امیہ میں امیر معاویہ، عبد الملک بن مروان، ولید بن عبد الملک اپنی فتوحات، انتظامی صلاحیتوں اور تمدنی ترقیوں کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بعد عمر بن عبد العزیز اس خاندان میں بالکل مختلف قسم کے خلیفہ تھے اور ان کا دورِ خلافت راشدہ کا نمونہ تھا۔ ان کا ہر قدم اصلاحی تھا۔ وہ کسی پہلو دیگر اموی خلفاء کے مشابہ نہ تھے۔ ان کو پانچواں خلیفہ راشد بھی کہا جاتا ہے۔ عمر بن عبد العزیزؒ کی قابلِ فخر خلافت کے بعد یزید ثانی کی خلافت کا آغاز ہوا لیکن یزید اپنے پیشرو عمر بن عبد العزیز کے نقش قدم پر زیادہ نہ چل سکا اور پھر وہی بنو امیہ کا استبدادی نظام شروع ہو گیا۔ ہشام بن عبد الملک کا دور انتظامی لحاظ سے بنو امیہ کا کامیاب دور تھا۔ ہشام کے بعد یکے بعد دیگرے جو تین خلفاء مسند اقتدار پر پہنچے ان کا دور تاریخ میں کسی اہمیت کا حامل نہیں البتہ انہیں بنو امیہ کے زوال کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ یہ تینوں خلفاء ولید ثانی، یزید ثالث اور ابراہیم انتہائی عیش پرست مگر عقل و بصیرت سے ناآشنا تھے۔ آخری خلیفہ مروان ثانی گو کہ انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا لیکن وہ بھی بنو امیہ کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا نہ دے سکا۔ مروان عباسی تحریک کے سامنے کمزور ثابت ہوا اور آخری فرمانروا ثابت ہوا۔

سلطنت بنو امیہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام نے خاندانوں اور قبائل کی جس تفریق اور امتیاز کو مٹا دیا تھا بنو امیہ نے اس کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ انہوں نے عربوں کے بھولے ہوئے سبق کو پھر یاد دلایا اور یہی سبق ان کی بربادی کا باعث بھی ثابت ہوا یعنی علویوں اور عباسیوں نے اسی خاندانی امتیاز کو آلۂ کار بنا کر بنو امیہ کی بربادی کے سامان فراہم کیے۔

اس خاندان نے اپنی حکومت اور سلطنت کے استحکام کے لیے ظلم و تشدد اور لوگوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ خلفاء بنو امیہ میں زیادہ نامور و قابل حکمران ہی اس غلطی کے مرتکب ہوئے۔ اس جبر و ظلم کا نتیجہ بھی ان کے حق میں بہتر ثابت نہ ہوا۔ حالانکہ اس وقت ان کا نظریہ اپنے دشمنوں کو راستے سے ہٹانا تھا جس کا اثر الٹا ہوا۔

لیکن یہ درست نہیں کہ ان کی خلافت میں صرف خامیاں پائی جاتی ہیں۔ بہت سی ایسی خوبیاں بھی اس حکومت میں موجود تھیں جو ان کے بعد بھی بہت کم نظر آئیں۔ بنو امیہ قبائل قریش اور ملک عرب کا ایک نامور قبیلہ تھا۔ اس قبیلے کے اکثر لوگ اپنے تدبر میں اپنے ہم عصروں پر فوقیت رکھتے تھے بلکہ

عہد جاہلیت سے انہیں یہ خوبیاں میسر تھیں۔ اگر بنو امیہ میں جمہوریت کی روح ختم نہ کی جاتی یا بنو امیہ کے قابل لوگوں میں ہی اقتدار تقسیم ہوتا رہتا تو یقیناً اس دور کی حکومت میں اضافہ ہوتا اور عالم اسلام کو بھی اتنا نقصان نہ پہنچتا۔

بنو امیہ کی یہ خوبی انتہائی قابل تحسین ہے کہ اس نے خلافتِ راشدہ کی فتوحات کو وسعت دے کر مشرق و مغرب میں پھیلا دیا۔ مشرق میں چین اور مغرب میں بحرِ ظلمات تک انہوں نے اپنے زمانے کی متمدن دنیا کو فتح کر کے فخر حاصل کیا۔ براعظم افریقہ کے ریگستانوں اور ہندوستان کے میدانوں تک اسلام بنو امیہ کی خلافت میں ہی پھیلا۔ اس خلافت کے بعد مسلمانوں کو جدید فتوحات کا بہت کم موقع ملا اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ بنو امیہ کے بعد اسلامی حکومت ایک مرکز پر قائم نہیں رہی بلکہ الگ الگ متوازی حکومتیں قائم ہونے لگیں۔

اسلام کا ابتدائی زمانہ اور خلافتِ راشدہ کا دور مسلمانوں کی سادگی کا دور تھا کیونکہ ان کی ضروریات زندگی بھی محدود تھیں لیکن عہد بنو امیہ میں آہستہ آہستہ ضروریات زندگی وسیع ہونے لگیں اور عیش و عشرت بڑھنے لگا۔ بنو امیہ کی حکومت میں خلافت کو موروثیت میں تبدیل کرنے کے بعد جو سب سے بڑی تبدیلی نظر آئی وہ یہی عیش پرستی اور شہنشاہیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخری دور میں اس کا اثر اس قدر بڑھ گیا تھا کہ آخر کار یہی تبدیل ان کے زوال کی وجہ بن گئی۔

سلطنت بنو امیہ کا ایک قابلِ تحسین پہلو یہ نظر آتا ہے کہ اس دور میں عربوں کی اپنی ایک الگ حیثیت رہی۔ عرب فاتح قوم تھی، اخلاق، زبان، تمدن اور مراسم ہر چیز پر عرب غالب تھے لیکن بنو امیہ کے بعد ان کی یہ فوقیت جاتی رہی۔

بنو امیہ کے زوال کے اسباب

قبائلی اور نسلی عصبیتوں کا ظہور

اسلام نے دورِ جاہلیت کی تمام قبائلی اور جاہلی عصبیتیں ختم کر کے عربوں کو ملت اسلامیہ کے رشتہ سے منسلک کر دیا تھا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانہ تک یہ قبائلی تعصبات دبے رہے لیکن بنو امیہ کے دور میں یہ تعصبات پھر ابھر آئے۔ عرب قبائلی نسلی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم تھے۔ مضری (بنو

عدنان) اور یمنی (بنو قحطان) جو حمیری کہلاتے تھے۔ ان دونوں قبائل کے درمیان زمانہ قدیم سے دشمنی چلی آرہی تھی۔ تمام عرب باشندے جو سلطنت کے مختلف حصوں میں جگہ جگہ آباد ہو گئے تھے کسی نہ کسی قبیلہ کے ساتھ بدستور وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ شام میں یمنی عنصر کی اکثریت تھی۔ اس لیے اموی حکمرانوں کی اکثریت بالعموم یمنی (حمیری) قبائل کی طرفداری تھی۔ امیر معاویہ چونکہ سمجھ دار تھے اس لیے انھوں نے دونوں گروہوں کو اپنا مطیع بنائے رکھا لیکن مروان اول کے زمانہ میں یہ عداوت اور دشمنی دوبارہ جنم لے چکی تھی۔ بعد کے ادوار میں مختلف خلفاء نے اپنے مخصوص مقاصد اور عزائم کی تکمیل کے لیے ان قبائلی عصبیتوں کو ابھارا۔ یہ کشمکش بالآخر خانہ جنگی کی صورت اختیار کر گئے اور فوج بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

مروان ثانی کے زمانے میں عربوں کی باہمی آویزش مملکت کے ہر حصہ میں خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ سپین، سندھ، شام، عراق اور خراسان سب جگہ عرب باہمی خانہ جنگی کا شکار تھے۔ ابو مسلم خراسانی کی بغاوت کے وقت خراسان میں یمنی و مضری قبائل آپس میں لڑ رہے تھے اور اس نے ان باہمی رقابت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں کو ایک ایک کر کے ختم کر ڈالا اور اس کے ساتھ ہی اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

بنو ہاشم اور بنو امیہ کی قدیم آویزش

اسلام سے پہلے مکہ میں بنو ہاشم اور بنو امیہ اہم ترین قریشی قبائل تھے اور دونوں کے درمیان ایک طرح کی رقابت پائی جاتی تھی۔ نبی آخر الزمانﷺ کے بنو ہاشم میں پیدا ہونے کے سبب بنو امیہ میں سے ایک گروہ ان کی قیادت کو قبول کرنے میں حجاب رکھتا تھا اور بہت دیر تک مقابلہ پر ڈٹا رہا۔ فتح مکہ کے بعد تمام اموی مسلمان ہو گئے تو کشمکش ختم ہو گئی۔ لیکن شہادت عثمانؓ کے بعد امیر معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ کے خلاف جنگ نے ان جذبات کو دوبارہ زندہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قتل حسینؓ کا انتقام لینے کے لیے نعرے پر چلنے والی تحریک جب بنو عباس کے ہاتھوں میں چلی گئی تو انہوں نے اس کو ہاشمی تحریک کا نام دیا۔ اس طرح قدیم تلخیاں پھر لوٹ آئیں۔ عباسی انقلاب کے بعد جس انداز میں بنو امیہ کا قتل عام ہوا اس میں قدیم قبائلی تعصب کا حصہ بہت نمایاں ہے۔

خلافت اسلامیہ کی ملوکیت میں تبدیلی

بنو امیہ کی خلافت، اسلامی خلافت کی بجائے شخصی اور موروثی بادشاہت تھی مگر مسلمان خلافتِ راشدہ کے نظام اور خلفائے راشدین کی طرزِ زندگی کو اپنے لیے نمونہ عمل سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کے دل خلافت کی بجائے ملوکیت کے قیام سے ناخوش تھے۔ انہوں نے بنو امیہ کے اس طرزِ عمل کو کبھی بھی پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ دوسری طرف اموی خلافت میں شخصی حکومت کی تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ اس تبدیلی کے خلاف عام مسلمانوں کے دلوں میں زبردست رد عمل موجود تھا۔ چنانچہ مخالف عناصر اسی ردِ عمل سے فائدہ اٹھا کر اکثر خفیہ یا علانیہ بغاوتیں کرتے رہتے جس سے حکومتی نظم ونسق میں ابتری اور کمزوری پیدا ہوئی۔ اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر عباسیوں نے ان کا تختہ الٹ دیا۔

سانحہ کربلا

خلافت کی نوعیت میں تبدیلی کا بھرپور نوٹس حضرت حسین ابن علیؓ نے لیا۔ انہوں نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ اور اہل کوفہ کی مدد سے اس کی حکومت ختم کرنے کا پروگرام بنا کر کوفہ کی راہ لی۔ کوفیوں نے ان کی مدد کرنے کی بجائے اموی حکام کا ساتھ دیتے ہوئے انہیں شہید کر ڈالا۔ اس شہادت نے اموی حکومت کے ظالمانہ حیثیت کو بے نقاب کر دیا اور مخلص عوام کے اندر اس کے خلاف نفرت کے شدید جذبات پیدا کر دیئے۔ اس کے بعد ہر وہ شخص یا گروہ جو بنو امیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کی دعوت لے کر اٹھتا تھا قتل حسین کے انتقام کا نعرہ لگاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے اس نعرہ انتقام کے بغیر عباسی تحریک کو ہر جگہ معاونین کارکن نہیں مل سکتے تھے۔

ظالم گورنر

بنو امیہ نے عوام کو دبانے کے لیے ایسے لوگوں کو مناصب حکومت سونپے جو سختی سے عوام کو دبا سکیں۔ ان گورنروں نے وقتی طور پر اموی حکومت کو مضبوط کیا لیکن عوام کے دلوں میں ان کے ظلم کی وجہ سے شدید نفرت کے جذبات پیدا ہوئے۔ حجاج بن یوسف کے ظالمانہ رویہ کے خلاف تو اس کے ماتحت جرنیلوں نے بھی بغاوت کر دی۔ عبید اللہ ابن زیاد کے ظالمانہ اقدامات نے عوام اور حکومت کے درمیان نفرت کی خلیج کو مزید وسیع کیا اور اس طرح کے گورنر اس حکومت کو بظاہر مستحکم اور فی الحقیقت کمزور کرتے چلے گئے۔

سپہ سالاروں اور اراکین سلطنت کی رسوائی

وہ سپہ سالار اور اراکین سلطنت جنہوں نے اموی سلطنت کی وسعت اور استحکام کے لیے بیش بہا خدمات سرانجام دیں تھیں۔ انھیں خلفائے بنو امیہ نے اپنی شخصی رنجشوں کا نشانہ بنا کر رسوا ہی نہیں کیا بلکہ قید و بند میں ڈال کر قتل تک سے بھی دریغ نہ کیا۔ خلیفہ سلیمان نے قتیبہ بن مسلم اور ابن اشعت جیسے عظیم سپہ سالاروں کی ذلت و رسوائی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ موسیٰ بن نصیر جیسا مایاناز فاتح اور جرنیل سلیمان کے عباب کا شکار ہوا۔ محمد بن قاسمؒ فاتح سندھ محض حجاج دشمنی کی بنا پر قتل کر دیا گیا۔ پھر یزید بن عبد الملک نے آل مہلب کا خاتمہ کر دیا حالانکہ ان لوگوں نے بنو امیہ کے لیے شاندار کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے۔ ان اقدامات کی وجہ سے امرا اور اراکین حکومت کے دلوں میں شکوک و شبہات نے جنم لیا اور ان کا اعتماد متزلزل ہو کر رہ گیا۔ لہٰذا ان میں وہ پہلا سا جذبہ جانثاری موجود نہ رہا جس کی بدولت اموی سلطنت کو اس قدر وسعت اور استحکام حاصل ہوا تھا۔

اخلاقی زوال

بنو امیہ کے آخری دور کے اکثر خلفاء کی زندگی اخلاقی نقطہ نظر سے پست تھی۔ یزید اول ہی کے زمانہ میں شراب نوشی اور دیگر لہو و لعب خلیفہ کی زندگی کا جزو بن گئے تھے۔ عبد الملک اور ولید اول کی زندگیاں اگرچہ اخلاقی عیوب سے پاک تھیں لیکن اپنے مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے بھی اخلاقی حدود کو توڑ کر ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا۔ صرف حضرت عمر بن عبد العزیز کی زندگی خلفائے راشدین کے مشابہ تھی لیکن ان کے علاوہ ولید ثانی، یزید ثالث ابراہیم وغیرہ کی زندگیاں بے راہ روی کا نمونہ تھیں۔ شراب نوشی، عیاشی، موسیقی اور ناچ رنگ کی محفلیں اور حرم سرا ان کے پسندیدہ مشغلے تھے۔ چنانچہ یہ اخلاقی زوال بنو امیہ کی حکومت کو گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے۔ خلفاء ان مشاغل میں الجھے رہتے اور حکومتی معاملات کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دیتے۔ اس کے علاوہ دولت کی فراوانی اور خوشحالی نے انہیں کاہل بنا دیا تھا۔ جب اخلاقی تنزل کی وجہ سے اعلیٰ سیرت و کردار سے عاری لوگ مسند اقتدار پر فائز ہونا شروع ہوئے تو اموی حکومت کے مخالفین نے ان کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

خوارج

بنو امیہ کا ایک مستقل دشمن خوارج تھے۔ خارجیوں کا ظہور جنگ صفین کے بعد ہوا۔ یہ لوگ خلافت کو ایک جمہوری اور انتخابی ادارہ قرار دیتے اور خلیفہ کی اطاعت اس وقت تک ضروری سمجھتے تھے جب تک وہ عدل اور اصلاح کے طریقہ پر قائم رہے اور جب وہ اس راہ سے ہٹ جائے تو اس سے جنگ کرنا معزول کرنا یا قتل کرنا ان کے نزدیک جائز تھا۔ یہ لوگ اپنے نظریات میں انتہائی متشدد تھے۔ حوصلہ، جرات اور بہادری میں یہ لوگ اپنی مثال آپ تھے۔ تعداد کی کمی کے باوجود یہ لوگ بنو امیہ کے خلاف میدان عمل میں ڈٹے رہے۔ ان لوگوں نے جابجا بغاوتیں کیں اور ایک طویل مدت تک کشت وخون کا سلسلہ برپا کیے رکھا۔ ان کے حوصلہ اور جرات کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ مٹھی بھر خوارج نے ہزاروں اموی سپاہیوں کو شکست دی۔ ان کی سرگرمیاں بنو امیہ کے زوال کا سبب بنیں۔

موالی کی ناراضی

موالی وہ غیر عرب تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسلامی معاشرہ میں عرب اور غیر عرب کے درمیان کسی امتیاز کی گنجائش نہ تھی لیکن اموی حکومت کی ابتدا ہی سے ایک عرب حکومت کا رنگ لیے ہوئے تھی۔ اس لیے ان لوگوں نے عرب اور غیر عرب میں تفریق پیدا کر کے نو مسلموں کو عربوں کے برابر حقوق نہ دیئے۔ ان سے جزیہ بھی بدستور وصول کیا جاتا رہا حالانکہ شرعی نقطہ نظر سے یہ ناجائز تھا۔ اس لیے عجمیوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ عربوں نے ہمارے علاقے فتح کر کے ہمیں غلام بنالیا ہے اور اسلام قبول کرنے کے باوجود بھی انھیں عربوں کے مساوی درجہ دینے کے لیے تیار نہیں یہ لوگ اقتصادی بدحالی کا شکار بھی تھے۔ ان پر مختلف قسم کے ناجائز ٹیکس بھی لگائے جاتے تھے۔ اس جذبہ نے پے در پے بغاوتوں کے علاوہ عام بے چینی کو جنم دیا۔ حجاج نے ان پر سختیاں کیں اور ان اقدامات نے ان کے دلوں میں امویوں کے خلاف مزید دشمنی کے جذبات پیدا کیے۔ بالآخر اس طرز عمل نے عجم میں شعوبی تحریک کو جنم دیا اس کی وجہ سے ہی خراسان میں ابو مسلم خراسانی کی تحریک کو نمایاں کامیابی نصیب ہوئی اور عباسی خلافت کے قیام کے لیے راہ ہموار ہوئی۔

ولی عہدی کا نظام

اموی حکومت کی عمارت میں دراڑیں اس وقت پیدا ہوئیں جب اموی خلفاء نے ایک کی بجائے دو دو ولی عہد مقرر کرنے شروع کر دیے۔ اس کا آغاز بہ امر مجبوری مروان بن حکم نے کیا تھا۔ اس نے خالد بن یزید اور عمر بن سعید بن العاص کو اپنے بعد ولی عہد مقرر کیا۔ اس نے اس تدبیر سے اموی خاندان کو متحد کر کے مرج راہط کی لڑائی جیت لی، لیکن بعد میں دونوں کو اپنے راستے سے ہٹا کر اپنے بیٹے عبد الملک اور عبد العزیز کو یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کیا۔ عبد الملک نے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کو یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کیا تو اموی خاندان کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ ہر خلیفہ اپنے بھائی کو ہٹا کر اپنے بیٹوں کو حکومت دلوانے کے لیے قبائلی سرداروں کو اپنے ساتھ ملاتا۔ اس طرح داخلی دھڑے بندیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو آخر کار امور حکومت کو بالکل کمزور کر گیا۔

ایرانیوں کی عرب دشمنی

عرب کی بالادستی کے بعد ایرانیوں نے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا لیکن ایران کی عظمت رفتہ کے نقوش ان کے ذہنوں میں ابھی تک محفوظ تھے۔ ابھی کل کی بات تھی کہ ایران اپنی تہذیب و تمدن اور شاہی سطوت و وقار کی بنا پر دنیا کے عظیم ملکوں میں شمار ہوتا تھا۔ ایرانی اپنے اسی شاندار ماضی کی بنا پر عربوں کے مقابلہ میں احساس برتری میں مبتلا تھے۔ خلافتِ بنو امیہ خالص عربی حکومت تھی اس لیے ایرانی ہر اس تحریک کی پشت پناہی کے لیے ہر وقت مستعد اور تیار تھے جس کا مقصد بنو امیہ کی خلافت کا خاتمہ ہو۔ عباسی دعوت کی مقبولیت اور ابو مسلم خراسانی کی کامیابی کی ایک وجہ ایرانیوں کی عرب دشمنی بھی ہے۔ بنو امیہ کی بعض زیادتیوں کی بدولت یہ مخالفانہ جذبات عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گئے اور بالآخر خلافت بنو امیہ کے خاتمے کا سبب بنے۔

بزرگانِ دین

ان دونوں گروہوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی کثیر تعداد میں موجود تھے جو اپنی علمیت اور دین داری کی وجہ سے بنو امیہ کے خلاف تھے۔ ان میں علمائے امت، صحابہ کی اولاد اور اہل علم شامل تھے۔ یہ لوگ اپنے تقوی اور رائے کی پختگی اور بزرگی کی بدولت عوام الناس میں کافی بااثر تھے۔ ان لوگوں کی

زبردست خواہش تھی کہ خلافتِ راشدہ کا نظام دوبارہ قائم ہو۔ چنانچہ انھوں نے ہر اس تحریک کا ساتھ دیا جس کا مقصد اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ مخالفین بنو امیہ کو ہمیشہ ان لوگوں کی تائید حاصل رہی۔

حکمران طبقہ کی نااہلی

بنو امیہ کی حکومت شخصی تھی۔ ایسی حکومتوں کا قیام اور استحکام حکمران طبقہ کی اہلیت اور ذاتی قابلیت کا مرہونِ منت ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ جب تک بنو امیہ کو امیر معاویہ، عبد الملک، ولید اول اور ہشام جیسے لائق حکمرانوں کی قیادت حاصل رہی زمانے میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا رہا۔ مغرب ہو یا مشرق کوئی قوم یا فرمانرواں ان کی یلغاروں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ سپین، افریقہ، ترکستان، سندھ، عراق، شام اور جزائر بحیرہ روم وغیرہ کے قبضہ میں تھے۔ تہذیب و تمدن میں انھوں نے نئی طرح رکھی۔ نظم و نسق، حکومت اور سماجی اور معاشرتی زندگی میں کئی اہم اصلاحات نافذ کیں اور قومی و ملکی خوشحالی میں اضافہ کیا لیکن جب مسند خلافت پر وہ لوگ فائز ہوئے جو شجاعت دلیری، عزم اور تدبیر و رائے سے عاری تھے تو خلافت بنو امیہ کی تباہی یقینی تھی۔

خلیفہ ہشام کے چار جانشیوں میں سے تین ولید ثانی، یزید ثالث اور ابراہیم منصب خلافت کے لیے انتہائی گیر موزوں اور نااہل تھے۔ اس کے علاوہ بنو امیہ کے اکثر و بیشتر خلفاء شراب اور حرم کی رنگینیوں کے خوگر اور عیش و عشرت کے دلدادہ ہو چکے تھے۔ وہ حسن کی لطافتوں میں کھو کر اپنے فرائض کی بجا آوری سے غفلت کے مرتکب ہوئے۔ لہٰذا ان کا زوال لازمی تھا۔ اس کے علاوہ خوشحالی اور دولت کی فراوانی نے انھیں آرام پسند اور کاہل بنا دیا۔ آخری دور کے خلفاء اکثر و بیشتر کنیزوں کے بطن سے تھے۔ اس لیے خون کی اس باہمی آمیزش سے بنو امیہ کی انفرادیت قائم نہ رہی۔ اب شاہی خاندان تک خالص عربی خون کا دعوی نہ کر سکتا تھا جو ان کا طرہ امتیاز تھا۔ ان کی نااہلی کی بدولت نظم و نسق حکومت تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔

عباسی دعوت

اس ہمہ گیر بے چینی اور انتشار سے عباسی داعیوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دعوت عباسی کو بنو ہاشم کے نام پر عوام سے روشناس کرایا گیا۔ خراسان کو اس دعوت اور تنظیم کا مرکز بنا کر عباسی داعیوں کی ایک کثیر تعداد اطراف و اکناف میں پھیلا دی گئی۔ یہ لوگ خفیہ طور پر تاجروں اور پیشہ وروں کے بھیس

میں ملک کے مختلف حصوں کے دورے کرتے اور بڑے درمندانہ انداز میں امام حسین اور خانوادہ اہل بیت پر کیے گئے مظالم کی تشہیر کرتے۔ اس طرح جب عوامی ذہن ہمہ گیر انقلاب کے لیے تیار ہو گیا تو ابو مسلم خراسانی جیسے باتدبیر رہنماؤں کی قیادت میں اموی حکومت کا تختہ الٹ کر عباسی خلافت قائم کر دی۔

خلافتِ عباسیہ

خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد عربوں کی قائم کردہ دو عظیم ترین سلطنتوں میں سے دوسری سلطنت خلافت عباسیہ کہلاتی ہے۔ جس کا قیام 750ء (132ھ) میں عمل میں آیا اور 1258ء (656ھ) میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ خلافت ایک تحریک کے ذریعے قائم ہوئی جو بنو امیہ کے خلاف تھی۔ تحریک نے ایک عرصے تک اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کی اور بالآخر بنو امیہ کو شکست دینے کے بعد برسرِ اقتدار آ گئی۔

خلافتِ عباسیہ عروج کے زمانے میں

عباسیوں کی حکومت بھی امویوں کی طرح شخصی اور موروثی تھی اور ولی عہدی کا بھی وہی طریقۂ کار تھا جو بنو امیہ نے اختیار کیا ہوا تھا۔

خاندان عباسیہ نے دار الحکومت دمشق سے بغداد منتقل کیا اور دو صدیوں تک مکمل طور پر عروج حاصل کیے رکھا۔ زوال کے آغاز کے بعد مملکت کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی جن میں ایران میں مقامی امراء نے اقتدار حاصل کیا اور المغرب اور افریقیہ اغالبہ اور فاطمیوں کے زیر اثر آ گئے۔

عباسیوں کی حکومت کا خاتمہ 1258ء میں منگول فاتح ہلاکو خان کے حملے کے ذریعے ہوا۔ تاہم خلیفہ کی حیثیت سے ان کی حیثیت پھر بھی برقرار رہی اور مملوک سلطان ملک الظاہر بیبرس نے خاندان عباسیہ کے ایک شہزادے ابو القاسم احمد کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا۔ اس طرح خلافتِ بغداد سے قاہرہ منتقل ہو گئی تاہم یہ صرف ظاہری حیثیت کی خلافت تھی، تمام اختیارات مملوک سلاطین کو حاصل تھے۔

عثمانیوں کے ہاتھوں مملوکوں کی شکست کے بعد عباسیوں کی اس ظاہری حیثیت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور خلافت عباسیوں سے عثمانیوں میں منتقل ہو گئی۔ موجودہ عراق میں تکریت کے شمال مشرق میں رہنے والا العباسی قبیلہ اسی خاندان عباسیہ سے تعلق رکھتا ہے۔

پسِ منظر

خاندانِ بنو امیہ کی حکومت کے دورِ زوال میں سلطنت میں ہر جگہ شورش اور بغاوتیں شروع ہو گئی تھی جن میں سب سے خطرناک تحریک بنی ہاشم کی تھی۔ بنی ہاشم چونکہ اس خاندان سے تھے جس میں رسول اللہ ﷺ ہوئے ہیں اس لیے وہ خود کو خلافت کا بنی امیہ سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔

بنی ہاشم میں بھی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور ان کے بعد ان کی اولاد کو خلافت کا حقدار سمجھتا تھا۔ یہ گروہ شیعانِ علی کا طرفدار کہلاتا تھا۔ بعد میں اسی گروہ میں سے کچھ لوگوں نے شیعہ فرقے کی شکل اختیار کر لی اور وہ اثنا عشری کہلائے۔

دوسرا گروہ رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد کو خلافت دلانا چاہتا تھا۔ شروع میں دونوں گروہوں نے مل کر بنو امیہ کی حکومت کے خلاف بغاوتیں کیں لیکن بعد میں عباسی گروہ غالب آ گیا۔

بنو عباس کی دعوت عمر بن عبد العزیز کے زمانے میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ ہشام کے دور میں اس نے سند حاصل کر لی۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد شیعان علی نے منصب امامت امام کے صاحبزادے حضرت زین العابدین کو پیش کیا۔ لیکن جب انہوں نے قبول نہیں کیا تو شیعوں نے حضرت علیؓ کے غیر فاطمی فرزند محمد بن حنفیہ کو امام بنا لیا اور اس طرح امامت کا منصب اہل بیت نبوی سے علوی شاخ میں منتقل ہو گیا۔ محمد بن حنفیہ کے بعد ان کے صاحبزادے ابو ہاشم عبد اللہ جانشیں ہوئے اور ایران میں ان کی دعوت خفیہ انداز میں پھیلتی رہی۔ 100ھ میں ابو ہاشم نے شام میں وفات پائی۔ اس وقت ان کے خاندان میں سے کوئی شخص ان کے پاس نہیں تھا۔ مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن علی قریب موجود تھے اس لیے ابو ہاشم نے ان کو جانشیں مقرر کر کے منصب امامت ان کے سپرد کر دیا اور اس طرح امامت علویوں سے عباسیوں میں منتقل ہو گئی۔ بنی ہاشم کی یہ دعوت عمر بن عبد العزیز سے ہشام تک خفیہ رہی اور عراق اور خراسان کے بڑے حصے میں پھیل گئی۔ 126ھ میں محمد بن علی کا انتقال ہو گیا اور ان کے بڑے بیٹے ابراہیم بن محمد ان کے جانشیں ہوئے۔ ان کا مرکز شام میں ایک مقام حمیمہ تھا۔ ان کے دور میں تحریک نے بہت زور پکڑ لیا اور مشہور ایرانی ابو مسلم خراسانی اسی زمانے میں عباسی تحریک کے حامی کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اس نے ایک طرف عربوں کو آپس میں لڑایا اور دوسری طرف ایرانیوں کو عربوں کے خلاف ابھارا۔ اس جگہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ محمد بن علی نے ابو مسلم کو ہدایت کی تھی کہ خراسان

میں کوئی عربی بولنے والا زندہ نہ چھوڑا جائے۔ مروان کے دور میں اس سازش کا انکشاف ہو گیا اور ابراہیم کو قتل کر دیا گیا۔ اب ابراہیم کا بھائی ابو العباس عبد اللہ بن علی جانشیں ہوا۔ اس نے بھی حکم دیا کہ خراسان میں کوئی عرب زندہ نہ چھوڑا جائے۔ اس نے ابراہیم کے غم میں سیاہ لباس اور سیاہ جھنڈا عباسیوں کا نشان قرار دیا۔

عربی اور ایرانی ہمیشہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے اور جب ایران پر عربوں کا قبضہ ہوا تو خلفائے راشدین نے منصفانہ حکومت قائم کر کے اس نفرت کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن بنو امیہ کے حکمران خلفائے راشدین کے اصولوں پر نہ چلے۔ ایرانیوں کو بھی حکومت سے شکایت بڑھتی چلی گئی۔ وہ اب مسلمان ہو گئے تھے اور بحیثیت مسلمان عربوں کے برابر حقوق چاہتے تھے۔ جب ان کے برابری کا سلوک نہیں کیا گیا تو وہ بنو امیہ کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی فکر کرنے لگ گئے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بنو ہاشم کا ساتھ دیا۔

حصولِ اقتدار

بنو امیہ کے زمانے میں عربوں اور ایرانیوں کے درمیان نفرتیں بڑھنے کے علاوہ خود عربوں کے اندر قبائلی عصبیت اور اختلافات بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ رنگ و نسل کے یہ اختلافات جن کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا اتنی جلدی پھر سر اٹھانے لگے اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ والوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے لگا۔ اس اختلاف کی وجہ سے عربوں کی قوت کمزور ہو گئی اور بنو امیہ کا سب سے بڑا سہارا چونکہ عرب تھے اس لیے ان کی قوت کمزور ہونے سے بنو امیہ کی سلطنت بھی کمزور پڑ گئی۔

اسلامی دنیا کی یہ حالت تھی کہ بنی ہاشم کے حامیوں نے ایرانیوں کی مدد سے خراسان میں بغاوت کر دی۔ ہشام کے نااہل جانشین اس بغاوت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس جدوجہد میں ایک ایرانی سردار ابو مسلم خراسانی سے بنی ہاشم کو بڑی مدد ملی۔ وہ بڑا متعصب، ظالم اور سفاک ایرانی تھا لیکن زبردست تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ بنی ہاشم کے یہ حامی ماوراء النہر اور ایران پر قبضہ کرنے کے بعد عراق میں داخل ہو گئے جہاں بنی امیہ کے آخری حکمران مروان بن محمد نے دریائے زاب کے کنارے مقابلہ کیا لیکن ایسی شکست کھائی کہ راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ بعد میں مروان پکڑا گیا اور اس کو قتل کر دیا گیا۔ دار الخلافہ دمشق پر بنی ہاشم کا قبضہ ہو گیا اور بنی ہاشم کی شاخ بنی عباس کی حکومت قائم ہو گئی۔

مشہور خلفاء

خاندان عباسیہ نے 500 سال سے زائد عرصے تک حکومت کی جو ایک طویل دور ہے۔ اس طویل عہد میں عباسیوں کے کل 37 حکمران بر سر اقتدار آئے اور ان میں سے کئی قابل وصلاحیتوں کے مالک تھے۔

ابو العباس السفاح (750-754):۔

عبد اللہ بن محمد المعروف ابو العباس السفاح پہلا عباسی خلیفہ بنا۔ مورخین نے اس کی عقل، تدبر اور اخلاق کی تعریف کی ہے لیکن اس کے ظلم وستم نے تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سفاح کے دست راست ابو مسلم خراسانی نے بنی امیہ کا اقتدار ختم کرنے کے لیے 6 لاکھ انسان ہلاک کیے۔ دمشق فتح کر کے عباسی افواج نے وہاں قتل عام کیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سمیت تمام اموی حکمرانوں کی قبریں تک کھود ڈالی گئیں۔ ہشام بن عبد الملک کی لاش قبر سے صحیح سلامت ملی تو اس کو کوڑوں سے پیٹا گیا اور کئی دن سر عام لٹکانے کے بعد نذر آتش کر دیا گیا۔ بنو امیہ کا بچہ بچہ قتل کر دیا گیا اور اموی سرداروں کی تڑپتی لاشوں پر فرش بچھا کر کھانا کھایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین نے ابو العباس کو سفاح (یعنی خونریزی کرنے والا) کا لقب دیا ہے۔

ابو جعفر المنصور (754-775):۔

اگرچہ پہلا خلیفہ ابو العباس تھا لیکن عباسیوں کا پہلا نامور حکمران اس کا بھائی ابو جعفر المنصور تھا جو سفاح کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اس نے 22 سال حکومت کی اور خلافت عباسیہ کی جڑوں کو مضبوط کیا۔ اس نے دریائے دجلہ کے کنارے ایک نیا شہر آباد کر کے دار الحکومت وہاں منتقل کیا جو بغداد کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ابو مسلم خراسانی کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو دیکھتے ہوئے اسے قتل کرا دیا۔

مہدی (775-785):۔

منصور کے بعد اس کا بیٹا محمد مہدی مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ وہ اپنی طبیعت اور مزاج میں باپ سے بہت مختلف تھا۔ نرم دل اور عیش پرست ورنگین مزاج تھا لیکن اس کے باوجود بد کردار نہیں تھا بلکہ ایک فرض شناس حکمران تھا۔ اس کا عہد امن وامان کا دور تھا۔

ہارون الرشید (786-809):۔

ایک یورپی مصور کا فن پارہ، ہارون رشید فرانس کے بادشاہ شارلمین کے بھیجے گئے سفیروں کا خیر مقدم کر رہا ہے۔

مہدی کے بعد اس کا لڑکا ہادی (786-785) تخت خلافت پر بیٹھا لیکن سوا سال کی حکومت کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بھائی ہارون تخت نشین ہوا۔ عباسی خلفاء میں سب سے زیادہ شہرت اسی ہارون الرشید نے حاصل کی۔ اس کے دور میں بغداد اپنے عروج پر پہنچ گیا اور یہ خوشحالی اور علم وفن کا زریں دور تھا۔ وہ متضاد اوصاف کا مالک تھا ایک طرف عیش پرستانہ زندگی کا حامل تھا تو دوسری طرف بڑا دیندار، پابند شریعت، علم دوست اور علما نواز بھی تھا۔ ایک سال حج کرتا اور ایک سال جہاد میں گذارتا۔ اس کے دور میں امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام ابو یوسف کو قاضی القضاۃ مقرر کیا گیا۔ اس نے بیت الحکمت کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس میں کام کرنے والے عالموں اور مترجموں کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ اس کا دور خاندان برامکہ کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے جنہوں نے اپنی عقل وفراست سے ہارون کی سلطنت کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دی۔ ہارون کو خاص طور پر جعفر برمکی سے بڑی محبت تھی جو اس کا قابل وزیر تھا۔ لیکن ہارون نے کسی بات پر اس سے ناراض ہو کر اسے قتل کر دیا۔ اس خاندان کے زوال کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہارون کو ان کے غیر معمولی اختیارات، اثرات اور مقبولیت کی وجہ سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں یہ خلافت پر قابض نہ ہو جائیں۔

مامون الرشید(813-833):۔

ہارون کے بعد اگر کسی اور عباسی خلیفہ کا عہد ہارون کے دور کا مقابلہ کر سکتا ہے تو وہ مامون الرشید کا دور ہے۔ وہ عادات واطوار میں اپنے باپ کی طرح تھا بلکہ وہ ہارون سے بھی زیادہ نرم دل اور فیاض تھا۔ اس کے دور کا اہم واقعہ " فتنۂ خلق قرآن "ہے۔ مامون اس عقیدے کا قائل ہو گیا تھا کہ قرآن مخلوق ہے اور اس نظریے کو اس نے اسلام اور کفر کا پیمانہ سمجھ لیا اور علما کو مجبور کیا کہ وہ اس نظریے کو تسلیم کریں یا پھر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

مامون کا تو جلد انتقال ہو گیا لیکن اس کے دو جانشینوں معتصم (833-842) اور واثق (842-847) کے زمانے میں خلق قرآن کے مسئلے کی وجہ سے علما خصوصاً امام احمد بن حنبل رحمت اللہ علیہ پر بہت سختیاں کی گئیں۔

واثق باللہ(842-847) اور متوکل(847-861) عباسیوں کے عہد عروج کے آخری دو خلفاء تھے جن کے دور کی خاص بات سلطنت کی عسکری طاقت میں اضافہ تھا۔ تاہم متوکل کے بعد خلافت زوال کی جانب گامزن ہو گئی اور ان کی وسیع و عریض سلطنت کی حدود کم ہوتی چلی گئیں۔

کارنامے

تمام عباسی دور کی عظمت و وقار مندرجہ بالا خلفاء کی مرہون منت تھی۔ اس کے علاوہ بھی دیگر حکمران خوبیوں کے مالک تھے جن کی وجہ سے عہد عباسیہ کو تاریخ کا ایک نہایت شاندار دور کہا گیا ہے۔ خصوصاً علمی ادبی اور تہذیب و ثقافت کے حوالے سے یہ دور انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس سے قبل خلفائے راشدین اور بنو امیہ میں فتوحات اور انتظام سلطنت کی طرف زیادہ توجہ دی گئی جس سے ان سرگرمیوں کی جانب توجہ کم رہی۔

اس خاندان کے خلفاء کے اصلی کارنامے انتظام سلطنت اور خصوصی طور پر علمی و تمدنی ترقی کے میدان میں دکھائی دیتے ہیں۔ علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کی ترقی اس دور میں اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی کہ اس کی دوسری مثال اندلس میں بنو امیہ کی حکومت کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔ ان میں دینی اور دنیاوی علوم نقلیہ اور علوم عقلیہ دونوں ہی شامل تھے۔

گو کہ اس خاندان کی حکومت کے دوران کئی انقلابات اور حوادث رونما ہوئے اور خلفاء کی قوت میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ بعد کے خلفاء کا وقار مجروح ہوا لیکن بحیثیت مجموعی اس خاندان کی مرکزی حیثیت قائم رہی۔ اور اس دور میں جب عباسیوں کی حکومت کی حقیقی ساکھ ختم ہو گئی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا پھر بھی عالم اسلام کے کئی حکمران ان کے وفادار رہے۔ تاریخ کا یہ دور مذہبی، تمدنی اور سیاسی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔

زوال کی وجوہات

بنو عباس کے زوال کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ ان کے حکمران نااہل تھے بلکہ سب سے بڑی وجہ ترکوں کا عروج تھا جو معتصم کے زمانے سے اپنے اثر و رسوخ میں اضافہ کر رہے تھے۔ اصل میں عباسیوں کو خلافت دلانے میں بڑا ہاتھ ایرانیوں کا تھا اور عباسیوں نے ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کے اثر ورسوخ کے کم کرنے کے لیے ترکوں کو آگے بڑھایا جو خود ان کے لیے نیک فال ثابت نہ ہوا۔

متوکل کے بعد ترک امراء کا اقتدار اور بڑھ گیا اب وہ خلیفہ کا حکم سننے سے بھی انکار کرنے لگے۔ انہوں نے کئی خلفاء کو اتارا اور بعض کو قتل بھی کیا۔ اس طرح ترکوں نے مرکزی حکومت کو کمزور تو کر دیا لیکن خود کوئی مضبوط حکومت قائم نہ کر سکے۔ اور اس صورت حال میں کئی مقامی امراء نے اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ جن میں قابل ذکر بنی بویہ، سامانی اور فاطمی حکومتیں ہیں۔

زوال کے دور میں قرامطہ کا فتنہ بھی رونما ہوا جنہوں نے 50 سال تک جنوبی عراق اور شام میں ظلم و ستم اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھا۔

دورِ زوال کے اچھے حکمرانوں میں قابل ذکر مہتدی تھا جس نے خلافت کو زیادہ سے زیادہ اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی اور اسی کوشش کے نتیجے میں ترکوں اور اسلامی پابندیوں سے نالاں شاہی حکام اور امراء کی سازشوں کا نشانہ بن کر ترکوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس دور میں سب سے زیادہ خدمات انجام دینے کے حوالے سے قابل ذکر معتضد ہے جو معتمد کے بعد خلافت پر بیٹھا۔ اس نے ترکوں کا زور توڑا اور ایک وسیع علاقے پر دوبارہ امن و امان قائم کر دیا اور حکومت کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دیا۔ اس کے بعد اس کے تین بیٹے مکتفی، معتضد اور قاہر باللہ تخت نشین ہوئے۔ جن میں مکتفی اور

معتضد اچھے حکمران تھے لیکن اس کا جانشیں مقتدر تن آسان، عیش پرست اور شراب و کباب کا رسیا تھا اور بالآخر معزول کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا۔

حکمرانوں کی عیش پرستی، نااہلی اور امرا کی خودسری و اخلاقی زوال کے نتیجے میں خلافت کی حدود پھر گھٹنا شروع ہو گئیں۔ اور بالآخر بنی بویہ کے ایک حکمران معزالدولہ نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ عباسی خاندان بویہی قبضے سے سلجوقیوں کے زیرِ اثر آ گیا۔ یہ حالت دو سو سال تک رہی اس کے بعد عباسی خلفاء پھر آزاد ہو گئے لیکن ان کی حکومت عراق تک محدود رہی اور مزید سو سوا سو سال قائم رہنے کے بعد تاتاریوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

اس میں شک نہیں کہ بعد کے عباسی حکمرانوں نے اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے کام کیا۔ اسلامی قانون کے نفاذ میں دلچسپی لی لیکن اس حکومت کی بھی بنیادی خرابی یہی تھی کہ وہ ملوکیت تھی۔ ان کے ہاتھوں جو انقلاب ہوا اس سے صرف حکمران ہی بدلے، طرز حکومت نہ بدلا۔ انہوں نے اموی دور کی کسی ایک خرابی کو بھی دور نہ کیا بلکہ ان تمام تغیرات کو جوں کا توں برقرار رکھا جو خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت کے آ جانے سے اسلامی نظام میں رونما ہوئے۔ بادشاہی کا طرز وہی رہا جو بنی امیہ نے اختیار کیا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ بنی امیہ کے لیے قسطنطنیہ کے قیصر نمونہ تھے تو عباسی خلفاء کے لیے ایران کے کسریٰ۔

اس طرح عباسیوں کے 500 سالہ عہد کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

دورِ اول (750-861):۔

132ھ سے 247ھ تک یعنی ابو العباس السفاح سے متوکل تک، جس میں 10 حکمران برسرِ اقتدار رہے۔ یہ حکمران غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ابو جعفر، مہدی، ہارون اور مامون جیسے عظیم و باصلاحیت حکمران اسی پہلے دور سے وابستہ تھے۔ اس دور میں تہذیب و ثقافت، علم و ادب اور صنعت و حرفت کی ترقی عروج پر رہی بلکہ اس کی ترقی دنیا کے لیے ایک مثال بن گئی۔ دوسرا پہلو اس دور میں عجمی عنصر کا عروج تھا۔ عربوں کے مقابلے

میں عجمیوں نے اثر ورسوخ حاصل کیا۔ اس دور کے آخری خلفاء نے عجمیوں کے بارے میں اپنی پالیسی بدل دی اور ترکوں کو عروج دیا۔ یہ پہلا دور ایک صدی تک رہا۔

دورِ ثانی (861-1031):۔

یہ 247ھ سے شروع ہو کر 422ھ تک دو صدیوں کا دور ہے۔ خلیفہ منتصر سے لے کر قادر باللہ تک یہ عرصہ خلافت عباسیہ کے دوسرے دور میں شمار کیا جاتا ہے جو زوال کا دور ہے، خلافت کمزور پڑ گئی سلطنت کے اختیارات ترکوں اور پھر امیر الامراء کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ ہر کام حتیٰ کہ خلفاء کی نامزدگی بھی انہی کی مرضی سے ہوتی بلکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق خلفاء کو تخت پر بٹھانے اور اتارنے بھی لگے۔ اس دور میں آل بویہ نے عروج حاصل کیا اور ترکوں کی جگہ لی۔ قادر باللہ کے عہد میں سلجوقیوں ے قدم بڑھائے اور بغداد میں آل بویہ کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا کئی دیگر خود مختار ریاستیں مثلاً سامانی اور صفاری قائم ہیں جنہوں نے سلطنت میں دراڑیں پیدا کر کے اسے کمزور کر دیا۔

دورِ ثالث (1031-1258):۔

تیسرا دور 422ھ سے 656 ھ یعنی قادر باللہ سے مستعصم) آخری حکمران) تک ہے جو سلجوقیوں کے غلبے کا دور ہے۔ خلیفہ کی تمام حیثیت ختم ہو گئی۔ یہ عہد بغداد کی مرکزیت اور سیاسی وحدت کے مکمل خاتمے کا بھی دور ہے۔ تمام اختیارات سلجوقیوں کے ہاتھوں میں تھے اور آخر کار 656 ھ میں ہلاکو خان کے حملے سے عباسیوں کے آخری تاجدار مستعصم باللہ کے اقتدار کا خاتمہ کر کے عباسی خاندان کا چراغ بھی گل کر دیا تھا۔

بحیثیت مجموعی ان تینوں ادوار میں سے ہر دور کی اپنی علیحدہ حیثیت ہے۔ آخری دور میں تمام تر کمزوریوں کے باوجود خلافت کا روحانی لبادہ اور خلیفہ کا مذہبی تقدس بہر حال بر قرار رہا گو کہ سیاسی یکجہتی کا خاتمہ ہو گیا تھا لیکن مذہبی حیثیت موجود رہی۔ خود مختار ریاستوں کے قیام نے بغداد کی مرکزی حیثیت تو ختم کر دی لیکن دنیائے اسلام کے کئی حکمران خلیفہ سے وفاداری کا دم بھرتے تھے۔

سبق نمبر 8

اسلامی فقہ اور فرقہ واریت

فقہ کا لغوی معنی ہے : ''کسی شے کا جاننا اور اُس کی معرفت و فہم حاصل کرنا''۔

لفظ "فقہ" قرآن مجید میں

'' وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُواْ كَآفَّةً فَلَوْلاَ نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُواْ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ''

(اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تا کہ "دین کی فقہ" (سمجھ) حاصل کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو انکو ڈر سناتے تا کہ وہ بھی محتاط ہو جاتے)۔

لفظ "فقہ" حدیث نبوی میں

حدیثِ نبوی ﷺ میں بھی فقہ کا لفظ سمجھ بوجھ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ معاویہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا :۔

''مَنْ يُرِدِ االلهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ۔''(بخاری، الصحیح، کتاب العلم، باب من یرد االله به خیرا یفقهه فی الدین) اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔

نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ"۔(ابن ماجہ، بَاب فَضْلِ الْعُلَمَاءِ وَالْحَثِّ عَلَى طَلَبِ الْعِلْمِ) ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری ہوتا ہے۔

کیونکہ عابد کی عبادت بلا بصیرت ہوتی ہے، اس لیے شیطان کو اسے گمراہی کے گڑھے میں دھکیلنا اور شکوک وشبہات کے جال میں پھانسنا بہت آسان ہوتا ہے؛ جب کہ فقیہ اس کی سازشوں اور چالوں سے واقف ہوتا ہے اور وہ اس کے دامِ فریب میں عام طور پر نہیں آتا ہے۔

لفظ "فقہ" شرعی اصطلاح میں

صاحب الاشباہ والنظائر نے فقہ کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: اسی لیے شرعی اصطلاح میں "فقہ" کا لفظ علمِ دین کا فہم حاصل کرنے کے لیے مخصوص ہے (ابن منظور، لسان العرب، 13 : 522)۔

امام ابو حنیفہ فقہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ۔

الفقه : معرفة النفس، مَالَهَا وما عليها (الزرکشی، المنثور، 1 : 68)۔

فقہ نفس کے حقوق اور فرائض وواجبات جاننے کا نام ہے۔ بالعموم فقہا کرام فقہ کی اصطلاحی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ۔

العلم بالأحكام الشرعية العملية من أدلتها التفضيلية (فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت: 1/13; البحر الرائق: 1/6)۔

احکام فرعیہ شرعیہ عملیہ کو تفصیلی دلائل سے جاننے کا نام فقہ ہے۔

"شرعی احکام" سے مکلف کے افعال پر شریعت کی جانب سے جو حکم اور صفت مرتب ہوتی ہے وہ مراد ہے، جیسے کسی عمل کا فرض، واجب، مستحب یا مباح یا اسی طرح حرام ومکروہ ہونا اور تفصیلی دلائل کا مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ کس دلیل شرعی پر مبنی ہے، کتاب اللہ پر، سنت رسول پر، اجماع پر یا قیاس وغیرہ پر، اسی طرح حکم اور دلیل کے درمیان ارتباط کو جاننا بھی فقہ میں شامل ہے۔

علامہ ابن خلدون نے فقہ کی تعریف میں لکھا ہے: افعال مکلفین کی بابت اس حیثیت سے احکام الٰہی کے جاننے کا نام فقہ ہے کہ وہ واجب ہیں یا محظور، ممنوع وحرام، مستحب اور مباح ہیں یا مکروہ (الموسوعۃ الفق)۔

مندرجہ بالا تعریفات واضح کرتی ہیں کہ فقہ اسلامی سے مراد ایسا علم وفہم ہے، جس کے ذریعے قرآن وحدیث کے معانی واشارات کا علم ہو جائے اور احکامات کی مخصوص دلائل کے ذریعے معرفت حاصل ہو، جیسے نماز کی فرضیت کا علم " اَقِیْمُو الصَّلٰوۃ " کے ذریعے حاصل ہوا، زکوٰۃ کی فرضیت کا علم " اٰتُوا الزَّکٰوۃَ " کے ذریعے حاصل ہوا۔

علم فقہ کا موضوع

مکلّف آدمی کا فعل ہے جس کے احکام سے اس علم میں بحث ہوتی ہے، مثلاً انسان کے کسی فعل کا صحیح، فاسد، فرض وواجب، سنت ومستحب، یا حلال وحرام ہونا وغیرہ (مقدمہ ابن خلدون: 2/341)۔

فقہ کی غرض وغایت

سعادت دارین کی کامیابی اور علم فقہ کے ذریعہ شرعی احکام کے مطابق عمل کرنے کی قدرت کا حصول (شامی، بیروت: 1/120)۔

انسان کی مکمل زندگی میں عقائد، عبادات، معاملات اور معاشرت وغیرہ سے متعلق شرعی احکام ومسائل ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں قرآن، حدیث اور صحابہ وغیرہ کے اقوال میں بکھرے پڑے ہیں، اب ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ میں ہر مسئلہ بلاواسطہ قرآن، حدیث اور آثار صحابہ وغیرہ سے خود ہی تلاش کرلوں گا یہ ایک ناممکن اور بے حد دشوار ہے اس کے ناممکن ہونے کی وجوہات بہت ساری ہیں مثلاً:۔

1۔ انسان کی اپنی اپنی لامتناہی مصروفیات۔

2۔ شریعت کے تمام احکام عربی زبان میں ہیں اور ہر انسان عربی زبان سے واقف نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو اس کے معانی مختلف ہونے کی وجہ سے صحیح معنی تک اس کا پہنچنا دشوار ہوتا ہے۔

3۔ شریعت کے بعض احکام ایسے ہیں جو آیات قرآنی اور احادیثِ صحیحہ سے صراحۃً ثابت ہیں۔ لیکن بعض احکام ایسے ہیں کہ جن میں کسی قدر ابہام و اجمال ہے اور بعض آیات و احادیث ایسی ہیں جو چند معانی کا احتمال رکھتی ہیں اور کچھ احکام ایسے ہیں جو بظاہر قرآن کی کسی دوسری آیت یا کسی دوسری حدیث سے متعارض معلوم ہوتی تو وہاں اجتہاد و استنباط سے کام لینا پڑتا ہے اور خود زبان نبوت سے اس کی تائید و تصویب بھی ہوتی ہے (ترمذی، باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی، حدیث نمبر:1249) اجتہاد و استنباط ہر ایک کے بس کی بات نہیں، ایسے موقع پر عمل کرنے والے کے لیے الجھن اور دشواری یہ پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنا عمل شریعت کے مطابق کیسے بنائے؟ کس پر عمل کرے اور کونسا راستہ اختیار کرے؟ اسی الجھن کی وجہ سے خود صحابہ کرامؓ حضور ﷺ کی موجودگی میں بلاواسطۂ نبی قرآن کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ کچھ خاص صحابہ کرام حضور ﷺ کے پاس جاکر قرآنی تعلیمات مستقل طور پر سمجھا کرتے تھے (الاتقان: الفصل فی شرف التفاسیر، النوع الثامن والسبعون: 2/468)۔

فقہ کا اصل سرچشمہ

یہ بات تو پوری طرح واضح ہے کہ احکام شرعیہ کے استنباط کا اصل منبع کتاب اللہ رہا، اس کے بعد سنت رسول اللہ (ﷺ) پھر قیاس و اجماع، جس کی حقیقی تصویر اس واقعہ میں دیکھی جاسکتی ہے جب کہ حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا قاضی بنا کر رخصت کرتے وقت رسول الثقلین (ﷺ) نے ارشاد فرمایا تھا کہ: کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اپنے فیصلہ کی بنیاد کس کو قرار دوگے؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کتاب اللہ کو۔ آپ نے پوچھا اگر اس میں کسی کا حل نہ مل سکے تو؟ فرمایا: احادیث سے فیصلہ کروں گا۔ آپ نے پھر دریافت فرمایا: کہ اگر وہاں بھی نہ ملے تو؟ اخیر میں کہا کہ اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا اور حق کی جستجو میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا (ابوداؤد: ۵۰۵/۲)۔

آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کے مزاجِ دین اور مزاجِ شریعت سے ہم آہنگی اور آگہی پر خوشی کا اظہار کیا اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس سے اس کا رسول راضی ہے۔

اسی طرح اسی کی ہم شکل تصویر آپ کے وصال کے بعد مسئلہ خلافت سے جھلکتی ہے جو کہ صحابہؓ کے اجماع سے حل ہوا، اسی کے ساتھ اس حقیقت کی حیثیت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ درس نبوی کے سب سے پہلے مدرسہ کا پہلا معلم، جن کے اخلاق واعمال نبی کے بالکل مشابہ حضرت ابن مسعودؓ جن کو نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیات طیبہ ہی میں درس و تعلیم کی اجازت دے دی تھی اور صحابہؓ کو حکم فرمایا کہ قرآن وحدیث اور مسائل ابن مسعودؓ سے حاصل کرو (تذکرۃ الفنون، ص: ۴۶)۔

یہی وجہ ہے کہ آپؓ کا فقہی طریقہ کار بے حد مقبول ہوا بعد میں یہی "فقہ حنفی" کی شکل میں ابھر کر پورے عالم میں پھیل گیا۔ مذکورہ سطور سے پوری حقیقت سامنے آگئی کہ عمارتِ فقہ کی خشت اول کتاب اللہ ہے پھر حدیث، قیاس اور اجماع۔ اور فقہ کی بنیاد بھی عہد نبوی ہی میں رکھی جاچکی تھی۔

فقہ اسلام کا ارتقاء

فقہ وفتاویٰ کی بنیاد تو عہد رسالت ہی میں پڑ چکی تھی اور اسی زمانے میں خود ایوانِ رسالت سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا مدینہ منورہ میں منصب افتا پر فائز ہونا بھی تاریخ بتاتی ہے (نظام الحکومۃ النبویہ ۵۷/۱ بحوالہ تدوین قانونِ اسلامی، ص: ۱۳)۔

قرنِ اوّل میں جہاں امور دینیہ ودنیویہ کو حل کرنے کے لئے انفرادی واجتماعی غور وفکر ہوتا تھا وہیں اجتماعی اور شورائی اجتہاد کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں اس مقصد کے لیے اکابر صحابہؓ اور فقہائے صحابہؓ کی ایک مستقل مجلس قائم رکھی تھی۔ تابعین کے دور میں بھی مدینہ کے فقہائے سبعہ کی ایسی ہی مثالیں ملتی ہیں، یہ اس زمانہ کا سب سے بڑا اور لائق اعتبار دارالافتاء تھا، (فقہ اسلامی اصول، خدمات اور تقاضے، ص: ۵-۶)۔

فقہ اسلامی یا قانونِ اسلامی کی تدوین اور طریقہ کار

تدوین وترتیب کا باضابطہ سلسلہ اموی دور سے شروع ہوا، اور عہد عباسی کی ابتدا سے مختلف علوم وفنون کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ چنانچہ اسی زمانے میں فقہ کو فن کی حیثیت حاصل ہوئی۔ علماء تاریخ فقہ کو چار دور میں تقسیم کرتے ہیں، پہلا دور اس کی نشو ونما اور ابتداء کا ہے جس کا سلسلہ ۱۰ھ تک جاری

رہا، دوسرا دور اس کی وسعت کا ہے جس کی مدت عہد صحابہؓ سے ۴۱ھ تک رہی ہے، تیسرا دور اس کی پختگی و کمال اور تدوین کا ہے جو صغار صحابہؓ کے دور سے دوسری صدی ہجری کی ابتدا تک رہا ہے اور چوتھا دور چوتھی صدی ہجری کے تقریباً نصف تک رہا۔ یہ وہ دور ہے جس کے بعد فقہ اسلامی کا دورِ تقلید شروع ہو جاتا ہے، اور عہد نبوی سے بُعد کی بنا پر لوگوں میں اسلاف جیسی فقاہت اور فقہ اسلامی میں درک و کمال باقی نہیں رہتا ہے، اس لیے عام طور پر لوگ ائمہ اربعہ کے فقہی مکاتب کے پیرو ہو جاتے ہیں(فقہ اسلامی اصول، خدمات اور تقاضے، ص: ۱۸)۔

یوں تو طلوع اسلام کے ساتھ ہی فقہ اسلامی کا آغاز ہو گیا تھا؛ لیکن چوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جس میں لوگ انتہائی سادہ، اور ضروریات محدود تھیں، اسی وجہ سے فقہائے صحابہؓ کی توجہات اس کی تدوین کی طرف مبذول نہ ہو سکیں، پھر حالات کے تقاضے کے پیش نظر فقہائے مدینہ نے تدوین فتاویٰ کی داغ بیل ڈالی اور فقہائے کوفہ نے فتاویٰ و قضایا کے جمع و ترتیب پر زور دیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نخعیؒ نے ایسے فتاویٰ اور ان کے مبادیات کو ایک مجموعہ کی شکل میں جمع کیا تھا، اسی طرح حضرت امام ابو حنیفہؒ کے پاس اور حمادؒ کے پاس بھی ایک مجموعہ تھا(امام ابو حنیفہؒ عہد و حیات، فقہ و آراء ص: ۳۳۷۔۳۸، بحوالہ فقہ اسلامی اصول، خدمات اور تقاضے، ص: ۱۹)۔

عہد رسالت کے بعد جب اسلام کی حدود بہت بڑھ گئیں، قیصر و کسریٰ کی حکومتیں اسلام کے زیر نگیں ہو گئیں، یورپ میں اندلس تک افریقہ میں مصر اور شمال افریقہ تک اور ایشیا میں ایشیائی ترکستان اور سندھ تک اسلام پھیل گیا تو اسلام کو نئے تمدن، نئی تہذیب اور نئی معاشرتوں سے سابقہ پڑا ''وسائل اور مسائل کی نئی نئی قسمیں پیدا ہو گئیں تو تابعین کے آخر عہد میں علمائے حق کی ایک جماعت نے (امام ابو حنیفہؒ کی قیادت میں) کتاب و سنت کو سامنے رکھ کر اس کے مقرر کردہ قوانین و حدود کے مطابق ایک ایسا ضابطہ حیات مرتب کرنا چاہا جو ہر حال میں مفید، ہر طرح مکمل اور ہر جگہ قابل عمل ہو''(تاریخ علم فقہ، ص: ۸، از ڈاکٹر حمید اللہ)۔

فقہ کی باضابطہ تدوین

فقہ کی باضابطہ تدوین کا شرف سب سے پہلے جس شخصیت کو حاصل ہوا، وہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی ذات والاصفات ہے؛ اسی لیے امام شافعیؒ نے فرمایا:۔

"مَنْ أَرَادَ الْفِقْهَ فَهُوَعِيَالٌ عَلَى أَبِي حَنِيفَةَ"(الانتقاءلابن عبد البر:210)۔

اس کا اعتراف تمام ہی منصف مزاج علمانے کیا ہے، حافظ جلال الدین سیوطیؒ، شافعیؒ فرماتے ہیں:

امام ابو حنیفہؒ پہلے شخص ہیں؛ جنھوں نے علم شریعت کی تدوین کی اور اسے باب وار مرتب کیا؛ پھر مؤطا کی ترتیب میں امام مالکؒ نے انھیں کی پیروی کی، امام ابو حنیفہؒ سے پہلے کسی نے یہ کام نہیں کیا۔

علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:"إِنَّهُ أَوَّلُ من دون عِلْمِ الْفِقْهَ وَرَتَّبَهُ أَبْوَابًا وَكُتُبًا عَلَى نَحْوِ مَاهُوَعَلَيْهِ الْيَوْمَ، وَتَبِعَهُ مَالِكٌ فِي مُؤَطائه"(الخیرات الحسان:28)۔

امام ابو حنیفہؒ پہلے شخص ہیں؛ جنھوں نے علم فقہ کو مدون کیا اور کتاب اور باب پر اس کو مرتب فرمایا، جیسا کہ آج موجود ہے اور امام مالک نے اپنی مؤطا میں انھیں کی اتباع کی ہے۔

پھر اہم بات یہ ہے کہ امام صاحبؒ نے دوسرے فقہا کی طرح انفرادی طور پر اپنی آراء مرتب نہیں کی؛ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح شورائی انداز اختیار کیا؛ چنانچہ علامہ موفق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "فوضع ابوحنيفة مذهبه شورىٰ بينهم لم يستمد بنفسه دونهم"(مناقب ابو حنیفہ:2/133)۔

امام ابو حنیفہ نے اپنا مذہب شورائی رکھا، وہ شرکاءِ شوریٰ کو چھوڑ کر تنہا اپنی رائے مسلط نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ بعض اوقات ایک مسئلہ پر ایک ماہ یا اس سے زیادہ بحث ومباحثہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

چنانچہ امام صاحب نے اپنے ایک ہزار شاگردوں میں سے چالیس کو منتخب کر کے دنیا کی بے نظیر شورائی طرز کی ایک مجلس تدوین فقہ قائم کی(تذکرۃ الفنون، ص: ۴۸)۔

جس کے اندر یوسف وزفر جیسا قیاس اور صاحب بصیرت، یحییٰ بن زائدہ، حفص بن غیاث، حبان جیسا ماہر حدیث، قاسم بن معن جیسا ماہر لغت، داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسا زہد وورع کا پیکر موجود تھا گویا یہ مجلس ہر علم وفن کے ماہروں سے مزین تھی۔

طریقہ تدوین پر روشنی ڈالتے ہوئے امام شعرانیؒ کے حوالے سے مفتی ظفیر الدین صاحب لکھتے ہیں کہ "جب کوئی واقعہ (مسئلہ) آپڑتا تو امام ابو حنیفہؒ اپنے تمام اصحابِ علم وفن سے مشورہ، بحث ومباحثہ اور تبادلہ خیال کرتے، پہلے ان سے فرماتے کہ جو کچھ ان کے پاس حدیث اور اقوالِ صحابہؓ کا ذخیرہ ہے وہ پیش کریں پھر خود اپنا حدیثی ذخیرہ سامنے رکھتے اور اس کے بعد ایک ماہ یا اس سے زیادہ اس مسئلہ پر بحث کرتے تا آنکہ آخری بات طے پاتی اور امام ابو یوسفؒ قلم بند کرتے اس طرح شورائی طریقے پر سارے اصول منضبط ہوئے ایسا نہیں ہوا کہ تنہا کبھی کوئی بات کہی ہو"۔ (مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم، ص: ۶۸، مناقب امام ابو حنیفہؒ ص: ۵۷ بحوالہ فقہ اسلامی اصول، خدمات اور تقاضے)۔

یہ اسی قانونِ اسلامی کی جامعیت ووسعت ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی کا یہ عہد جدید اور مستقبل کا کوئی بھی ترقی یافتہ اور عصری تمدن اپنے مسائل و معاملات کے لیے اس کا دامن تنگ نہیں پاسکتا (فقہ اسلامی، ص: ۳۲۰)۔

ڈاکٹر حمید اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ: "ان مباحث میں تقریباً پانچ لاکھ مسئلے مرتب ہوئے جن میں اڑتیس ہزار کا تعلق عبادات سے اور باقی کا معاملات سے تھا" (تدوین قانونِ اسلامی، ص: ۳۸) اور یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین ہونی چاہئے کہ اس مجلس میں محض انھیں مسائل پر بحث ومباحثہ ہوا کرتے تھے جن سے قرآن وحدیث ساکت تھے نہ کہ ان مسائل پر جن کی قرآن وحدیث میں پوری وضاحت ہے۔

فقہ اسلامی کی اہمیت اور اس کا مقام

علوم اسلامیہ میں فقہ کو جو حیثیت اور مقام حاصل ہے وہ سورج سے بھی زیادہ روشن اور واضح ہے اس لیے کہ یہ علم زندگی سے مربوط اور انسانی شب و روز سے متعلق وہم رشتہ ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام کا نظامِ قانون بنیادی طور پر جن پاکیزہ عناصر سے مرکب ہے وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ ہیں، جو اسلامی شریعت کے مرکزی مصادر و مآخذ ہیں، فقہ و قانون کی دنیا میں اسلامی نظامِ قانون، عدل وانصاف، توازن واعتدال، غلو وتشدد سے

اجتناب اور جامعیت وافادیت جیسی امتیازی صفات کے لیے شہرت ومقام رکھتا ہے، اس کی وسعت وگہرائی، سہولت پسندی، حیرت انگیز بے ساختگی، لچک اور انسانی فطرت سے ہم آہنگی تمام حقیقت پسندوں کے یہاں مسلم ہے، جس کا دائرہ عمل پیدائش سے میراث تک اور عقائد سے لے کر معاملات و سیاست وغیرہ امور تک محیط ہے، بلکہ علوم نبویہ کے امین اور کاتبِ رسول سیدنا حضرت علیؓ کے بقول: "فقہ، طریقۂ زندگی کا رہنما ہے" (فقہ اسلامی، ص: ۳۲۰)۔

اسی لیے تاریخ کے ہر دور میں اس فن پر زمانہ کی بہترین ذہانتیں صرف ہوتی رہیں۔ اسی کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مفتی ظفیر الدین صاحب اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ "فقہ وفتاویٰ ایسا فن ہے جس سے کسی کو بھی مفر نہیں اس لیے کہ انسانی زندگی میں جس قدر واسطہ اس فن اور اس کے اصول وجزئیات سے پڑتا ہے اور جس قدر آئے دن کے مسائل کا جواب یہاں ملتا ہے کہیں اور سے ممکن نہیں" (مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم، ص: ۷۸)۔

اس کے غیر معمولی حیثیت کا اندازہ مولانا سعید احمدؒ اکبر آبادی کی اس تحریر سے بھی ہوتا ہے کہ "مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا اصل سبب ہے اس لچک کی عملی اور قانونی تشکیل جو اسلام میں ایک عالمگیر مذہب ہونے کی حیثیت سے موجود ہے" ("ماہنامہ برہان" دہلی، فروری ۱۹۴۵/، ص:۸۲) یہ معلوم ہو چکا کہ فقہ دراصل قرآن ہی کی عملی تفسیر ہے۔ جیسا کہ جناب سرور صاحب مولانا عبد اللہ سندھیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "مولانا کے نزدیک اسلامی فتوحات کے بعد قرآن کے قانون کو چلانے کے لیے فقہا کے مختلف مذاہب اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے معرضِ وجود میں آئے" (ایضاً فروری ۱۹۴۴/)۔

فقہ کی آفاقیت اور فقہاء کی عبقریت نیز خلوص وللّٰہیت کے سوا اسے کیا کہا جاسکتا ہے کہ امت محمدی کے اساطین، متبحرین اور علم کے پہاڑوں نے نہ صرف یہ کہ اس فن کی تائید کی بلکہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، اور اسے اپنی پلکوں پہ سجانے میں سعادت مندی سمجھی۔ چنانچہ فقہ کی عظمت کو چار چاند لگاتے ہوئے علامہ انور شاہؒ کشمیریؒ اس طرح گویا ہیں کہ "ہر علم وفن میں اپنی مخصوص رائے رکھتا ہوں، کسی کا مقلد نہیں باستثنائے فقہ کہ اس میں میری کوئی رائے نہیں، ابو حنیفہ کی تقلید کرتا ہوں" (نقشِ دوام، ص: ۴۴۱)۔

اس پتھر کی لکیر سے جہاں علم فقہ کی کاملیت واہمیت کا پتہ چلتا ہے وہیں فقہ حنفی کے ذریعے کتاب وسنت کی حفاظت وپاسداری میں منشائے خداوندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

یوں تو فقہ کی اہمیت وافادیت انسانی زندگی کے ایک ایک لمحہ سے عیاں ہے، اور اس کا تفوق نہ صرف یہ کہ دیگر علوم اسلامیہ ہی پر ہے، بلکہ اس کا مقام و مرتبہ عبادت سے بھی بڑھ کر ہے جس کی حسین منظر کشی یوں ہوتی ہے کہ "حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک فقیہہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے" (مشکوٰۃ) مذکورہ بالا سطور سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوگئی کہ فقہ کی وہی اہمیت ہے جو کتاب وسنت کی، اس لیے کہ شربت بھی چینی اور پانی ہی کا نام ہے، اگر کتاب وسنت گلشن وگل ہیں تو فقہ انھیں کی عمدہ اور من موہک خوشبو۔

ایک ضروری وضاحت

یوں تو بہت سے فقہی مکاتب وجود میں آئے، لیکن مستقل حیثیت چار ہی کو حاصل رہی اور آج بھی دنیا کے تمام مقلدین انھیں چار میں منحصر ہیں، ان میں بھی ہر طرح سے اولیت کا درجہ فقہ حنفی کو ہی حاصل رہا کیونکہ دیگر ائمہ مجتہدین اور ان کے اجتہادات کو بھی امام ابو حنیفہؒ کے اجتہاد ہی کا ایک حصہ کہا جاسکتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ آپ کے اندر کئی ایسی خصوصیات ہیں جو آپ کو دوسرے ائمہ سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان میں سے اہم شرفِ تابعیت اور آپ کی حیرت انگیز ذہانت ہے، یہی وہ اسباب ہیں کہ جہاں دنیا کے ایک بڑے طبقے نے آپ کی پیروی کی۔

حدیث کا علم اور اس سے شغف جتنا ایک محدث کو ہوتا ہے اتنا ہی ایک فقیہہ کو بھی، اگر محدثین کا الفاظِ احادیث پر زیادہ زور رہتا ہے تو فقہاء کے یہاں ان کے معانی پیش نظر رہتے ہیں۔ چنانچہ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ "فقہ سہل الحصول کے ساتھ ساتھ حدیث کا ہی ثمرہ ہے اور آخرت میں فقیہ کا ثواب محدث کے ثواب سے کم نہیں ہے" (تہذیب الکمال ۴۶۴/ ۲۴ بحوالہ غیر مقلدین امام بخاری کی عدالت میں، ص: ۹۹)۔

اور یہی نہیں کہ حدیث وفقہ میں انتہائی گہرا ربط ہے بلکہ امام اعمشؒ تو یہاں تک کہہ گئے کہ "اے فقیہو! آپ لوگ طبیب ہیں، اور ہم دوافروش ہیں" (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ، ص:۳، الفقہ والمتفقہ بغدادی ۷۴/ ۲، مناقب ابی حنیفہ ذہبی، ص:۲۱ بحوالہ ائمہ اربعہ، ص:۴۵)۔

فقہاء مشکل احادیث کو اپنی قیاسات واجتہادات سے حل کرنے کی بنا پر اہل الرائے سے جانے گئے۔ چنانچہ علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ ''محدثین اصحاب قیاس کو اصحاب الرائے کہتے ہیں اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ مشکل احادیث کو اپنی رائے اور سمجھ سے حل کرتے ہیں''۔(مقام ابو حنیفہ از سر فراز خان صفدر، ص: ۱۶۰ بحوالہ مقدمہ تحفۃ الاحوذی، ص:۲۶۰ ونہایہ ۱۷۹/۲)۔

ہوائی جہاز وٹرین میں نماز کا کیا حکم ہے؟ ٹیلی فون اور انٹرنیٹ پر نکاح ہو جائے گا کہ نہیں؟ وغیرہ وغیرہ... اور ان کا جواب یا تو قرآن سے یا صحیح وصریح احادیث سے نہیں ملے گا بلکہ ہمیں ان میں فقہ کی حاجت ہو گی۔

فقہ: ضرورت اور تقاضے

یہاں آکر ذہن میں ایک خلش پیدا ہو سکتی ہے کہ آخر قرآن وحدیث کے رہتے ہوئے فقہ کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب وسنت کے نصوص میں احکام کا دائرہ محدود ومتناہی ہے، اس کے برخلاف حوادثِ زمانہ غیر محدود اور لامتناہی ہیں، آئے دن نئے نئے مسائل اور مشکلات جنم لیتے رہتے ہیں، اب اگر قرآن وحدیث کے نصوص میں غور وفکر کر کے ان مسائل کا حل تلاش نہ کیا جائے تو یہ شریعت محمدی بالکل جامد ومعطل ہو کر رہ جائے گی، اس میں زمانے کے بدلتے ہوئے حالات وتغیرات کو اپنے اندر سمونے کی گنجائش نہیں رہے گی، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی ہوئی یہ شریعت کامل ومکمل ہے اور قیامت تک کی انسانیت کے لیے آخری شریعت ہے۔ انھیں باتوں کے پیش نظر خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے ایک چراغِ راہ کی ضرورت پڑی کہ جس کی روشنی میں انسان بآسانی منزل مقصود تک پہنچ سکے، اسی مشعل راہ کو ''فقہ'' کہا جاتا ہے۔ اللہ ان ائمہ مجتہدین کا بھلا کرے جنھوں نے ہمیں اپنی منزل کا نشان بتایا، اب ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم ان کی دی ہوئی روشنیوں کے ذریعے ساحل مراد تک رسائی حاصل کریں، خاص طور پر دورِ حاضر میں جب کہ ہر طرف جدید ٹیکنالوجی کی صدائیں گونج رہی ہیں اور لوگوں کیلئے راہ راست سے پھسلنے کے بے شمار اسباب مہیا ہیں، اس فن کے تئیں دوہری ذمہ داری آجاتی ہے۔

چنانچہ مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''فقہ اسلامی میں ہمارے اس زمانے کی بیشتر ضروریات کا حل موجود ہے، لیکن جدید تمدن اور صنعتی انقلاب نے اس زمانے میں نت نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ معاملات، معاشیات اور اقتصادیات کے سلسلے میں سینکڑوں ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جو حل طلب

ہیں اور علمائے امت کو دعوتِ فکر دے رہے ہیں کہ وہ فقہ اسلامی کی روشنی میں ان کا حل پیش کر دیں"(سرورق: فقہ اسلامی اصول، خدمات اور تقاضے)۔

اسلامی فقہ کے ماخذ

ماخذ کا معنی حاصل کرنے اور پانے کی جگہ یا ذریعہ ہے۔ اسلامی فقہ کے چار بنیادی ذرائع ہیں جہاں سے کوئی فقیہ یا مجتہد مسائل شرعیہ کو اخذ کرتا ہے ان کی ترتیب درج ذیل ہے: ۔

الف... قرآن حکیم

ب... سنت

ج... اجماع

د... قیاس

قرآن کریم

فقہ اسلامی کا سب سے پہلا ماخذ اور دلیل قرآن حکیم ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری الہامی کتاب ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیمات پر عمل کرنا دنیا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ ہے۔ یہ ایک مکمل اور جامع کتابِ ہدایت ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے کے لیے رہنمائی عطا کی گئی ہے۔ ایک مجتہد یا فقیہہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام مسائل کو قرآن حکیم کے بیان کردہ بنیادی اصولوں کے ذریعے حل کرے۔

سنت

قرآنِ حکیم کے بعد فقہ اسلامی کا دوسرا بنیادی ماخذ سنت ہے۔ اس کا اطلاق حضور نبی اکرم ﷺ کے قول (جو آپ ﷺ نے فرمایا)، فعل (جو آپ ﷺ نے کیا) اور ہر اس کام پر ہوتا ہے جس کی آپ ﷺ نے اجازت عطا فرمائی۔ اس لحاظ سے سنت کی تین اقسام بنتی ہیں: ۔

الف... سنت قولی

ب... سنت فعلی

ج... سنت تقریری

اجماع

قرآن و سنت کے بعد فقہ اسلامی کا تیسرا بنیادی ماخذ "اِجماع" ہے۔ اجماع کا لغوی معنی ہے : پکا ارادہ اور اتفاق۔ (اَبو حبیب، القاموس الفقھی : 66) اصطلاحی طور پر اس کا معنی ہے : کسی زمانے میں اُمت محمدیہ کے مجتہدین کی رائے کا کسی شرعی مسئلے پر متفق ہو جانا۔ (ابن عابدین شامی، رد المختار علی الدر المختار، 6 : 762) اجماع قرآن و سنت کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر نہیں بلکہ ان سے رہنمائی لے کر کیا جاتا ہے اور جب اجماع کو قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ مضبوط کر دیا جائے تو یہ قطعی حکم بن جاتا ہے جس پر عمل کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

قیاس

قیاس کا لغوی معنی ہے :۔ اندازہ کرنا، کسی شے کو اس کی مثل کی طرف لوٹانا۔ جب کسی ایک شے کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے رکھ کر ان کا موازنہ کتاب و سنت میں موجود کسی امر شرعی کے ساتھ کیا جائے اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچا جائے تو یہ عمل قیاس کہلاتا ہے گویا کسی علت یا سبب کو بنیاد بنا کر کسی سابقہ حکم کی روشنی میں نئے مسائل کا حل نکالنا قیاس ہے۔ جیسے شراب کا حکم قرآن اور سنت میں موجود ہے کہ یہ حرام ہے اور اس کی علت نشہ آور ہونا ہے۔ اب ہیروین یا دیگر نشہ آور اشیاء کو علت مشترکہ کی بنیاد پر شراب کے حکم میں شامل کیا جائے گا۔

اسلامی قانون کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ عرف (رواج) بھی ہے جو ایک مخصوص دائرے میں معتبر ہے اور اس کا معتبر ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور فقہانے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ مصلحت بھی ہے اور اس کا بھی ایک خاص دائرہ ہے اور ہمارے فقہانے بھی اس کو تسلیم کیا ہے (امین احسن اصلاحی، اسلامی قانون کی تدوین)۔

شریعت کے ثانوی مصادر

قول صحابی

پچھلی شریعت

سد ذرائع

استصحاب

عرف ورواج

استصلاح

استحسان

اسلام اور فرقہ پرستی

قرآن وسنت میں اتحاد امت کو حسن قرار دیا گیا ہے اور تفرقہ بازی میں پڑنے سے منع کیا گیا ہے جو اجتماعیت کو چھوڑ دیتا ہے اس کو تنبیہ کی گئی ہے۔ نیز اتفاق واتحاد کو محمود قرار دیا گیا ہے اور اختلاف وانتشار کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔ اس وقت جس بات کی اشد ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ ایسے فکری اور ذہنی اختلافات جو عملی نزاعات کا باعث بنتے ہیں ان کو کیسے حل کیا جائے تاکہ امت مسلمہ وحدت کی طرف گامزن ہو سکے۔

اختلاف کا واقعہ ہو جانا ایک فطری امر ہے لیکن اختلاف کی صورت میں دوسرے فریق کو غلط سمجھنا اور سبّ و شتم کا نشانہ بنانا اور اس کے خون اور جان تک کو حلال سمجھنا اسلام میں روا نہیں ہے کیونکہ اختلاف رائے کا حق ہر کسی کو حاصل ہے، اخلاق کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے دوسرے کی بات کو سننا چاہیئے اور اس کی عزت و وقار کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو کامیابی کی کسوٹی قرار دیا ہے، جس میں زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں وافر معلومات ملتی ہیں۔ شریعت کے بعض احکامات بالکل واضح ہیں جن میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے جنہیں مقطعات کہا جاتا ہے، البتہ بعض احکامات بالکل واضح نہیں ہیں بلکہ ان کے بارے میں مختلف اقوال ہیں اور اسی طرح بعض احکام قیاس پر مبنی ہیں۔ ایسے احکامات میں مجتہدین کی طرف احتیاج ہوتی ہے اور مجتہدین کے اس بارے میں مختلف اقوال ہو سکتے ہیں۔

آج امت مسلمہ جن مسائل سے دوچار ہے ان میں سے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ امت مسلمہ جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم ہو چکیں ہے اور یہاں پر بس نہیں بلکہ اختلافات اس قدر بڑھے کہ وہ آپس میں دست و گریبان ہیں، آپس میں اختلاف کرنے والے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ حالانکہ اختلاف فطری چیز ہے جو سلف میں بھی پایا جاتا تھا لیکن ان کے دل ایک دوسرے کے بارے میں شیشے کی طرح صاف تھے اور اختلاف کو ذاتی مسائل کی طرف نہ لے جاتے تھے۔

امت اسلامی کے اتحاد اور یکجہتی، اور ہم آہنگی، ربط اور تنازعات اور اختلافات کو جڑ سے اکھاڑ دینا، جائز مطالبات کی ایک اہم ضرورت، اور اسلام کے احکام کی ذمہ داری، اور فرائض کی ذمہ داری کے تمام مضامین، ضروری چیزوں میں سے ضروری چیز جس کا اللہ تعالیٰ نے مومن بندوں کو مکلف بنایا کہ ان کے لئے مومن ہونے کی صورت میں بھائی چارہ ان کے لئے ناگزیر ہے۔ اللہ تعالی اپنی عظیم کتاب میں فرماتا ہے:۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهِ ولا تَمُوتُنَّ إلاّ وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ o وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ “(سورة آل عمران3: 103)۔

(اے ایمان والوں اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں مسلمان ہونے کی ہی حالت میں موت آئے اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کی رسی کو سب (مل کر) اور تفرقے میں نہ پڑو اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو اس نے) تم پر کی جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے الفت ڈال دی تمہارے دلوں میں تو تم ہو گئے اس کی نعمت (مہربانی) سے بھائی بھائی اور تم (کھڑے) تھے آگ کے گڑھے کے کنارے پر تو اس نے بچالیا تمہیں اس (دوزخ) سے اسی طرح اللہ بیان کرتا ہے تمہارے لیے اپنی آیتیں تاکہ تم ہدایت پا جاؤ)۔

اس آیت مبارکہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ حبل اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقے سے بچو۔ جس معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے لئے" تفرقہ سے بچو" امت مسلمہ کے ہر فرد پر واجب ہے کہ وہ متحد رہنے کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر اتحاد کے لئے عملی اقدامات کریں۔ جس طرح" **اعتصموا**" فعل امر ہے اور وجوب پر دلالت کرتا ہے اسی طرح" **ولا تفرقوا**" فعل نہی ہے جو حرمت پر دلالت کرتا ہے یعنی جس طرح وحدت ایجاد کرنا واجب ہے اسی طرح تفرقہ حرام ہے۔

قرآن کریم میں بہت ساری آیات ایسی بیان کی گئی ہیں جن میں مومنوں کی جماعت کو لازم پکڑنے اور آپس میں محبت پر ابھارتی ہیں اور یہ بیان کرتیں ہیں کہ امت اسلامیہ امت واحدہ ہیں اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی تاکید قرآن کریم کی اکثر آیات میں آئی ہے۔

اسی میں سے اخوت ایمانی پر ابھارنا ہے اور نیکی اور تقوی کے کاموں میں تعاون کا حکم دینا ہے، علماء نے مسلمانوں کے اجتماع اور ان کو اکٹھا کرنے کے لئے ان آیات کا استنباط کیا ہے۔ جماعت کے لزوم کا وجوب قران کریم میں سورۃ آل عمران کی آیت 102، 103 میں ذکر کیا گیا ہے:۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ * وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلا تَفَرَّقُوا" ۔

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہاری موت ایمان کی حالت میں آئے، اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ بازی میں نہ پڑو)۔

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کے قول {وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا} میں مراد "جماعت" ہے۔

عن عبد الله بن مسعود أنه قال في قوله:"واعتصموا بحبل الله جميعا"، قال: الجماعة.(أبو جعفر الطبري ،مُحَمَّد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي، (المتوفى: 310هـ)،جامع البيان في تأويل القرآن،المحقق: أحمد مُحَمَّد شاكر،مؤسسة الرسالة، مكتبہ شاملہ،الطبعة: الأولى، 1420 هـ - 2000 م،عدد الأجزاء: 24،ج7،ص71)۔

فرقہ واریت سے منع کرنے کے لئے ڈر بھی سنایا گیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

"**وَلاَ تَكُوْنُوا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَأُولٰـئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عظيمٌ**"(آل عمران105/3)۔

(اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جو فرقہ بندی کا شکار ہوئے اور واضح دلائل آجانے کے بعد آپس میں جھگڑا کیا اور ان لوگوں کے لئے بہت بڑا عذاب ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو فرقہ واریت میں پڑنے اور اختلاف میں پڑنے سے منع کیا اور اس پر دلیل قائم کی کہ وہ قومیں اپنے اس کام کی وجہ سے دردناک عذاب کی مستحق ہو گئی، اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے، دینی وحدت اور ایمانی بھائی چارہ آج امت مسلمہ کی حقیقت ہے، اسی وجہ سے اس کی طرف تاکیدی طور پر دعوت دی گئی اور ہر اس کام سے منع کر دیا کیا جو وحدت کے کڑے کو توڑ دے اور امت کو فرقہ واریت کا شکار اور آپس میں دست و گریبان کر دے اور رعب اور ہیبت سے محروم کر دے اور سیلاب کے جھاگ کی طرح ہو جائیں جو آج کل امت مسلمہ کو درپیش ہے۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے وہ حضور ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:۔

"**الجماعةُ رحمةٌ والفرقةُ عذابٌ**"(الشيباني، أبو عبد الله أحمد بن مُحَمَّد بن حنبل بن هلال بن أسد (المتوفى: 241هـ)، مسند الإمام أحمد بن حنبل،المحقق: أحمد مُحَمَّد شاكر(دار الحديث - القاهرة،مكتبہ شاملہ،الطبعة: الأولى، 1416 هـ - 1995 م،عدد الأجزاء: 8 (القسم الذي حققه أحمد شاكر)ج4، ص278)۔

(جماعت رحمت ہے اور فرقہ واریت اور جماعت بندی عذاب ہے)۔

حضور ﷺ نے فرقہ واریت اور جماعت بندی اور آپس کے جھگڑے سے اتنا زیادہ ڈرایا ہے اس سے زیادہ کسی چیز سے نہیں ڈرایا ہے اس طور پر کہ اس کو کفر تک پہنچانے والی چیزوں میں سے شمار کیا ہے اس لئے کہ فرقت کو اختیار کرنے والے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کا بھی انکار کر دیتا ہے، اللہ کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے، ہمیشہ کے لئے اللہ کی مغفرت اور رضا سے محروم ہو جاتا ہے۔

حضور ﷺ اس روایت میں جو حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں:۔

" من فَارَقَ الجماعةَ شبرًا، خَلَعَ رَبقَةَ الإسلام من عنقه"(الشيباني، أبو عبد الله أحمد بن مُحَمَّد بن حنبل بن هلال بن أسد (المتوفى: 241هـ)، مسند الإمام أحمد بن حنبل،المحقق: أحمد مُحَمَّد شاكر(دار الحديث ـ القاهرة،مكتبه شامله،الطبعة: الأولى، 1416 هـ ـ 1995 م،عدد الأجزاء: 8 (القسم الذي حققه أحمد شاكر) ج5، ص180)۔

(جس نے جماعت کو ایک بالشت بھی چھوڑا اس نے اسلام کا پٹا اپنے گلے سے اتار دیا)۔

ایک روایت میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرمارہے تھے:۔

" مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ، وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ، مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً"(مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري (المتوفى: 261هـ)، المسند الصحيح المختصر بنقل العدل عن العدل إلى رسول الله ﷺ،المحقق: مُحَمَّد فؤاد عبد الباقي،فَمَنْ قَالَ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، فَقَدْ عَصَمَ مِنِّي مَالَهُ، وَنَفْسَهُ،،الناشر: دار إحياء التراث العربي ـ بيروت،عدد الأجزاء: 5،ج3،ص1476،حديث نمبر1848)۔

(جس شخص نے اطاعت کو چھوڑ دیا اور جماعت سے الگ ہوا وہ مرا تو جاہلیت کی طرز پر مرا)۔

ایک اور مقام پر حضور ﷺ نے فرمایا:۔

"ألا أخبِرُكُم بأفضَلَ من درجةِ الصِّيامِ والصَّلاةِ والصَّدَقَة ؟ " قالوا: بَلَى يا رسولَ الله ـ ﷺ ـ قال: "إصلاحُ ذاتِ البَينِ، وفسادُ ذات البين الحالِقَة"(السِّجِسْتاني، أبو داود سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدي (المتوفى: 275هـ)، سنن أبي داود،المحقق: شعَيب الأرنؤوط ـ مُحَمَّد كامِل قره بللي(دار الرسالة العالمية،الطبعة: الأولى، 1430 هـ ـ 2009 م،عدد الأجزاء: 7)باب اصلاح ذات البين،ج7،ص280)۔

کیا میں تمہیں روزے دار، نماز پڑھنے والے اور صدقہ خیرات کرنے والے سے افضل مقام والے کے بارے میں نہ بتاؤں، صحابہؓ نے عرض کیا کیوں نہیں، فرمایا کہ آپس میں صلح کرانا ہے پس بے شک آپس کا فساد ہلاک کرنے والا ہے۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا:۔

" **عليكم بالجماعة وإياكم والفرقة**"(الترمذي،محمد بن عيسى بن سَوْرة بن موسى بن الضحاك، أبو عيسى (المتوفى: 279هـ)، الجامع الكبير - سنن الترمذي، ج4،ص326)۔

وحدت اسلامیہ وہ چشمہ خیر ہے جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے واجب ہے۔

اسی اتحاد کی تعلیم حضور نبی اکرم ﷺ نے جابجا امت مسلمہ کو احادیث طیبہ کے ذریعہ بھی دی۔ حضور اکرم ﷺ نے امت کو جہاں وحدت کا درس دیا وہاں حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ جڑے رہیں۔

اختلافی مسائل میں صحابہ، تابعین اور بعد کے اسلاف کے درمیان تعصب نہیں تھا، وہ دونوں رائے کو درست خیال کرتے تھے، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

"(اختلافی مسائل میں) حضرات سلف کے نزدیک جواز میں دراصل کوئی اختلاف نہیں تھا، صرف کسی ایک کے افضل ہونے میں اختلاف تھا، اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے قراءت قرآن کی بابت قراء کا اختلاف ہے، سلف نے اس پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ صحابہ نے مسائل میں اختلاف کیا ہے، اس کے باوجود وہ ہدایت پر قائم ہیں۔(الدهلوى،أحمد بن عبد الرحيم بن الشهيد وجيه الدين بن معظم بن منصور المعروف بالشاه ولي الله (المتوفى: 1176هـ)، الإنصاف في بيان أسباب الاختلاف،المحقق: عبد الفتاح أبو غدة(دار النفائس - بيروت،الطبعة: الثانية، 1404،عدد الأجزاء: 1)ص108)۔

حاصل بحث

بیشک اتحاد و اتفاق کسی بھی قوم کی ترقی اور اعلیٰ اہداف کے حاصل کرنے نیز سربلندی اور کامیابی کے حصول میں معجزانہ کردار ادا کرتا ہے۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کا اتحاد ایک اہم ترین مسئلہ اور ناقابل انکار ضرورت ہے۔ مسلمانوں میں مسلکی عصبیت اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ اس سے کئی اسلامی تعلیمات مجروح ہونے لگی ہیں۔ آج مسلمانانِ عالم طرح طرح کے مسائل میں مبتلا ہیں اور اس کی بنیادی وجہ نااتفاقی، فرقہ وارانہ منافرت، مسلکی تعصبات، جاہ واقتدار، حسد، بغض اور دوسرے مادی مفادات، عدم برداشت اور عدم اتحاد ہے۔ مسلمانوں کی عظمت وعزت وسربلندی سب کچھ

اختلافات کی نذر ہو گیا۔ اسلام کے دشمن متحد ہیں اور اُن کا اتحاد اسی نکتے کی افادیت سے بخوبی آگاہی کی بنا پر ہے۔ اور وہ مختلف سازشوں کے ذریعے مسلمانوں کو تقسیم کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں باہمی اختلاف پیدا کرنا یہود و نصاریٰ کا پرانا طریقہ ہے۔

قرآن کریم ہمیں یہود و نصاریٰ کی اس نفسیات سے آگاہی کے ساتھ ساتھ متعدد آیات میں مسلمانوں کو متحد و متفق رہنے کا حکم دیتا ہے، تفرقے و اختلافات سے دور رہنے، غور و فکر سے کام لینے اور صبر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ آپس کا اتحاد، تقویٰ و اخوت کے اصولوں پر چلنے سے حاصل ہو سکتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب مسلمانوں کے پاس وسعتِ قلبی ہو کیونکہ "وحدت و اخوت" فراخی قلب و ذہن چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام مسلم حکمرانوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کریں۔

نیز کثیر احادیث مبارکہ میں بھی نبی کریم ﷺ نے اتحاد و اتفاق کی عظمت کو بیان کیا ہے اور فرقہ واریت کو مذموم قرار دیا ہے اور صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین اور فقہاء کرام اور اکابرین امت کا طرزِ عمل بھی اس بات پر دال ہے کہ اتحادِ امت تمام بھلائیوں کی جڑ ہے اور آپس میں نفرت اور دوسروں کو نیچا دیکھانے کی کوشش کرنا تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

سبق نمبر 9

اسلامی تہذیب و ثقافت

اسلامی تہذیب۔ حقائق اور خصوصیات

انسان کی مدنی زندگی اور اجتماعی زندگی کے لیے، تہذیب ایک فطری اور لابدی چیز ہے، دو آدمیوں کے باہمی ملاپ سے جو بچہ عالمِ وجود میں آتا ہے، اس کے پروان چڑھنے کے لیے ماں کی گود ضروری ہے، نیز اس کی نشو و نما کے لیے خاندان، معاشرہ اور تعلیم گاہ بھی ضروری ہے۔ مدنیت انسان کی فطرت ہے اور تہذیب اس کی اساس ہے، سویلائزیشن (تہذیب) کو آپ خواہ لفظی اعتبار سے دیکھیں خواہ تاریخی اعتبار سے اس کا مطالعہ کریں۔ ہر دو اعتبار سے اس کا تعلق سماجی اور اجتماعی زندگی سے جڑا ہوا نظر آئے گا۔ عربی زبان میں اس کے لیے مدنیت، حضارت اور ثقافت جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور انگریزی میں بھی Civic, City, Civil یہ سب Civilization کے مصدر کے طور پر مستعمل ہیں۔

تہذیب کیا ہے؟

یہ ایک ایسا گہوارہ ہے، جس میں انسانیت پروان چڑھتی ہے، انسان کا تشخص قائم ہوتا ہے، اس کے لیے ترقی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور اس کو اپنا کر زندگی کے ہر موڑ پر انسان کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ انسانوں کے درمیان خیالات، اقدار، ادارے، تعلقات اور نظام ہائے زندگی یہ سب اس کا نتیجہ ہیں۔

ثقافت اور تہذیب

ثقافت (کلچر) اور تہذیب (سویلائزیشن) کی اصطلاحیں عمرانیات (سوشیالوجی)، تاریخ اور فلسفے کے مباحث میں استعمال ہوتی ہیں۔ البتہ ان کی تکنیکی تعریف میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے، نیز بعض دفعہ ان دونوں کو مترادف بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

عقیدے، اقدار اور اصولِ حیات کی بنیادی قدریں، جو کسی انسانی گروہ کی مشترک اساس ہوں اور جن کی بنیاد پر کسی قوم یا جماعت کو معاشرے میں ایک متمیز تشخص اور شناخت حاصل ہو، وہ کلچر کہلاتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ کلچر عقیدہ، فکر، عادات اور اخلاق واطوار کے ساتھ ساتھ سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی اداروں حتیٰ کہ بین الاقوامی میدانوں میں بھی اپنے آثار چھوڑتا ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر مختلف علوم وفنون وجود پذیر ہوتے ہیں۔ آرٹ کی متنوع شکلیں معرضِ ظہور میں آتی ہیں، فن تعمیر کے گوناگوں شاہ کار انسانی نگاہوں کو خیرہ کیے دیتے ہیں، معاشی ادارے تشکیل پاتے اور سیاسی نظام بنتے ہیں۔ اسی مجموعی تشخص کو تہذیب، حضارت اور سویلائزیشن کا نام دیا جاتا ہے اور علوم عُمرانی کی اصطلاح میں ایک کو Mentafacts (ذہنی تشکیل) کہا جاتا ہے اور دوسرے کو Artefacts (سماجی مظاہر) لیکن یہ دونوں باہم مربوط ہوتے ہیں اور ایک کا تصور دوسرے کے بدون غیر ممکن ہے۔

تہذیب کے عناصرِ ترکیبی

کسی بھی تہذیب کے بنیادی طور پر چار عناصر ہوتے ہیں: ۔

(۱) اقتصادی ذرائع (۲) سیاسی نظام (۳) اخلاقی اقدار وروایات (۴) مختلف علوم وفنون پر گہری نظر، نیز جس طرح کسی بھی تہذیب کے آگے بڑھنے اور ترقی کے منازل طے کرنے کے متعدد عوامل ہوتے ہیں: کچھ جغرافیائی، کچھ اقتصادی اور کچھ نفسیاتی جیسے: مذہب، زبان اور اصول تعلیم وتربیت، بالکل اسی طرح کسی بھی تہذیب کے نیر اقبال کے گہنانے کے بھی چند ایک اسباب ہوتے ہیں، جو اس کی بقا اور ترقی کی راہوں میں گامزن کرنے کے ذرائع سے معارض ہوتے ہیں مثلا: اخلاقی وفکری زبوں حالی، بدنظمی، ظلم وجور اور فقر وتنگدستی کا شیوع، مستقبل کے تئیں لاپروائی اور باصلاحیت راہ نما اور مخلص قائدین کی نایابی۔

تہذیبِ انسانی کی تاریخ

انسانی تہذیب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے، جتنا قدیم اس خاک دان ارضی میں خود انسان کا وجود ہے۔ دراصل یہ سلسلہ ایسا ہے جو اوّل دن سے تا امروز دراز ہے۔

تہذیبِ انسانی کا حیطۂ عمل

کسی بھی تہذیب کا تعلق کسی خاص خطۂ ارضی یا کسی خاص نسلِ انسانی سے نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام دنیا اور دنیا کی تمام نسلوں کو محیط ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ظہور پذیر ہونے والی ہر قوم تہذیب و تمدن کے باب میں کچھ نہ کچھ صفحات رقم کرتی ہے، گو بعض تہذیبیں اپنی ٹھوس بنیادیں، زبردست اثر انگیزی اور افادہ عام کی بنا پر دیگر تہذیبوں سے ممتاز ہو جاتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ تہذیب جس کا پیغام عالم گیر ہو، جس کا خمیر انسانیت نوازی پر اٹھا ہو، جس کی ہدایات و توجیہات اخلاقی قدروں کے پاسدار ہوں اور جس کے اصول و ضوابط حقیقت پسندی پر مبنی ہوں۔ تاریخ میں ایسی تہذیب کو بقائے دوام حاصل ہوتی ہے، مرورِ ایام کے باوصف انسانی زبانیں اس کے ذکر میں سرگرم رہتی ہیں اور ہر زمانے میں اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

اسلامی تہذیب

اسلامی تہذیب بھی، انسانی تہذیبوں کے دراز سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس سے قبل بھی بہت سی تہذیبیں رونما ہوئیں اور اس کے بعد بھی تا قیامت ابھرتی رہیں گی۔

ہماری تہذیب کے ابھرنے، چمکنے اور عالم پر چھا جانے کے متعدد محرکات تھے اور اس کے گمنام و بے نشان ہونے کے بھی مختلف اسباب ہیں، جن کی تفصیل میں جانا ہمارے موضوع سے خارج ہے، ہمارا مقصد تو صرف انسانی ارتقاء کی تاریخ میں اسلامی تہذیب کے عظیم الشان کردار اور دنیا کے مختلف اقوام پر علوم و فنون، عقائد، اخلاقیات، فلسفہ و حکمت اور ادب کے باب میں اس کے ناقابلِ فراموش احسانات کو ذکر کرنا ہے۔

اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب

اس دنیا میں ہمیشہ مختلف تہذیبوں کے درمیان مشترک مفادات بھی ہوتے ہیں اور ان کے درمیان اختلاف بھی ہوتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ دو تہذیبوں کی ساری اقدار ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ کئی انتہائی اہم ایسی اقدار ہیں جو اِس وقت تقریباً سب تہذیبوں کے درمیان، کم از کم نظری (Theoratical) طور پر، یکساں ہیں، مثلاً انصاف، دیانت داری، اور سچائی وغیرہ۔ اسی طرح ساری تہذیبیں اس بات پر متفق ہیں کہ قاتل، چور، ڈاکو، مجرمانہ حملہ آور، دھوکہ دہی کا مرتکب، رشوت لینے والا، کرپشن کرنے والا، خیانت کرنے والا اور اسی طرح کے دوسرے جرائم کرنے والا انسان سزا کا مستحق ہے۔ تاہم کئی امور ایسے ہیں جن کے متعلق مختلف تہذیبوں کے درمیان آپس میں اختلاف ہے۔ یہی حال اسلامی اور مغربی تہذیب کا ہے۔ اسلامی تہذیب کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ اس میں ہر انسان کی زندگی میں اللہ کی عبادت بالکل نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ جب وہ کسی سے ملتا ہے تو السلام علیکم کہتا ہے۔ مکالمے کے درمیان میں مسلسل انشاء اللہ، ماشاء اللہ اور الحمد للہ کا استعمال کرتا ہے۔ وہ دن میں پانچ مرتبہ نماز میں اللہ کے سامنے جھکتا ہے اور اگر وہ کسی جگہ پر غیر مسلموں کے ساتھ ہو تو اس کی نماز اور کھانے کی میز پر اس کا حلال و حرام میں تمیز اس کو فوراً دوسروں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ یہی حال ایک مسلمان کی پوری زندگی کا ہوتا ہے۔ وہ رمضان کے روزے رکھتا ہے، قرآن مجید سے ایک زندہ تعلق رکھتا ہے اور وہ جانتے بوجھتے یا انجانے میں اپنی زندگی کے بہت سے امور سنت کے مطابق انجام دیتا ہے۔ مثلاً اگر وہ بچہ ہے تو اس کا ختنہ ہو چکا ہوتا ہے، اگر وہ بالغ مرد و عورت ہے تو وہ اپنے بدن کی صفائی کرتا ہے، جنابت کے وقت نہاتا ہے، نماز سے پہلے وضو کرتا ہے اور رمضان کے موقعے پر تو دوسروں سے اس کا فرق و امتیاز اتنا واضح ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

اسلامی تہذیب کا دوسرا بڑا وصف حیا اور خاندانی نظام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مرد و عورت کے درمیان میں جنسی تعلق صرف اور صرف اسی وقت جائز ہے جب یہ دونوں قانونی طریقے سے رشتۂ ازدواج میں بندھ جائیں۔ مرد و زن کے باہمی روابط سے متعلق باقی تمام ہدایات دراصل اسی ایک بات کی تشریح ہیں۔

اسلامی تہذیب کا تیسرا نمایاں وصف شراب جوئے اور سود سے اجتناب ہے۔ ایک مسلمان کو ہر اُس چیز سے اجتناب کرنا چاہیے جس میں ان چیزوں کی آمیزش ہو۔

اسلامی تہذیب کا چوتھا وصف 'حفظِ مراتب' ہے۔ اسلامی تہذیب آزادیٔ رائے پر پورا یقین رکھتی ہے لیکن اس میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ آزادیٔ رائے کے نام پر کسی مقدس ہستی کا مذاق اڑایا جائے اور چھوٹے بڑے کی تمیز مٹ جائے۔ اس تہذیب کے اندر بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان احترام اور محبت کا ایک خاص رشتہ ہوتا ہے جس سے تجاوز کرنا غلط اور خلافِ تہذیب سمجھا جاتا ہے۔

ویسے تو کئی دوسرے نکات بھی بیان کیے جاسکتے ہیں لیکن اصل اہمیت انہی چار نکات کو حاصل ہے۔

اس کے برعکس مغربی تہذیب کی بنیاد "آزادی" پر ہے۔ اگرچہ مغربی تہذیب کے اندر بھی اس آزادی پر کئی جگہ قدغنیں لگ جاتی ہیں، لیکن وہ قدغنیں جو اسلامی تہذیب ایک مسلمان پر بحیثیتِ تہذیب لگاتی ہے، اس کا مغربی تہذیب کے اندر نشان نہیں ملتا۔ مثلاً مغربی تہذیب میں عبادت ہر فرد کا ذاتی مسئلہ ہے۔ وہ چاہے تو عبادت کرے یا نہ کرے اور جس طرح سے چاہے عبادت کرے۔ اسی طرح حیا بھی اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔ وہ چاہے تو اس کا خیال رکھے اور چاہے تو اس کا خیال نہ رکھے۔ اسی طرح الکوہل کا استعمال بھی اس کی ذات پر منحصر ہے۔ قانون اُس کو صرف اُس وقت روک سکتا ہے جب وہ شراب پی کر دوسروں کو نقصان پہنچائے یا سڑک پر گاڑی چلائے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک فرد پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ یہی حال "حفظِ مراتب" کا ہے۔ وہ چاہے تو ذاتی طور پر کسی کی عزت کرے یا نہ کرے۔ اُس کا یہ حق ہے کہ کسی بھی شخص کا خاکہ اڑائے، اُس کے متعلق کارٹون بنائے یا طنز آمیز کلمات کہے۔ ان چیزوں پر پابندی مغربی تہذیب کے خیال میں آزادیٔ رائے کے حق کے خلاف ہے۔ اس لیے ان چیزوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔

اسلامی اور مغربی تہذیب کے درمیان بہت سی چیزوں پر اتفاقِ رائے بھی موجود ہے۔ مثلاً دونوں تہذیبیں انصاف، دیانت داری، امانت و دیانت، میرٹ، محنت، محروم اور کمزور طبقات کی خدمت پر یقین رکھتی ہیں۔ دونوں تہذیبیں رشوت و سفارش، جھوٹ، دھوکہ دہی، خیانت، چوری، کسی کا مال ہتھیانے اور کسی پر ظلم کو غلط سمجھتی ہیں۔ جن چیزوں کو اسلامی تہذیب جرم سمجھتی ہے، کم و بیش ان تمام چیزوں کو مغربی تہذیب بھی جرم سمجھتی ہے۔

اس میں صرف چند جرائم ہی کو استثناء حاصل ہے۔ مثلاً مغربی تہذیب کے مطابق زنا بالرضا، شراب نوشی، جوابازی اور سود جرائم کی فہرست میں نہیں آتے، جب کہ اسلامی تہذیب کے مطابق یہ تینوں چیزیں جرم ہیں۔

کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن کے متعلق غلط فہمی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان پہلوؤں کے حوالے سے بھی اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان ایک بڑا فرق ہے۔ حالانکہ ان پہلوؤں میں اختلاف سے کہیں زیادہ اتفاق موجود ہے۔ ان میں سے ایک پہلو جمہوریت ہے۔ کسی بھی معاشرے کی جمہوری بنیادوں کے متعلق دونوں تہذیبوں کے درمیان بنیادی اتفاق ہے۔ عالم اسلام میں یہ سوچ عام ہے کہ کسی مسلمان معاشرے کے اندر جمہوریت پر بہت ساری قانونی پابندیاں عائد ہونی چاہئیں۔ اس راقم کے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اگر کسی جگہ جمہوری کلچر جاری وساری ہو تو اس ملک کی معاشرتی اقدار کے حوالے سے وہاں کی جمہوری روایات پر خود بخود ایسی قدغنیں لگ جاتی ہیں جن کو قانون کی کتابوں میں تحریر نہیں کیا گیا ہوتا، لیکن وہ روایات کا حصہ ہوتی ہیں۔ یہی حال ایک مسلمان معاشرے کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک مسلمان معاشرے میں جمہوری کلچر موجود ہو تو پارلیمنٹ کے اندر ارکان کی ایک بڑی تعداد مسلمان ممبروں پر مشتمل ہوگی۔ پورا معاشرہ جس حد تک اسلام کے رنگ میں رنگا ہوا ہوگا، اسی حد تک ارکانِ پارلیمنٹ بھی اسلام کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے، اور قانون سازی کے وقت وہ لازماً قرآن وحدیث کی ہدایات کا خیال رکھیں گے۔ اگر اس بارے میں آئین میں کوئی خاص پابندیاں نہ بھی لگائی جائیں، تو پھر بھی ایک جمہوری معاشرے میں ایسا ہی ہوگا۔ ایسی جگہ میں قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی کا کوئی سوچ بھی نہ سکے گا، اس لیے کہ اگلی دفعہ بھی وہ عوام کے ووٹوں کا محتاج رہے گا۔ یہی حال سارے مغربی ممالک کا ہے۔ اگرچہ وہاں نظری طور پر پارلیمنٹ بالکل خود مختار ہے اور وہ ہر طرح کی قانون سازی کرنے کی مجاز ہے لیکن جس ملک کی جو بھی اقدار ہوتی ہیں، عملاً انہی کے مطابق قانون سازی ہوتی ہے۔

مغربی تہذیب کی طرح اسلامی تہذیب بھی آزادیٔ رائے کی قائل ہے، مگر احترام اور شائستگی کے اصول کے ساتھ۔ مسلمان معاشرے میں بھی ہر فرد کو یہ اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات کا دلیل کے ساتھ اظہار کرے، چاہے اس کی بات مانی جائے یا نہ مانی جائے۔ یہ دراصل مسلمانوں کا اجتماعی شعور ہوتا ہے جو کسی بات کے ماننے یا نہ ماننے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس شعور کی زندگی دانش وروں اور مصلحین کے کام پر اپنی بنیاد رکھتی ہے۔ جس مسلمان

معاشرے میں دانش ور بیدار مغز اور ہوش مند ہوں اور مصلحین دلیل کے ساتھ سوسائٹی میں اثر و نفوذ کریں، اُس سوسائٹی کا اجتماعی شعور اُتنا ہی زندہ و بیدار ہوتا ہے۔ جس کا اظہار سوسائٹی کے نظمِ اجتماعی اور حکومت و ریاست کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔

اسلامی تہذیب و ثقافت کی خصوصیات

ویسے تو اسلامی تہذیب اپنے اندر ہزاروں خوبیوں اور خصوصیات کو سموئے ہوئے ہے، مگر ہم صرف اس کی اہم، مرکزی اور بنیادی خصوصیات کے بیان پر اکتفاء کریں گے اور ان شاء اللہ اسی سے تہذیبِ اسلامی کی تمام اگلی و پچھلی تہذیبوں پر برتری و بہتری آشکارا ہو جائے گی۔ اسلامی تہذیب کی چند مشہور خصوصیات درج ذیل ہیں:۔

عقیدہ توحید

اسلامی تہذیب و ثقافت کا اولین عنصر ترکیبی توحید ہے۔ توحید ہی وہ بنیادی تعلیم ہے جس کا ابلاغ اسلام کا اولین مقصد تھا۔ اگر اسلامی ثقافت کی ہمہ جہت نشو و نما اور عالم گیر ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو باوجود علاقائی، جغرافیائی، نسلی اور لسانیاتی تنوع کے جو عنصر ایک قدر مشترک کے طور پر موجود ہے وہ عقیدہ توحید ہے۔ توحید ہی اسلامی تہذیب و ثقافت کی وہ قوت ہے جس کا مقابلہ کوئی بھی عقیدہ، آئیڈیالوجی یا نظام زندگی نہیں کر سکا۔

اسلام میں توحید مجرد عقیدہ یا ایک تصور نہیں بلکہ یہ ایک زندہ اور حرکی تصور حیات ہے۔ یہ اسلامی تہذیب کے شجر طیبہ کی اصل ہے۔ یہ فرد اور ملت کی پیکر حیات کی روح ہے۔ جس طرح روح کے بغیر کوئی جسم زندگی کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح توحید کے بغیر اسلامی معاشرے میں فرد و ملت بے جان ہو جاتے ہیں۔ توحید غیر اللہ کی نفی اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت کی وحدانیت کے اقرار سے عبارت ہے۔ یہی ''لَا'' اور ''اِلاَّ'' اسلامی معاشرے کے افراد کے قلوب و اذہان سے ہر غیر اللہ کا نقش مٹاتے ہوئے اطاعت اِلٰہی کا داعیہ پیدا کرتے ہیں۔ اس سے انہیں وہ ایمانی قوت نصیب ہوتی ہے جس سے دل میں زندگی اور زندگی میں معنویت، وسعت اور آفاقیت جگہ پاتی ہے۔ اسلام سے قبل عقیدہ توحید شرک کی گوناگوں صورتوں کی وجہ سے بگاڑ کا شکار ہو گیا۔ اسلام نے عقیدہ توحید کی ان تمام خرابیوں کا خاتمہ کیا جو اسلام سے پہلے کے مذاہب اور ملل کے مابین پیدا ہو چکی تھیں۔

قرآنِ حکیم نے عقیدہ توحید کی مختلف جہات کو پوری شرح وبسط سے بیان کر دیا ہے۔ تاہم سورہ اخلاص عقیدہ توحید کا ایسا جامع بیان ہے کہ اس میں عقیدہ توحید کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ان مغالطوں کا ازالہ بھی کر دیا گیا ہے جن کا شکار انسانی شعور آغازِ اسلام کے وقت تھا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌo اللّٰهُ الصَّمَدُo لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْo وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُواً اَحَدٌo الاخلاص: 112۔

"(اے نبی مکرّم!) آپ فرما دیجئے: وہ اللہ ہے جو یکتا ہےo اللہ سب سے بے نیاز، سب کی پناہ اور سب پر فائق ہےo نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ ہی وہ پیدا کیا گیا ہےo اور نہ ہی اس کا کوئی ہم سر ہے"۔

اسلامی تہذیب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اساس کامل وحدانیت پر ہے۔ یہی ایک ایسی تہذیب ہے، جو یہ تصور پیش کرتی ہے کہ کائنات کی ایک ایک شئ صرف اور صرف ایک ذات کی خلق کردہ ہے، اسی کے لیے عبادت کرتی ہے اور اسی سے اپنی حاجات وضروریات بیان کرنا چاہیے (ایاک نعبد وایاک نستعین) وہی عزت عطا کرتا ہے اور اسی کے ہاتھ میں کسی کو بھی ذلیل وخوار کر دینا ہے، وہی دیتا ہے اور وہی محروم بھی رکھتا ہے اور زمین کی بے کراں وسعتوں اور آسمان کی بے پایاں بلندیوں پر جو کچھ ہے سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے **(وہو علی کل شيء قدیر)**۔

عقیدے کے حوالے سے فکر کی اس بلند آہنگی کا طبقۂ انسانیت کو اونچا اٹھانے، عوام کو بادشاہوں، سربراہانِ مملکت، شہ زوروں اور مذہب کے اجارہ داروں کے جور وقہر سے نجات دلوانے، حاکم ومحکوم کے درمیان صدیوں سے پائی جانے والی خلا کو ختم کرنے اور انسانی ذہنوں کو ایک مالک حقیقی، کائنات کے خالق اور عالمین کے حقیقی رب کی طرف پھیرنے میں گہرا اثر رہا، نیز اسی عقیدے کی وجہ سے اسلامی تہذیب گزشتہ تمام تہذیبوں میں نمایاں رہی اور آئندہ بھی اس کی انفرادیت باقی رہے گی (انشاءاللہ) کیونکہ اس کے عقیدے میں، علوم وفنون اور شعر وادب میں غرضیکہ معاشرتِ انسانی کے ہر شعبے میں بت پرستی، اس کے آداب اور اس کی پیچیدہ روایات کی ادنیٰ جھلک بھی نہیں پائی جاتی۔

اسلامی تہذیب میں رومن لٹریچر کے ترجمے سے اعراض اور بت پرست یونان کے ادبی شہ پاروں سے کنارہ کشی کا راز یہی ہے اور اسی وجہ سے ہماری تہذیب فن سنگ تراشی اور صورت گری میں دیگر تہذیبوں سے علیحدہ رہی۔ جب کہ نقش و نگاری اور تعمیری مہارت میں اس کی نمائندگی قابلِ لحاظ ہے۔

اسلام ہی تنہا ایسا مذہب ہے جس نے بت پرستی اور اس کے تمام تر مظاہر کے خلاف کھلے بندوں جنگ چھیڑی اور بت پرستی کی ہر جھلک اور اس کے باقیات پر خط نسخ پھیر ڈالا، مثلاً: انبیاء، اولیاء، اصحابِ علم و فضل اور فاتحین کی تصویریں بطور یادگار رکھنے کو منع کیا، واضح رہے کہ یہ رسم قدیم و جدید ہر دو تہذیب میں رواجِ عام رکھتا ہے، اس لیے کہ ان تہذیبوں میں خدائے واحد کے حوالے سے وہ تصور مفقود ہے جو اسلامی تہذیب نے پیش کیا ہے۔

پھر اسی عقیدہ وحدانیت کے زیر اثر وہ تمام قواعد و ضوابطِ حیات وجود پذیر ہوئے جن پر اسلامی تہذیب مشتمل ہے۔ چنانچہ اس کے پیغام، اس کے قوانینِ تشریعی، اس کے مقاصد و اہداف، اس کے ذرائعِ معیشت اور طرز ہائے فکر، ہر ایک میں وحدت کا رنگ غالب ہے۔

عقیدہ رِسالت

اسلامی معاشرے اور تہذیب کی تشکیل میں رسالت کو مرکزی اور محوری حیثیت حاصل ہے۔ دین کی پوری عمارت کی بنیاد ایمان، اسلام اور احسان پر استوار ہے۔ اگر دین کے ان عناصر ترکیبی کے اجتماعی اور سماجی سطح پر اثرات کو دیکھیں تو ایمان دین کے مذہبی پہلو کا احاطہ کرتا ہے جو عقائد پر مشتمل ہے جبکہ اسلام ان عقائد کی روشنی میں عملی زندگی بسر کرنے کا نام ہے یعنی زندگی کا وہ ضابطہ عمل اور نظام قانون جو دین کے بنیادی عقائد کے خلاف نہ ہو بلکہ انہی عقائد کی تائید و توثیق کرے اسلام ہے۔ اسی طرح احسان معاشرے کی اخلاقی اور روحانی بالیدگی کا ایسا منہج ہے، جس سے معاشرے کا جسدِ روحانی زندہ اور بحال رہتا ہے۔ دین کے یہ تینوں شعبے اس وقت ہی موثر اور معاشرے کے لیے نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں، جب ان کا کامل اور قابلِ تقلید نمونہ موجود ہو۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ ہی وہ کامل نمونہ ہے جو ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے لیے ان تینوں جہات کا کامل و اکمل نمونہ ہیں۔

تاریخ میں اُلوہی ضابطہ یہی رہا ہے کہ جب بھی کوئی معاشرہ انحطاط کا شکار ہوا تو اس کے زوال اور انحطاط کا ازالہ وحی سے کیا گیا۔ اس زوال زدہ معاشرے میں انبیاے کرام علیھم السلام مبعوث ہوئے جنہوں نے اللہ کی تائید اور اپنے یقین و عمل کی قوت سے معاشرے کے تن مردہ میں پھر سے روح پھونک دی۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر خطے اور نسل انسانی کے ہر طبقے کی طرف اپنے رسول اور پیغمبر بھیجے ہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌo فاطر، 35: 24۔

''اور کوئی اُمت (ایسی) نہیں مگر اُس میں کوئی (نہ کوئی) ڈر سنانے والا (ضرور) گزرا ہے''۔

قرآن کریم کی یہ آیت عمومیت رسالت پر دلالت کرتی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ کرہ ارض کا ہر وہ خطہ جہاں چند انسانوں نے مل کر معاشرہ (society) تشکیل دیا ہے، اللہ کی طرف سے آنے والے انبیاء کے فیضان سے خالی نہیں رہا۔ اِنذار و تبشیر اور دعوت و تبلیغ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ انسان انبیاء کی تعلیمات کے اثر سے تہذیب و تمدن کے اوصاف سے متصف ہوتا گیا تو آہستہ آہستہ نبوت و رسالت کے اس نظام میں وسعت و آفاقیت پیدا ہوتی چلی گئی اور ایسے انبیاء جن کا دائرہ تبلیغ صرف کرہ ارضی کو محیط تھا، تشریف لا چکے تو کائنات ارضی و سماوی اور قیامت تک کے تمام ادوار کے لیے خاتم الانبیاء سرور کون و مکان، فخر موجودات ﷺ کو مبعوث کر دیا گیا اور وہ دنیا کے سب سے عظیم انقلاب اور سب سے بڑے دین کے داعی اور مبلغ اعظم قرار پائے۔ قرآن مجید نے حضور نبی اکرم ﷺ کی اس شان کو یوں بیان فرمایا ہے:۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا. (السبا، 34: 28)۔

''اور (اے حبیبِ مکرّم!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر اس طرح کہ (آپ) پوری انسانیت کے لئے خوشخبری سنانے والے اور ڈر سنانے والے ہیں''۔

یعنی اب قیامت تک امت مسلمہ کی معاشرتی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی شناخت کا واحد معتبر حوالہ حضور خاتم المرسلین ﷺ کی رسالت ہی ہو گی۔

عقیدہ آخرت

کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک صحت مند روایات کا امین نہیں بن سکتا جب تک اس میں جواب دہی کا تصور موجود نہ ہو۔ اسلام کی تہذیب اس حوالے سے امتیاز کی حامل ہے کہ دنیاوی زندگی کے بعد آخرت میں دنیاوی زندگی میں انجام دیے جانے والے اعمال کے احتساب اور جواب دہی کا تصور اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے، جس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ قادر مطلق اور خالق کائنات کے سامنے جواب دہی کا یہ تصور جب سماجی اور عملی رویے میں ڈھلتا ہی تو ایسا تمدن وجود میں آتا ہے جس میں خیر کے فروغ کے امکانات برائی کے فروغ کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایمان پر استحکام اور کفر کے انکار کی بنیاد اسی تصور کو قرار دیا گیا ہے۔

قرآن حکیم ایمان بالآخرت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے واضح کرتا ہے:۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَo البقرہ،2: 28۔

”تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے اس نے تمہیں زندگی بخشی، پھر تمہیں موت سے ہمکنار کرے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے“۔

جواب دہی اور جرم و سزا کا یہ تصور قرآن مجید میں اِس طرح مذکور ہے:۔

وَاِنَّمَا تُوَفُّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. آل عمران،3: 185۔

”اور تمہارے اجر پورے کے پورے تو قیامت کے دن ہی دیے جائیں گے“۔

مزید اِرشاد فرمایا گیا:۔

ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَo آل عمران،3: 161۔

''پھر ہر شخص کو اُس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

اِس اَمر کی مزید وضاحت یوں کی گئی ہے:۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِینَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا وَإِن کَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَیْنَا بِهَا وَکَفَی بِنَا حَاسِبِینَ. الأنبیاء،21: 47۔

''اور ہم قیامت کے دن عدل و انصاف کے ترازو رکھ دیں گے، سو کسی جان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو گا (تو) ہم اُسے (بھی) حاضر کر دیں گے اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں''۔

بالآخر جزا و سزا کی آخری صورت یوں دکھائی جائے گی:۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَo وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغٰوِیْنَo الشعراء،26: 90،91۔

''اور (اُس دن) جنت پرہیز گاروں کے قریب کر دی جائے گیo اور دوزخ گمراہوں کے سامنے ظاہر کر دی جائے گی''۔

عقیدہ آخرت کے سلسلے میں اِن بنیادی اَجزاء پر کامل یقین رکھنا ایمان کی بنیادی شرط ہے۔ جس سے انسان کی سماجی اور معاشرتی زندگی براہ راست متاثر ہوتی ہے۔ اگر افراد معاشرہ اس عقیدہ کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر مستحضر رکھیں۔

اِحترامِ رِسالت مآب ﷺ

اسلامی معاشرے کا نمایاں ترین وصف یہ ہے کہ اس میں حضور نبی اکرم ﷺ کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہے۔ اُمتِ مسلمہ کی شناخت نسبتِ رسالت مآب ﷺ سے ہی وابستہ ہے۔ قرآن حکیم میں اس پہلو پر کئی مقامات پر زور دیا گیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ. الحجرات،49: 2۔

''اے ایمان والو! تم اپنی آوازوں کو نبیِ مکرّم (ﷺ) کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور اُن کے ساتھ اِس طرح بلند آواز سے بات (بھی) نہ کیا کرو جیسے تم ایک دوسرے سے بلند آواز کے ساتھ کرتے ہو (ایسا نہ ہو) کہ تمہارے سارے اعمال ہی (ایمان سمیت) غارت ہو جائیں اور تمہیں (ایمان اور اعمال کے برباد ہو جانے کا) شعور تک بھی نہ ہو''۔

آداب النبی ﷺ کی رعایت کرنے والوں کو اعلیٰ اجر کی خبر دی گئی ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ اُولٰئِکَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰی لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌo الحجرات،49:

''بیشک جو لوگ رسول (ﷺ) کی بارگاہ میں (ادب و نیاز کے باعث) اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے چُن کر خالص کر لیا ہے۔ ان ہی کے لئے بخشش ہے اور اجرِ عظیم ہے''۔

آپ ﷺ کے آداب کو بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ سے ملاقات کرنے کے آداب کی تعلیم یوں دی گئی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ. النور،24: 27۔

”اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، یہاں تک کہ تم ان سے اجازت لے لو اور ان کے رہنے والوں کو (داخل ہوتے ہی) سلام کہا کرو یہ تمہارے لئے بہتر (نصیحت) ہے تاکہ تم (اس کی حکمتوں میں) غور و فکر کرو“۔

اِنسانی مساوات

مساوات اسلامی معاشرے کی ایک لازمی قدر ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا دور مبارک تاریخ انسانی کے روشن دنوں کا امین ہے۔ زمین پر عدل کی حکمرانی قائم ہوئی۔ ارشاد ہوا: ۔

”اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے گی تو اس کے ہاتھ بھی کاٹ دیے جائیں گے“۔

(بخاری، الصحیح، کتاب المغازی، باب و قال اللیث حدثنی، 4: 1566، رقم: 4053، مسلم، الصحیح، کتاب الحدود، باب قطع السارق، 3: 1311، رقم: 1688، أبو داود، السنن، کتاب الحدود، باب فی الحد، 2: 537، رقم: 4373)۔

عدل و انصاف اور مساوات کا یہ حال تھا کہ حکمرانِ وقت امیر المؤمنین سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسے شریف و نجیب اور قریشی النسل ایک غلام کے بیٹے اُسامہ کے گھوڑے کی رکاب تھامے ساتھ ساتھ پیدل چلتے ہوئے نظر آتے ہیں (ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ، 6: 305)۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے نڈر و بے باک خلیفہ بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو سیدنا (اے ہمارے آقا!) کہہ کر پکارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ (بخاری، الصحیح، کتاب المناقب، باب مناقب بلال بن رباح، 3: 1371، رقم: 3544، حاکم، المستدرک، 3: 320، رقم: 5239، طبرانی، المعجم الکبیر، 1: 338، رقم: 1015)۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی عطا کردہ تعلیمات کا ذکر تھا کہ آپ ﷺ کی صحبت، اخلاق حسنہ، نشست و برخاست، بود و باش اور شب و روز نے ایک ایسا انقلاب بپا کیا کہ آپ ﷺ کی ہم نشینی کا اعزاز حاصل کرنے والا شخص شرفِ انسانیت کا مظہر تھا۔

اَمن و سلامتی

حضور نبی اکرم ﷺ پیغمبر امن بن کر دنیا میں مبعوث ہوئے۔ عہد رسالت مآب ﷺ کا کسی بھی حوالے سے جائزہ لیا جائے۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں ہی امن قائم نہیں ہوا بلکہ پوری نسل انسانی کو سکون اور اطمینان کی چادر عطا ہوئی۔

یہ ایک ایسا انقلاب تھا جس میں نسلی عصبیت کا پیکر انسان دوسروں کی جان و مال کا محافظ بن گیا۔ ظلم و استبداد سے اقوام کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالنے والا دوسروں کی آزادی کا علمبردار بن گیا۔ دوسروں کی عزت و آبرو سے کھیلنے والا انہیں کی عفت و عصمت کا رکھوالا بن گیا۔ الغرض قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کی تعلیمات کے نور سے سارے کا سارا معاشرہ امن کا گہوارہ بن گیا اور دیگر اقوام امن کی خیرات لینے کے لئے اسلام کی طرف رجوع کرنے لگیں۔ آخر کار اسلامی تہذیب و تمدن اور نظام حیات کی برکات سے اندھیرے چھٹنے لگے۔

اِصلاحِ معاشرہ

تیرہ سالہ مکی زندگی اور پھر دس سالہ مدنی زندگی میں عزم و عمل کے جو چراغ روشن ہوئے ان کی روشنی نے زندگی کے ہر گوشے کو بقعہ نور بنا دیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں جو مثالی معاشرہ قائم ہوا اس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے قبل کوئی خرابی ایسی نہ تھی جو دنیا میں پائی نہ جاتی ہو۔ سارا معاشرہ کلی بگاڑ کا شکار تھا ہر طرف فتنہ و فساد اور افراتفری تھی۔ چین اور سکون لٹ چکا تھا۔ آخر کار اللہ رب العزت کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے معاشرے کی صلاح و تطہیر کے لئے اپنا آخری نبی ﷺ دنیا میں بھیجا۔ جس نے بہت قلیل عرصے میں اس بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح احسن طریقے سے فرمائی۔ زندگی کے ہر شعبے کی خرابیوں کو درست کیا اور معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہ رہا جس تک آپ ﷺ کی نگاہ نہ پہنچی ہو۔ نتیجۃً آپ کی جہدِ مسلسل اور سعی پیہم کی وجہ سے تیئس سال کے مختصر عرصے میں وہ مثالی معاشرہ وجود میں آ گیا جو آج تک اپنی مثال آپ ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے اسلامی معاشرے کی بنیاد خوفِ خدا پر رکھی، کیونکہ جس معاشرے کی بنیاد خوفِ خدا پر نہ ہو اس کی اصلاح قطعی ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے خوفِ خدا کو اپنے معاشرے کی اصلاح کے لئے بنیادی ستون قرار دیا ہے۔ آج معاشرے میں جتنی بھی خرابیاں اور کمزوریاں پیدا ہو چکی ہیں وہ اسلامی تہذیب و ثقافت سے دوری کی وجہ سے ہیں۔ اگر ہم نے اسلامی نظام حیات سے انحراف کو اپنا وطیرہ بنائے رکھا تو معاشرتی بگاڑ روز بروز بڑھتا ہی چلا جائے گا اور آخر وہ دِن بھی آجائے گا جب اس کی اصلاح ناممکن ہو جائے گی۔ لہٰذا اس دن کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں اس کی اصلاح کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرنی چاہیے۔

اسلام سوسائٹی کی تقسیم، نسلی امتیاز یا مال و دولت کے اصول پر نہیں کرتا۔ وہ صرف دانائی اور نادانی ہی کی اساس پر معاشرہ کی طبقہ بندی کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. الزمر، 39 : 9۔

"فرما دیجئے: کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو لوگ علم نہیں رکھتے (سب) برابر ہو سکتے ہیں؟"

اسلامی سوسائٹی میں بلند ترین مقام اشراف یا امراء کو حاصل نہیں ہے، بلکہ صرف "خدا سے ڈرنے والوں کو" حاصل ہے:۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰكُم. الحجرات، 49 : 13۔

"بے شک اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہو"۔

اور تقویٰ اور خوف و خشیتِ الٰہی اہلِ علم ہی کا حصہ ہے:۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ. فاطر، 35 : 28۔

''بس اللہ کے بندوں میں سے اس سے وہی ڈرتے ہیں جو (ان حقائق کا بصیرت کے ساتھ) علم رکھنے والے ہیں''۔

نظامِ حکمرانی کی اِصلاح

ریاست مدینہ ایک نظریاتی مملکت تھی اور اس مملکت کی بنیاد ہجرت مدینہ کے فوراً بعد رکھ دی گئی تھی۔ یہ گویا مصطفوی انقلاب کی تکمیل کی طرف سفر رحمت کا آغاز تھا۔ تحریکِ اسلامی مرحلہ انقلاب میں داخل ہو رہی تھی۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ کی مختصر ریاست میں اسلامی حکومت کی بنیاد قائم کی اور نبوی حکمت سے اسلامی نظام حکومت کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ مدینہ منورہ کے یہودیوں سے بین الاقوامی اصولوں کے مطابق باہمی زندگی گزارنے کا معاہدہ کیا۔ صلح و جنگ کے اعلیٰ اصول قائم کیے اور ان کے مطابق عمل کیا۔ یہ اُصول اور تعلیمات ایسی ہیں کہ آج بھی دنیا کی مشکلات کا مداوا کر سکتی ہیں۔ جو سیاست اور حکمت عملی آپ ﷺ نے اپنائی تھی اس کے بنیادی اُصول آج بھی اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح وہ دورِ نبوی اور مسلمانوں کے اِبتدائی دور میں عملی طور پر کامیاب ثابت ہوئے تھے۔

شروع شروع میں جب اِسلامی حکومت مدینہ منورہ اور اس کے گرد و نواح تک محدود تھی تمام انتظامی اور سیاسی معاملات آپ ﷺ خود طے کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جب تمام اہل عرب مسلمان ہو گئے اور اسلامی ریاست کی حدود پھیل گئیں تو آپ ﷺ نے ہر علاقے کے الگ الگ حاکم مقرر کئے، جیسا کہ مکہ معظمہ، عمان، بحرین، تیماء اور یمن کے مختلف حصوں کے لئے حکام مقرر کئے گئے۔ جزیرہ نمائے عرب چوں کہ سب سے زیادہ آباد اور وسیع علاقہ تھا اور اس کا قدیم تہذیب و تمدن بھی مشہور تھا۔ اس کے علاوہ تجارتی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کا تجارتی کاروبار بھی ترقی پذیر تھا، زراعت اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے بھی اس کی اہمیت تھی اس لئے حضور نبی اکرم ﷺ نے اس کے نظم و نسق، نظام سلطنت اور حکام کے تقرر پر خاص توجہ فرمائی۔

مدینہ منورہ کے نظام تہذیب وثقافت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے معاشرے کے منتشر اجزا کو مرتب اور مربوط کیا اوراسے سماجی اور معاشرتی ہم آہنگی سے آشنا کیا۔ آپ ﷺ نے جوانوں سے کہا کہ بوڑھوں کا احترام کریں، بوڑھوں سے کہا کہ بچوں پر شفقت کریں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

ليس منّا من لم يرحم صغيرنا ويؤقّر كبيرن. ترمذی، السنن، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الصبیان، 4 : 321، رقم: 1919۔

''(وہ شخص) ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا اور ہمارے بڑوں کی عزت نہیں کرتا''۔

امیروں سے کہا کہ غریبوں کا خیال رکھیں، غریبوں کو کہا کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں۔ الغرض آپ ﷺ نے تمام طبقات کو معاشرے کی فلاح و بہبود پر لگا دیا۔ نتیجتاً آپ ﷺ کی حکمتِ عملی اور نظم وضبط کی وجہ سے بغیر کسی جبر و تشدد کے متمول لوگ معاشرے کی فلاح و بہبود پر بے دریغ خرچ کرنے لگے اور یوں حضور ﷺ نے معاشرے کے مختلف طبقات کو باہم متحد اور منظم کر دیا اور حق کی حمایت میں باطل کے خلاف سب کو صف آراء کر دیا۔ آپ نے ان تمام عوامل سے احتراز کی تعلیم دی جو معاشرے یا مملکت کو عدم استحکام، اختلال اور جور و ظلم کا شکار کر سکتے ہیں۔ ان چیزوں کی تعلیم دیتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ۔

1. عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : سيأتي على الناس سنوات خدّاعات يصدق فيها الكاذب ويكذب فيها الصادق ويؤتمن فيها الخائن ويخون فيها الأمين وينطق فيها الروى بضة قيل وما الرويبضة؟ قال الرجل التّافه يتكلم في أمر العامة۔

(ابن ماجہ، السنن، کتاب الفتن، باب شدة الزمان، 2 : 1339، رقم: 4036۔، أحمد بن حنبل، المسند، 2 : 291، رقم: 7899، حاکم، المستدرک علی الصحیحین، 4 : 512، رقم: 8439، أبو یعلی، المسند، 6 : 378، رقم: 3715)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں پر بہت سے سال ایسے آئیں گے جن میں دھوکہ ہی دھوکہ ہو گا۔ اس وقت جھوٹے کو سچا سمجھا جائے گا اور سچے کو جھوٹا۔ بد دیانت کو امانت دار تصور کیا جائے گا اور امانت دار کو بد دیانت اور ''رویبضہ'' یعنی گرے

پڑے، نااہل لوگ قوم کی طرف سے نمائندگی کریں گے۔ عرض کیا گیا: "رویبضہ" سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: وہ نااہل اور بے قیمت آدمی جو قوم کے اہم معاملات میں رائے زنی کرے"۔

2. عن أم سلمة أنّها سمعت النبي ﷺ يقول : ليأتين على الناس زمان يكذب فيه الصادق ويصدق فيه الكاذب ويخون فيه الأمين ويؤتمن فيه الخؤون ويشهد فيه المرء ولم يستشهد ويحلف وأن لم يستحلف ويكون أسعد الناس في الدنيا لكع بن لكع لا يؤمن بالله ورسوله۔ (بخاري، التاريخ الكبير، 8 : 278، رقم: 2993، طحاوي، شرح معاني الآثار، 4 : 151، طبراني، المعجم الكبير، 23 : 314، رقم: 711، طبراني، المعجم الأوسط، 8 : 282، رقم: 8643، هيثمي، مجمع الزوائد، 7 : 283، مناوي، فيض القدير شرح جامع الصغير، 5 : 345۔)۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "لوگوں پر ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ سچوں کو جھوٹا اور جھوٹوں کو سچا کہا جائے گا اور خیانت پیشہ لوگوں کو امانت دار اور امانت دار لوگوں کو خیانت پیشہ بتلایا جائے گا۔ بغیر طلب کیے لوگ گواہیاں دیں گے اور بغیر حلف اٹھوائے حلف اٹھائیں گے۔ اور کمینہ ابن کمینہ دنیاوی اعتبار سے سب سے زیادہ خوش نصیب ہو گا۔ جس کا نہ اللہ پر ایمان ہو گا نہ اس کے رسول ﷺ پر"۔

حسنِ اَخلاق اور عدمِ تشدد

حضور نبی اکرم ﷺ نے اہل ایمان کو خوش اخلاقی اور نرمی کی تعلیم دی اور انہیں تشدد اور ظلم سے منع فرمایا۔ حضور نبی اکرم ﷺ جب بھی کسی کو حاکم بنا کر بھیجتے تو انہیں نصیحت فرماتے:۔

يسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا۔

(بخاری، الصحیح، کتاب الجهاد، باب مایکره، 3 : 1104، رقم: 2873، مسلم، الصحیح، کتاب الجهاد والسیر، باب فی الأمر، 3 : 1358، رقم: 1732)۔

”لوگوں کے لئے سہولت فراہم کرو اور مشکلات پیدا نہ کرو۔ لوگوں کو بشارت دو انہیں وحشت زدہ نہ کرو۔ اتفاق باہمی سے رہو اختلافات پیدا نہ کرو“۔

آپ ﷺ حکام اور دیگر مسلمانوں کو یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اپنے ماتحت ملازموں اور عام لوگوں پر سختی نہ کریں حتی کہ حکومت ٹیکس اور واجبات بھی تشدد کے ذریعے وصول نہ کرے۔ آپ ﷺ ہر حالت میں نرمی، خوش اخلاقی اور سہولت کا رویہ اختیار کرنے کا حکم فرماتے۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ نے تمام عمال کو یہ قطعی حکم دے رکھا تھا کہ غیر مسلم رعایا سے بھی جزیہ کی وصولی کے وقت ہر گز تشدد نہ کیا جائے بلکہ انہیں جزیہ اور دیگر واجبات کی ادائیگی میں ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:۔

إنّ الله يعذّب الذين يعذّبون النّاس في الدّنى۔

مسلم، الصحیح، کتاب البر، باب الوعید الشدید، 4 : 2017، رقم: 2613۔

أبو داود، السنن، کتاب الخراج، باب فی التشدید، 2 : 185، رقم: 3045۔

”اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں (لوگوں کو) عذاب دیتے ہیں“۔

عن أبي هريرة رضى الله عنه قال : قال رسول الله ﷺ : يأتى على النّاس زمان يخير الرّجل فيه بين العجز والفجور فمن أدرک ذالک الزمان فليختر العجز على الفجور۔

(حاکم، المستدرک علی الصحیحین، 4 : 484، رقم: 8352، أحمد بن حنبل، المسند، 2 : 447، رقم: 9766، أبو یعلی، المسند، 11 : 287، رقم: 6403، بیهقي، شعب الإیمان، 6 : 320، رقم: 8332)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جس میں آدمی کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ یا تو احمق کہلانے کو اختیار کرے یا بدکاری کو اختیار کرے۔ پس جو شخص یہ زمانہ پائے اسے چاہئے بدکاری اختیار کرنے کی بجائے احمق کہلانے کو اختیار کرے“۔

آپ نے اَخلاقِ حسنہ کے انفرادی اور معاشرتی پہلوئوں کو کئی مواقع پر بیان فرمایا اور ان پر عمل کی تلقین فرمائی:۔

عن عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما عن رسول اللہ ﷺ قال : إنّ اللہ لا یحبّ الفاحش ولا التفحش والّذي نفس محمّد بیدہ لا تقوم السّاعۃ حتّی یظھر الفحش والتفحش وقطیعۃ الرحم وسوء المجاورۃ ویخون الأمین ویؤتمن الخائن۔

حاکم، المستدرک علی الصحیحین، 1 : 147، رقم : 253، حاکم، المستدرک علی الصحیحین، 4 : 558، رقم: 8566، أحمد بن حنبل، المسند، 2 :، 199، رقم: 6872، بزار، المسند، 6 : 410، معمر بن راشد، الجامع، 11 : 405، ابن مبارک، الزھد، 1 : 561، رقم: 1610، ھندي، کنز العمال، 7 : 176۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما حضور نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ بدکاری اور بدکلامی کو ناپسند فرماتا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی جب تک کہ بدکاری، بدزبانی، قطع رحمی اور برے ہمسائے عام نہ ہو جائیں۔ امانت دار کو خیانت کار اور خائن کو امانت دار نہ قرار دیا جانے لگے گا“۔

عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ قال : قال رسول اللہ ﷺ : یأتي علی الناس زمان الصابر فیھم علی دینہ کالقابض علی الجمر۔

ترمذی، السنن، کتاب الفتن عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، باب ماجاء في النھي عن سب الریاح، 4 : 526، رقم: 2260۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جس میں اپنے دین پر ثابت قدم رہنے والے کی مثال ایسے ہو گی جیسے کوئی شخص آگ کے انگاروں سے مٹھی بھرے“۔

سادگی

اسلام نے اپنے پیروکاروں کو سادہ زندگی گزارنے کی تلقین کی ہے اس سے معاشرے میں طبقاتی تقسیم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مادہ پرستی اور نفسا نفسی کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی سادہ زندگی ہمارے سامنے نمونہ عمل ہے۔ آپ ﷺ بہت سادہ لباس زیب تن فرماتے حتی کہ اس وقت جب یمن سے لے کر شام تک اسلام کی سیادت کا پرچم لہرا رہا تھا پیغمبر اسلام ﷺ کے گھر میں صرف ایک معمولی سا پلنگ اور چمڑے کی ایک چھاگل تھی۔ آپ ﷺ کی وفات کے وقت آپ کے گھر میں تھوڑے سے جو کے علاوہ کھانے پینے کی کوئی چیز نہ تھی۔ آپ ﷺ گھر کا زیادہ تر کام خود اپنے ہاتھ سے کر لیا کرتے تھے، کپڑے خود دھو لیتے اپنے جوتے اپنے ہاتھ سے خود سی لیتے تھے، اونٹ خود باندھتے اور اپنے ہاتھ سے اس کے آگے چارہ ڈالتے۔ آپ ﷺ نے اہل ایمان کو زندگی میں سادگی کو شعار بنانے کی تلقین فرمائی:۔

قال ﷺ : من كرامة المؤمن على الله نقاء ثوبه ورضاء باليسير۔

(طبرانی، المعجم الکبیر، 12 : 395، رقم: 13458، ھیثمی، مجمع الزوائد، 5 : 132)۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”مومن کے اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ہونے والی چیزوں میں سے ایک اس کے کپڑوں کا صاف ستھرا ہونا اور قناعت پر راضی رہنا ہے“۔

قال ﷺ : كلوا واشربوا وتصدقوا والبسوا من غير مخيلة ولا تسرفوا فإن الله يحب أن يرى أثر نعمته على عبده۔

دیلمی، الفردوس بماثور الخطاب، 3 : 241۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ ”کھاؤ پیو اور صدقہ کرو اور لباس پہنو جس میں تکبر نہ ہو اور فضول خرچی نہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے پر نعمت کا اثر نظر آئے“۔

قال ﷺ : لا ألبس القميص المكفّف بالحرير۔

(أبو داود، النسن، کتاب الحمام، باب من کرهه، 4 : 48، رقم، 4048، حاکم، المستدرک، 4 : 211، رقم: 7400، بيهقي، السنن الكبريٰ، 3 : 246، رقم: 5768، أحمد بن حنبل، المسند، 6 : 442)۔

”حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میں وہ قمیص نہیں پہنتا جس میں ریشمی کف لگے ہوئے ہوں“۔

قال ﷺ : من لبس ثوب شهرة في الدنيا؛ ألبسه الله تعالى ثوب مذلة يوم القيامة۔

(أحمد بن حنبل، المسند، 2 : 92، رقم: 5664، نسائي، السنن الكبرى، 5 : 460، رقم: 9560)۔

”حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص دنیا میں شہرت اور نام وری کے لئے کپڑے پہنے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے ذلت کا لباس پہنائے گا۔“

قال ﷺ : إن كنتم تحبون حلية الجنة وحريرها فلا تلبسوها في الدنيا۔

(أحمد بن حنبل، المسند، 6 : 145، منذري، الترغيب والترهيب، 1 : 314؛ رقم: 1157، ابن حبان، الصحيح، 12 : 297، رقم: 5486، نسائي، السنن الكبرى، 5 : 434، رقم: 9436)۔

”حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تم جنت کی زینت اور ریشم پسند کرتے ہو تو دنیا میں اسے نہ پہنو“۔

6. قال ﷺ : من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يلبس حريرًا ولا ذهبًا۔

(أحمد بن حنبل، المسند، 5 : 261، رقم: 22302، طبراني، المعجم الأوسط، 3 : 286، رقم: 3168)۔

''حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ سونا اور ریشم نہ پہنے''۔

7. عن عقبة بن عامر قال : أهدي لرسول الله ﷺ فروج حرير فلبسه ثم نزعه قال : لا ينبغي هذا للمتّقين۔

(بخاري، الصحيح، کتاب الصلاة، باب من صلی فی فروج، 1 : 147، رقم: 368، مسلم، الصحيح، کتاب اللباس، باب تحريم استعمال، 3 : 1046، رقم: 2074)۔

حضور نبی اکرم ﷺ کو ریشم کی قبا ہدیہ میں دی گئی آپ نے اسے پہن کر نماز پڑھی پھر کراہت کے ساتھ اسے زور سے کھینچ کر اُتارا پھر فرمایا: ''متقیوں کے لئے یہ لباس مناسب نہیں''۔

8. قال ﷺ : لا يستمتع بالحرير من يرجو أيام الله۔

(أحمد بن حنبل، المسند، 5 : 267، رقم: 22356، طبراني، المعجم الكبير، 8 : 106، رقم: 7510، منذري، الترغيب والترهيب، 3 : 71، رقم: 1321)۔

''حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص ریشمی لباس سے تمتع کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے (اُخروی) انعامات کی اُمید نہ رکھے''۔

9. أنّ علياً كان يلبس القميص ثم يمد الكم حتّى إذا بلغ الأصابع قطع ما فضل ويقول : لا فضل للكمين على اليد۔

بیھقی، شعب الإيمان، 5 : 138، رقم : 6183۔

”حضرت علی رضی اللہ عنہ قمیض پہنا کرتے تھے اور آستین کو کھینچتے یہاں تک کہ جب وہ انگلیوں تک پہنچ جاتی تو اس سے فالتو کو کاٹ دیتے اور فرماتے:۔ آستین کو ہاتھ سے بڑھا ہوا نہیں ہونا چاہیے“۔

10. قال ﷺ : إنّه ليس لنبي أن يدخل بيتًا مزوقًا۔

(أبو داود، السنن، کتاب الأطعمة، باب إجابة الدعوة، 3 : 344، رقم: 3755، ابن ماجه، السنن، کتاب الأطعمة، باب إذا رأى، 2 : 1115، رقم: 3360، بيهقي، السنن الکبری، 7 : 267، رقم: 14337)۔

”حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کسی نبی کے لیے اچھا نہیں کہ وہ نقش و نگار والے گھر میں داخل ہو“۔

تواضع اور رواداری

حضور نبی اکرم ﷺ نے غرباء و مساکین اور فقراء کے ساتھ حسن سلوک اور مساویانہ طرز عمل کی تعلیم دی۔ حضور رحمت عالم ﷺ کی پوری حیات طیبہ میں ہمیں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ آپ ﷺ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے:۔

أللّهم! أحيينی مسكيناً وأمتنی مسكيناً واحشرنی في زمرة المساكين۔

(ترمذی، السنن، کتاب الزهد، باب ماجاء أن الفقراء، 4 : 577، رقم: 2352، ابن ماجه، السنن، کتاب الزهد، باب مجالسة الفقرائ، 2 : 1381، رقم: 4126، حاکم، المستدرک، 4 : 358، رقم: 7911)۔

”اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، حالت مسکینی میں ہی موت دے اور قیامت کے دن مساکین کی ہی جماعت سے اٹھانا“۔

آپ ﷺ کی مجلس میں اکثر نادار، مساکین، فقرا اور معمولی حیثیت کے لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ آپ ﷺ جس طرح صاحب ثروت لوگوں کے ساتھ پیش آتے تھے اس سے بھی زیادہ شفقت سے ان لوگوں سے سلوک فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی رواداری اور حسن سلوک کا اندازہ اس سے لگا لیں کہ فتح کے روز آپ ﷺ نے اپنے خون کے پیاسوں کو" لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ" کا مژدہ جاں فزا سنا کر معاف فرمادیا۔

(قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، 7 : 351، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، 2 : 490، بیھقی، السنن الکبری، 9 : 118)۔

الغرض اسلام انسانیت کو پیار، محبت، الفت، حسن سلوک اور ایک دوسرے سے تعاون کی تعلیم دیتا ہے۔ تواضع اور رواداری کی تلقین ہمیں سیرۃُ الرسول ﷺ کے ہر ہر نقش سے نمایاں نظر آتی ہے:۔

عن أنس بن مالک قال : قال رسول اللہ ﷺ : لا تقوم السّاعة حتّی یتباھی النّاس في المساجد۔

(نسائي، السنن، کتاب المساجد، باب المباھاۃ في المساجد، 2 : 32، رقم: 689، أبو داود، السنن، کتاب الصلاۃ، باب في بناء المساجد، 1 : 123، رقم: 449، ابن ماجہ، السنن، کتاب المساجد والجماعات، باب تشیید المساجد، 1 : 244، رقم: 739، دارمي، السنن، کتاب الصلاۃ، باب في تزویق المساجد، 1 : 383، رقم: 1408، ابن حبان، الصحیح، 4 : 493، رقم: 1614، أحمد بن حنبل، المسند، 3 : 134، رقم: 12402)۔

"حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: قیامت قائم نہ ہو گی یہاں تک کہ لوگ مسجدوں میں (بیٹھ کر یا مساجد کے بارے میں) فخر کرنے لگیں گے"۔

اِنسانی اُخوت

اسلام نے اپنی آمد کے بعد انسانیت کی منتشر صفوں میں اتحاد و الفت اور اخوت کی روح پیدا کریں۔ ایک دوسرے کے جانی دشمنوں کو بھائی بھائی بنادیا۔ عداوت، حسد، کینہ اور بغض کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن تو ساری دنیا کے اہلِ کتاب کو دعوت اتحاد دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآئٍم بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ. (سورہ آل عمران،3 : 64)۔

''آپ فرمادیں: اے اہلِ کتاب! تم اس بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے''۔

دوسری طرف اُخوتِ اسلامی کی بنیاد اللہ تعالی کے اس حکم پر ہے:۔

''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَo الحجرات،49 : 10''۔

''بات یہی ہے کہ (سب) اہلِ ایمان (آپس میں) بھائی ہیں۔ سو تم اپنے دو بھائیو کے درمیان صلح کرایا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔'' ان آیاتِ مقدسہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام دنیا میں امن و آتشی کا دین ہے جو چہار دانگ عالم میں اتحاد و اتفاق کے پرچم بلند کر کے پوری دنیائے انسانیت کو وحدت کی لڑی میں پرونا چاہتا ہے۔

خواتین کا احترام

قبل از اسلام عورت کو مال و جائیداد میں حصہ دار نہیں بنایا جاتا تھا۔ اسلام نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ عورت کو وراثت میں شامل کیا۔ قرآن میں ارشاد ہے:۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِى عَلَيْهِنَّ بِالْمَعرُوفِ. البقرۃ،2 : 228۔

''اور دستور کے مطابق عورتوں کے بھی مردوں پر اسی طرح حقوق ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر''۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:۔

استوصوا بالنّساء خیراً۔

(بخاری، الصحیح، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب خلق آدم، 3 : 1212، رقم: 3153، 2. مسلم، الصحیح، کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء، 2 : 1090، رقم: 1468)۔

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو''۔

موجودہ دنیا اس بات پر نازاں ہے کہ اس نے عورت کو مساوی حقوق دلوائے حالانکہ اگر حقائق کو مسخ نہ کیا جائے اور حقیقت پسندانہ انداز میں تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات اور سیرت مبارکہ نے سب سے پہلے عورت کو مظلومیت کی زنجیروں سے آزاد کرایا اور معاشرے میں باوقار زندگی گزارنے کا حق دیا۔

معاشی مساوات

اگر حضور نبی اکرم ﷺ کی عطا کردہ تعلیمات اور اسلام کے معاشی نظام کو دیکھا جائے تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اسلام معاشی مساوات کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ یہ طبقاتی تقسیم کا سخت مخالف اور دولت کو چند ہاتھوں میں جمع کرنے کی نفی کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوْا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِo الحشر، 59 : 7۔

''جو (اموال فَے) اللہ نے (قُرَیظہ، نَضِیر، فِدَک، خَیبر، عُرَینہ سمیت دیگر بغیر جنگ کے مفتوحہ) بستیوں والوں سے (نکال کر) اپنے رسول (ﷺ) پر لوٹائے ہیں وہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے لئے ہیں اور (رسول ﷺ کے) قرابت داروں (یعنی بنو ہاشم اور بنو المطّلب) کے لئے اور (معاشرے کے عام) یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے لئے ہیں (یہ نظامِ تقسیم اس لئے ہے) تاکہ (سارا مال صرف) تمہارے مال داروں کے درمیان ہی نہ گردش کرتا رہے (بلکہ معاشرے کے تمام طبقات میں گردش کرے) اور جو کچھ رسول (ﷺ) تمہیں عطا فرمائیں سو اُسے لے لیا کرو

اور جس سے تمہیں منع فرمائیں سو (اُس سے) رُک جایا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو (یعنی رسول ﷺ کی تقسیم وعطا پر کبھی زبانِ طعن نہ کھولو)، بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے"۔

دوسرے مقام پر قرآن میں اِرتکازِ دولت کی مذمت یوں بیان کی گئی ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍo(سورۃالتوبۃ،9 : 34)۔

"اور جو لوگ سونا اور چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیں"۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ضرورت سے زائد مال کو ضرورت مندوں تک پہنچانے کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:۔

إنّ رسول الله ﷺ نظر إلى رجل يصرف راحلته في نواحي القوم فقال النبيّ ﷺ : من كان عنده فضل ظهر فليعد به على من لا ظهر له ومن كان له فضل زاد فليعد به على من لا زاد له حتّى رأينا أن لا حق لأحد منّا في فضل. (أحمد بن حنبل، المسند، 3 : 34، رقم: 11311)۔

"حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنی سواری کو ایک آبادی کی طرف موڑ رہا تھا تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اس زائد سواری کو اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس خوراک کا ذخیرہ ہے وہ ایسے شخص کو دے دے جس کے پاس کھانے کو نہیں حتیٰ کہ ہم یہ خیال کرنے لگے کہ ہم میں سے کسی کو زائد مال پر کوئی اختیار نہیں"۔

علم وحکمت کا فروغ

اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر تشکیلی کی رو سے خلائق کائنات نے انسان کو نعمت وجود (تخلیق) سے نوازنے کے بعد سب سے پہلے "علم الاسماء" کی دولت سے مالامال کیا اور یہ وہ دولت تھی جس سے ملائکہ بھی تہی دامن تھے۔ قرآن کہتا ہے:۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلاَئِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَoقَالُواْ سُبْحَانَكَ لاَ عِلْمَ لَنَا إِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ. البقرۃ،2 : 31،32۔

"اور اللہ نے آدم (علیہ السلام) کو تمام (اشیاء کے) نام سکھا دیے پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا، اور فرمایا: مجھے ان اشیاء کے نام بتا دو اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہوo فرشتوں نے عرض کیا: تیری ذات (ہر نقص سے) پاک ہے ہمیں کچھ علم نہیں مگر اسی قدر جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، بیشک تو ہی (سب کچھ) جاننے والا حکمت والا ہے"۔

اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام نے پہلے ہی دن سے "عقلیت" کی اہمیت پر زور دیا۔ قرآن اپنے مخاطبین سے عقل و خرد اور فہم و تدبر کے استعمال کا بار بار مطالبہ کرتا ہے۔ **اَفَلا تَعْقِلُوْنَ، (1) اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ، (2) اور اَفَلا يَتَفَكَّرُوْنَ(3)** اس کی دعوت کا عام جز ہے۔ اسی معقولیت پسند تعلیم کا نتیجہ ہے کہ وہ کورانہ تقلید کو جو اُمم ماضیہ میں عام تھی، شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن پچھلی اُمتوں کے بارے میں کہتا ہے:۔

(1) البقرۃ،2 : 44،(2) النساء،4 : 82،(3) آل عمران،3 : 191۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللهِ. التوبۃ،9 : 31۔

"انہوں نے اللہ کے سوا اپنے عالموں اور زاہدوں کو رب بنالیا تھا"۔

ان مدعیان علم و حکمت نے خدا کے بندوں کو اوہام باطل کا شکار بنا رکھا تھا جن کے بارِ گراں سے ان کی مضطرب انسانیت کچلی جا رہی تھی۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا انسانیت پر بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے اس کو اپنے ہی نبی کی ذہنی غلامی سے آزاد کیا۔ قرآن کہتا ہے:۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ. الاعراف،7 : 157۔

''اور ان سے ان کے بارِ گراں اور طوقِ (قیود) جو ان پر (نافرمانیوں کے باعث مسلّط) تھے، ساقط فرماتے (اور انہیں نعمتِ آزادی سے بہرہ یاب کرتے) ہیں''۔

حضور نبی اکرم ﷺ عطا کردہ تہذیب کی اساس ہی یہ تھی کہ وحی اِلٰہی کا آغاز ہی اِقْرَاْ کے ایجابی اَمر سے ہوا:۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِيْ خَلَقَo العلق،96 : 1۔

''(اے حبیب!) اپنے رب کے نام سے (آغاز کرتے ہوئے) پڑھیے جس نے (ہر چیز کو) پیدا فرمایا''۔

اور انسان پر معبود برحق کی سب سے بڑی نعمت یہ بتائی گئی کہ اس نے اس نادان کو دانائی سکھائی:۔

اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُo الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِo عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْo العلق،96 : 3،4،5۔

''پڑھیئے اور آپ کا رب بڑا ہی کریم ہےo جس نے قلم کے ذریعے (لکھنے پڑھنے کا) علم سکھایاo جس نے انسان کو (اس کے علاوہ بھی) وہ (کچھ) سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا''۔

سبق نمبر 10

اسلام کا معاشی نظام اور سود

اسلام کا معاشی نظام

اسلام نے کسبِ حلال کو اہم ترین فریضہ قرار دیا ہے اور تجارت، زراعت، صنعت اور ملازمت وغیرہ کے ذریعہ اپنی روزی خود کمانے کی تاکید کی ہے اسلامی معاشی پالیسی کا یہ بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے کہ دولت کی گردش پورے معاشرے میں عام ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ مال صرف مال داروں میں ہی گھومتا رہے، مال دار کا مال دن بدن بڑھتا رہے اور غریب روز بروز کنگال ہوتا جائے۔ معاش کے سلسلے میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ سرمایہ کی گردش ہے۔ سرمایہ کی گردش اگر اس طرح ہو کہ وہ ہر طبقہ کے لوگوں تک پہنچتا رہے تو سب لوگ خوش حال ہوں گے اور اگر وہ صرف چند لوگوں کے درمیان گھومے تو خوش حالی بھی چند لوگوں کے حصے میں آئے گی اور بقیہ لوگ بدحالی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں گے۔ سرمایہ کی گردش معاشرہ کے جتنے زیادہ افراد کے درمیان ہوگی، اتنی ہی زیادہ اس کی قیمت بڑھتی چلی جائے گی۔ اسلام نے ایسا معاشی نظام برپا کیا کہ دولت پر بااثر لوگوں کی اجارہ داری قائم نہ رہے اور دولت کا بہاؤ امیروں کے ساتھ ساتھ غریبوں کی طرف بھی رہے: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (سورۃ الحشر، آیت ۷)۔

اسلام افراد معاشرہ کے درمیان معاشی مساوات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ معاشی مساوات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک شخص کے پاس جتنی دولت ہو اتنی ہی دولت دوسرے کے پاس بھی ہو، کیونکہ ایسی مساوات غیر فطری بھی ہے اور ناقابلِ عمل بھی۔ معاشرے کے ہر فرد کے پاس یکساں مال و دولت ہو ایسا ممکن نہیں ہے۔ ذہنی صلاحیت میں کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف افراد کے درمیان فرق ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر حقیقی معنوں میں کوئی مؤثر تمدنی نظام قائم نہیں ہو سکتا ہے۔ مگر دو انسانوں کے درمیان یہ فرق کا تناسب لامحدود نہیں ہونا چاہیے اور عہدہ کے اعتبار سے اعزازات، رعایتوں

اور فضول رسمی تحفظات کے چونچلے ختم کر دینے چاہئیں۔ اسلام جس مساوات کو چاہتا ہے، وہ یہ ہے معاشرہ کے تمام افراد کو یکساں مواقع حاصل ہوں اور مال و دولت کی کمی بیشی کے ساتھ ساتھ افراد معاشرہ کے معیارِ زندگی اور مظاہرِ معیشت میں زیادہ فرق نہ ہو۔ اسلام نے وہ تمام فرق جو محض عہدہ اور حیثیت کی بنا پر قائم کیے جاتے ہیں، ان کو مٹا دیا اور صرف نام نہاد مساوات کی جگہ حقیقی تمدنی مساوات اور معاشی انصاف قائم کیا ہے۔

معاشرہ میں سرمایہ کی صحیح گردش کا دوسرا میدان کاروبار اور تجارتی لین دین ہے جو عام لوگوں کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ معاصر دنیا میں اس سلسلے میں دو نظریے پائے جاتے ہیں: ''ایک قومی ملکیت کا نظریہ'' اور دوسرے بے قید ملکیت یا بالفاظ دیگر ''سرمایہ داری کا نظریہ''۔ قومی ملکیت کے نظریہ کے تحت اسٹیٹ کے تمام کاروبار قومی ملکیت بنا کر قومی ملکیت میں دے دیئے جاتے ہیں اور لوگ اپنی اپنی وسعت کے لحاظ سے کام کرتے ہیں اور پھر اس قومی ملکیت سے اپنا حصہ پاتے ہیں۔ قومی ملکیت کا نظام سوویت روس میں بزور اور بہت جوش و جذبہ کے ساتھ نافذ کیا گیا۔ لیکن غیر فطری ہونے کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔

دوسری طرف ''سرمایہ دارانہ نظام'' میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بے روک ٹوک اپنی آمدنی مسلسل بڑھاتا چلا جائے۔ اس پر نہ اخلاقی کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے مال میں غریبوں کو کچھ دے اور نہ اس پر ایسی کوئی پابندی ہوتی ہے کہ وہ غریبوں کا مال سودی اور ناجائز ذرائع سے حاصل کرنے سے گریز کرے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اصل مقصود حصولِ زر ہوتا ہے، اس میں رحم دلی، حاجت برآری اور غریب پروری کا کوئی خانہ نہیں ہے۔ اس بے قید نظامِ معیشت کا خاصہ یہ ہے کہ جب یہ اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو دولت ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر صرف چند مٹھیوں میں جمع ہو جاتی ہے اور کاروبار پر ان کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے اور عوام کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ ان مٹھی بھر سرمایہ داروں کی ملازمت کریں یا ان کے ایجنٹ بن کر ان کے کاروبار کو فروغ دیں۔

مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے دولت کا توازن ختم کر دیا ہے۔ اسلامی نظام میں معاشرے میں دولت کی گردش بیع و شراء اور جائز تبادلہ پر مبنی تھی؛ لیکن مغرب کے مالی نظام کی بنیاد سود ٹھہرایا گیا جو انسانی تاریخ کے ہر دور میں غریبوں کا خون چوسنے اور کمزور کو مزید کمزور اور دست نگر رکھنے کا ذریعہ رہا ہے۔ آج اسی نظام کا نتیجہ ہے دولت چند ہاتھوں کی باندی بنی ہوئی ہے اور وہ جس طرف چاہتے ہیں دنیا کے مالی نظام کو گھما پھرا رہے ہیں۔ آج جو مال

دار ہے وہ مزید مال دار ہو رہا ہے اور غریب شخص غربت کے دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام لوٹ گھسوٹ کا نظام ہے، اس نظام کا خمیر ہی بخل و حرص سے اٹھایا گیا ہے۔

عقائد و عبادات کی طرح معاملات بھی دین کا ایک اہم شعبہ ہے، جس طرح عقائد اور عبادات کے بارے میں جزئیات و احکام بیان کیے گئے ہیں، اسی طرح شریعت اسلامی نے معاملات کی تفصیلات بھی بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ حلال و حرام، مکروہ اور غیر مکروہ، جائز اور طیب مال کے مکمل احکام قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور شریعت کی دیگر جزئیات کی طرح اس میں بھی مکمل رہنمائی کی گئی ہے، جو لوگ نماز اور روزہ کا اہتمام کرتے ہیں؛ مگر صفائی معاملات اور جائز و ناجائز کی فکر نہیں کرتے، وہ کبھی اللہ کے مقرب نہیں ہو سکتے؛ اس لیے ان کا عمل شریعت پر ناقص ہے، افسوس ہے کہ عرصۂ دراز سے مسلمانوں کے درمیان معاملات سے متعلق جو شرعی احکام ہیں ان کی اہمیت دلوں سے مٹ گئی ہے اور دین صرف عقائد و عبادات کا نام سمجھا جانے لگا، حلال و حرام کی فکر رفتہ رفتہ ختم ہو گئی ہے اور دن بہ دن اس سے غفلت بڑھتی جا رہی ہے، جس کے سبب مسلمان اقتصادیات میں پیچھے ہیں اور خاطر خواہ معاشیات میں انھیں ترقی نہیں مل رہی ہے۔

تجارت کسبِ معاش کا بہترین طریقہ ہے، اسے اگر جائز اور شرعی اصول کے مطابق انجام دیا جائے تو دنیوی اعتبار سے یہ تجارت نفع بخش ہو گی اور اخروی اعتبار سے بھی یہ بڑے اونچے مقام اور انتہائی اجر و ثواب کا موجب ہو گی، تجارت اگرچہ دنیا کے حصول اور مالی منفعت کے لیے کی جاتی ہے، تاہم یہ خدا کا فضل ہے کہ زاویۂ نگاہ اگر تھوڑا سا تبدیل کر دیا جائے اور تجارت کرنے والے یہ سوچ لیں کہ خدا کا حکم ہے، حلال روزی کی تلاش اور حلال پیسوں کے ذریعے اولاد کی پرورش، بیوی اور والدین کی ضروریات کی تکمیل ہے، اس لیے ماتحتوں کے حقوق ادا کرنے اور غریب و نادار افراد کی مدد کرنے کے لیے یہ کاروبار کر رہے ہیں اور پھر وہ کاروبار بھی اسلامی اصول کی روشنی میں کیا جائے تو ایسی تجارت کی بڑی فضیلت آئی ہے اور ایسے افراد کو انبیاء و صلحاء کی معیت کی خوشخبری دی گئی ہے، ایک موقع پر رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

" التاجر الصدوق الأمين مع النبين والصديقين والشهداء " (سنن الترمذي، حديث نمبر :١٢٥٢)۔

"جو تاجر تجارت کے اندر سچائی اور امانت کو اختیار کرے تو وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہو گا"۔

ایک دوسری روایت میں ہے:۔

"التجار يحشرون يوم القيامة فجارًا إلّا من اتقى وَبَرَّ وصدق " (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر:۴۵۴۰)۔

"تجار قیامت کے دن فاسق وفاجر بنا کر اٹھائے جائیں گے؛ مگر جو لوگ تقوی وسچائی اور اچھی طرح سے معاملہ کرے گے وہ اس میں شامل نہیں ہوں گے"۔

اہل علم اور فقہاء کرام نے قرآن وحدیث کی روشنی میں کامیاب اور نفع بخش تجارت کے لیے چند اصول بیان کیے ہیں، جن کی روشنی میں تجارت کی جائے تو دنیا میں بھی نفع ہو گا اور آخرت کے اعتبار سے بھی یہ تجارت بے انتہاء اجر وثواب کا باعث ہو گی، یعنی ان کی یہ تجارت دین کی سرگرمیوں میں شامل ہو جائے گی۔ ایک تاجر کو چاہیے کہ تجارت کرتے ہوئے ضرور ان اصولوں کو پیش نظر رکھیں۔ افادۂ عام کے لیے نمبر وار ذیل کی سطروں میں ان اصول وضوابط کو لکھا جارہا ہے:۔

۱۔ کاروبار کو فروغ دینے کے لیے ہمیشہ سچائی اختیار کیجیے، جھوٹ بولنے اور جھوٹی قسمیں کھا کر جو لوگ اپنی تجارت کو فروغ دیتے ہیں، وقتی طور پر اگرچہ نفع معلوم ہوتا ہے۔ مگر در حقیقت ایسی کمائی اور ایسی تجارت سے برکت اٹھالی جاتی ہے، رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

"فإن صدقا وبينا بورک لهما في بيعهما وإن كتما وكذبا محقت بركة بيعهما" (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۱۹۳۷)۔

"خریدنے اور بیچنے والے اگر سچائی سے کام لیں اور معاملے کو واضح کر دیں تو ان کی خرید وفروخت میں برکت دی جاتی ہے اور اگر دونوں کوئی بات چھپالیں اور جھوٹ بولیں تو ان کے کاروبار سے برکت اٹھالی جاتی ہے"۔

ایک دوسری روایت میں ہے:۔

"قیامت کے روز اللہ تعالی تین شخصوں سے بات کرے گا، نہ ان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھے گا اور نہ ان کو پاک صاف کر کے جنت میں داخل کرے گا (اس میں سے ایک) جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے کاروبار کو فروغ دینے کی کوشش کرتا ہے" (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۳۰۶)۔

اور آپ ﷺ نے ایک موقع پر یہ بھی فرمایا:۔

"اپنا مال بیچنے کے لیے کثرت سے جھوٹی قسمیں کھانے سے بچو! یہ چیز وقتی طور پر تو فروغ کی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آخر کار کاروبار سے برکت ختم ہو جاتی ہے" (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۴۲۱۰)۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا بیچنے والوں کو جھوٹی قسمیں کھانے اور جھوٹ بولنے سے مکمل طور پر احتیاط کرنی چاہیے، جھوٹ کا سہارا لینا خریدار کو دھوکہ دینا اور دھوکہ دہی بڑے گناہ اور فسادِ عظیم کا باعث ہے جس سے اسلام نے سختی سے منع کیا ہے۔

۲۔ مال کا عیب چھپانے اور خریدار کو فریب دینے سے پرہیز کیجیے۔ بسا اوقات مال بیچنے والے نقلی مال اصلی بتا کر بیچتے ہیں اور کبھی مال کے عیوب کو چھپا لیتے ہیں، اس طرح مال فروخت کرنے پر وہ اپنے آپ کو ہوشیار، چالاک اور بہت عقلمند تصور کرتے ہیں۔ یاد رکھیے! یہ عقلمند نہیں، انتہائی گھاٹے کا سودا ہے، یہ لوگ دنیا و آخرت دونوں جگہ خسارے میں رہیں گے۔

ایک بار رسول اللہ ﷺ غلے کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے، آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک اس ڈھیر میں ڈالا تو انگلیوں پر کچھ تری محسوس ہوئی، آپ ﷺ نے غلے والے سے پوچھا یہ کیا ہے؟ دوکان دار نے کہا: یا رسول اللہ! اس ڈھیر پر بارش ہو گئی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تم نے بھیگے ہوئے غلے کو اوپر کیوں نہیں رکھ دیا کہ لوگ اسے دیکھ لیتے، جو شخص دھوکہ دے، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں" (صحیح مسلم، حدیث نمبر : ۲۹۵)۔

شریعت کی رو سے تجارت کا اہم اصول یہ ہے کہ مال کا کوئی عیب نہ چھپایا جائے، صاف صاف تمام چیزیں بیان کر دی جائیں، ایسے ہی کاروبار میں غیب سے برکت نازل ہوتی ہے اور وہ کاروبار فروغ پاتا ہے۔

۳۔ کاروبار میں ہمیشہ دیانت و امانت اختیار کیجیے، مال اچھا ہے تو اچھا بتائے اور خراب ہے تو اس کی بھی وضاحت کر دیجیے، کبھی کسی کو خراب مال دے کر یا مجبوری کے وقت عرف و عادت سے زیادہ نفع لے کر اپنی حلال کمائی کو حرام نہ بنائیے، حرام رزق ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اس لیے تھوڑا کمائیں، مگر حلال اور طیب مال حاصل کرنے کی کوشش کیجیے، سچے اور امانتدار تاجرین کی حدیث میں بڑی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں۔

۔۴۔ ناپ تول میں کمی نہ کیجیے، تجارتی معاملات میں یا عام لین دین حق دار کو اس کے حق سے کم دینا ہلاکت اور خسارہ کا باعث ہے، قرآن نے خاص طور پر اس سے دور رہنے کی ہدایت دی ہے اور ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو اللہ کے غضب سے بچنے کی تلقین کی:۔

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ oالَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ oوَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ o أَلَا يَظُنُّ أُولٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوْثُوْنَ oلِيَوْمٍ عَظِيْمٍ oيَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾(سورۃ المطففین: ۱۔ ۶)۔

''تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں پورا پورا لیتے ہیں، جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انھیں کم دیتے ہیں، کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں، اس دن کہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے''۔

اپنا حق کسی کے ذمہ ہو تو اسے حق سے زیادہ وصول کرنا اور دوسروں کا حق اپنے اوپر ہو تو حق سے کم دینا، یہ عام ذہن اور عام سوچ ہے۔ مگر یہ سوچ اور یہ طریقہ کار درست نہیں ہے، یہ طریقہ اور انداز غیر شرعی اور ناپسندیدہ ہے، ایسے افراد کے لیے خدا نے تباہی اور ہلاکت کی دھمکی ہے، ظاہر ہے جس کام پر اللہ تعالی ہلاکت کی دھمکی دے اس میں خیر کا کوئی پہلو نہیں ہو سکتا ہے، وہ ہر اعتبار سے بُرا اور قابلِ نفرت ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو کم تولنے کے بجائے جھکتا تولنے کی نصیحت فرمائی ہے:۔

'' زِن ورجح '' (ترمذی،، حدیث نمبر : ۱۳۵۳)۔

''جب تم وزن کیا کرو تو زیادہ کرو''۔

دوسرے موقع پر فرمایا:۔

''إذا وزنتم فأرجحوا '' (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۳۰۷)۔

''جب تم وزن کرو تو زیادہ کرو''۔

۔۵۔ تجارت کرنے کے ساتھ حقوق اللہ کی ادائیگی کا خاص خیال رکھا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کاروبار میں ڈوب کر خدا سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے، ایسے کاروبا میں کبھی اللہ کی رحمت نازل نہیں ہو سکتی، تجارت یقینا اچھی چیز ہے، مگر اس کے حدود میں رہتے ہوئے یہ کیا جائے، ضرورت سے زیادہ اس میں مشغولیت ہلاکت اور موجبِ خسارہ ہے۔ اس لیے علماء اور اہلِ تحقیق نے لکھا ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آئے کہ ایک طرف معاشی تقاضے ہوں اور در سری طرف دینی تقاضے تو ایک مؤمن کو چاہیے کہ معاشی تقاضے کو چھوڑ کر دینی تقاضے کی طرف دوڑ پڑے، اگر ایسا کیا تو دنیوی واخروی دونوں اعتبار سے وہ کامیاب ہو گا۔

اسی طرح تجارت پیشہ افراد کو چاہیے کہ ہاتھ پاؤں کاروبار میں مشغول رکھیں اور اپنے دل ودماغ کو خدا کی یاد میں بسائے رکھیں، ان کی توجہ ہر آن خدا کی طرف لگی ہوئی ہو، جب کبھی اذان ہو فوری طور پر مسجد کی طرف دوڑ پڑیں، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے خدا کی حمد وثنا اور عظمت وکبریائی کے کلمات زبان سے نکل رہے ہوں۔

معاش کی اہمیت مؤمن کو اس دھوکہ میں نہ ڈال دے کہ یہی سب سے بڑی چیز ہے اور یہی زندگی کا اصل مسئلہ ہے۔ بلکہ وہ خدا کی رحمت اور اس کے اخروی انعام کو ہی اصل اور سب سے بڑی چیز سمجھیں اور کسی بھی حال میں دنیا سے لَو نہ لگائیں۔

حضراتِ صحابہؓ تجارت کرتے مگر جب بھی اللہ کا حق سامنے ہوتا وہ تجارت کو چھوڑ کر اس کی ادائیگی میں مشغول ہو جاتے، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:۔

"كان القوم يتبايعون ويتجرون ولكنهم إذا نابهم حق من حقوق الله لم تلههم تجارة ولا بيع عن ذكر الله حتى يؤدوه إلى الله"(صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب التجارة في البر)۔

"صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خرید وفروخت کرتے، تجارت کرتے تھے؛ لیکن جب انھیں اللہ کے حقوق میں سے کوئی حق پیش آتا تو تجارت اور بیع اللہ کے ذکر سے نہ روک سکتی، تا آں کہ وہ اللہ کے حق کو ادا کر دیتے"۔

صحابہؓ کی زندگی ہمارے لیے قابلِ تقلید ہے، جن کی رسولِ اکرم ﷺ نے خاص تربیت فرمائی تھی، ان میں ایمان اتنا راسخ تھا کہ ایمانی تقاضوں پر کسی شئ کا غلبہ نہیں ہو سکتا تھا، وہ وہی کرتے جس کا مطالبہ ایمان کی جانب سے ہوتا، دنیا اور دنیا کی خواہشات نے کبھی ان کے دل و دماغ کو آلودہ نہیں کیا، یقیناً ہمارے لیے ان کی زندگی میں ہزارہا عبرتیں پوشیدہ ہیں۔

۷۔ اپنے مال میں غریبوں کا حق تسلیم کیجیے، اگر آپ صاحبِ نصاب ہیں تو مکمل حساب و کتاب کر کے زکوۃ نکالیے اور صاحبِ نصاب نہیں ہیں تو بھی فقراء و مساکین کو خدا کے نام پر کچھ نہ کچھ دیتے رہیے، صدقہ و خیرات کی عادت ڈالیے، کسی سائل کو اپنے در سے محروم نہ کیجیے اور نہ اسے ڈانٹیے اور نہ بُرا بھلا کہیے، کیا معلوم اللہ تعالیٰ کب کس کی زبان سے نکلی ہوئی بات قبول کر لے، وہ شخص خوش ہو گا تو اس کی زبان سے دعائیں نکلیں گی اور نہ دینے پر ناراض ہو گا اور وہ بد دعا کرے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ در پر آنے والا جیسا بھی ہو اسے خالی واپس نہ کریں، اسی طرح دینی اداروں اور ملی کاموں میں بھی مالی تعاون کے ذریعہ حصہ لے کر اپنی اجتماعی حوصلہ مندی اور دین کے لیے سب کچھ قربان کرنے کا ثبوت دیجیے۔

۸۔ خریداروں کے ساتھ ہمیشہ نرمی کا معاملہ کیجیے، اچھے اخلاق، اچھی زبان اور میٹھے الفاظ کے ذریعہ خریداروں کو اعتماد میں لیا جا سکتا ہے، ان کا اعتماد جب آپ پر ہو جائے گا تو دوسری دکانوں کی بجائے وہ آپ کے پاس ہی آئیں گے، ایسے وقت کاروبار کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ ان کے ساتھ خیر خواہی کریں، کم سے کم نفع پر مال دے کر اچھے اخلاق کا ثبوت دیں، ان کو کبھی دھوکہ نہ دیں، اگر کبھی وہ آپ سے ادھار مانگیں تو اپنی گنجائش کے مطابق انھیں مایوس نہ کیجیے اور ادھار دینے کے بعد مطالبہ کے وقت سخت لب و لہجہ استعمال نہ کیجیے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

"رحم الله رجلا سمحا إذا باع وإذا اشترى وإذا اقتضى" (صحيح البخاري، حديث نمبر: ۲۰۷۶)۔

"خدا اس شخص پر رحم فرمائے جو خرید و فروخت اور تقاضا کرنے میں نرمی اور خوش اخلاقی سے کام لیتا ہے"۔

ایک موقع پر یہ بھی فرمایا:۔

"من سره أن ينجيه الله من كرب يوم القيامة فلينفس عن معسر أو يضع عنه" (صحيح مسلم: ۴۰۸۳)۔

”جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ خدا اس کو روزِ قیامت کے غم اور گھٹن سے بجائے تو اسے چاہیے کہ تنگ دست قرض دار کو مہلت دے یا قرض کا بوجھ اس کے اوپر سے اتار دے، یعنی معاف کر دے“۔

کسی نے اگر قرض لیا ہو، اس سے بھی نرم گفتگو اختیار کرنے کی ہدایت دی گئی ہے، کیا معلوم کہ وہ کس پریشانی اور تکلیف میں ہے، اللہ کا کرم اور احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم دوسروں کو قرض دے رہے ہیں، ورنہ ہمیں بھی وہ محتاج بنا سکتا تھا۔

۔۹۔ حرام اشیاء کی تجارت نہ کیجیے، جو اشیاء اسلام نے حرام قرار دی ہیں، ان کو مال تجارت بنانا یا ان کی خرید و فروخت کرنا بھی حرام ہے، جیسے شراب، افیوں، ہیروئن وغیرہ..... اسی طرح لاٹری، سٹہ بازی، قُحبہ گری، سودی لین دین، اخلاق سوز فلمیں اور آڈیو ویڈیو کیسٹس، آلات موسیقی، گانے بجانے کے اسکول یا اکیڈمیاں، اخلاق سوز ناول، فحش لٹریچر اور رسالے وغیرہ اس ممانعت میں شامل ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:۔

”إن الله ورسوله حرم بيع الخمر والميتة والخنزير والأصنام“ (صحیح البخاري حدیث نمبر:۲۲۳۶)۔

”اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے“۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:۔

”إن الله إذا حرم شيئا حرم ثمنه“ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۴۹۳۸)۔

”اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حرام قرار دیا ہے، اس کی قیمت کو بھی حرام قرار دیا ہے“۔

مذکورہ حدیث میں اگرچہ بعض چیزوں کا تذکرہ ہے؛ مگر جتنے ناجائز امور ہیں، ان سب کا یہی حکم ہو گا، مسلمانوں کو چاہیے کہ حرام اور ناجائز چیزوں کو بیع کا مال نہ بنائیں، اس میں گناہ اور عصیان پر تعاون لازم آئے گا، جو بجائے خود غضب الٰہی کو دعوت دیتا ہے۔

۔۱۰۔ دکان کو وقت پر کھولیے، کوشش کیجیے کہ صبح کی اولین ساعتوں میں کاروبار کا آغاز کیا جائے۔ اس لیے کہ رسول اکرم ﷺ نے صبح کے وقت کیے جانے والے کاموں میں برکت کی دعا فرمائی ہے، خود رسول اکرم ﷺ کا معمول تھا کہ جب بھی آپ ﷺ چھوٹا دستہ یا بڑا لشکر روانہ کرتے تو دن کے ابتدائی وقت روانہ فرماتے، روایت میں ہے:۔

''حضرت صخر رضی اللہ عنہ ایک تاجر تھے، جب وہ اپنے آدمیوں کو تجارت کے لیے روانہ کرتے تو دن کے ابتدائی حصہ میں روانہ کرتے تھے، جس کی وجہ سے وہ صاحبِ ثروت ہوئے اور ان کے پاس مال کی کثرت و فراوانی ہو گئی''۔

کمانے کے بنیادی ذرائع

اللہ تعالی نے انسان کو اس دنیا میں بھیجا اور اس کے لیے اس زمین پر گزارا کرنے کے لیے اسباب اور وسائل رکھ دیئے۔ ان اسباب کو استعمال کر کے انسان اپنی روزی کا بندوبست کرتا ہے۔ بنیادی طور پر انسان کمانے کے لیے تین ذرائع اختیار کرتا ہے: ۔

۔1۔ قدرتی ذرائع

اس سے مراد وہ طریقے ہیں جن میں براہ راست اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے وسائل کو حاصل کیا جاتا ہے اور اس سے روزی کمائی جاتی ہے، جیسے: زراعت، کان کنی، ماہی گیری یا جنگلات سے لکڑیاں، شہد یا کوئی اور چیز حاصل کرنا۔ ان طریقوں میں اللہ کے دیئے ہوئے وسائل کا حصول ہو رہا ہوتا ہے۔

۔2 ۔ صنعتی ذرائع

دوسرے وہ ذرائع معاش ہیں جن کا تعلق براہ راست قدرتی وسائل کو حاصل کرنے سے نہیں ہے۔ بلکہ اس میں لوگ ان قدرتی وسائل کو استعمال کرتے ہوئے، ان کو مزید کارآمد اشیا میں تبدیل کرتے ہیں۔ تمام صنعتی کاروبار کی بنیاد یہی ذریعہ معاش ہے، جیسے: کپاس زراعت کے نتیجے میں حاصل ہو گئی۔ اب اسے دھاگے میں تبدیل کرنا، اس سے کپڑا بنانا اور اسے بیچنا۔ اسی طرح لکڑی جنگلات سے حاصل ہو گئی، اس سے میز یا کرسی بنانا ثانوی ذرائع معاش میں آئے گا۔

۔3 ۔خدمات

تیسری قسم کی وہ سرگرمیاں اختیار کی جاسکتی ہیں جن کی وجہ سے پہلے دو ذرائع کی مدد ہو، مثلاً: زرعی پیداوار کو بازار تک پہنچانے کی خدمات فراہم کرنا۔ اسی طرح صنعت کے لیے افرادی قوت فراہم کرنا، سرمایہ فراہم کرنا، ڈاک کی سہولیات فراہم کرنا، ٹرانسپورٹیشن کی سہولت فراہم کرنا۔ اس قسم کی سرگرمیوں کے نتیجے میں بھی کمایا جاسکتا ہے۔

محنت اور ہنر مندی سے کمانے کے مختلف طریقے

ہنر مندی اور محنت سے کمانے کی درج ذیل مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں: ۔

۔1 ۔**صنعت:** ہنر مندی کو استعمال کرتے ہوئے آپ کچھ بنا کر بیچ دیں۔ جیسے مارکیٹ کی ضرورت کی چیز بنائیں اور بیچ دیں جیسے موجودہ حالات میں چارجنگ لائٹس اور پنکھے وغیرہ۔

۔2 ۔**ذاتی کاروبار:** ذاتی کاروبار کی بنیاد پر بھی اپنی ہنر مندی سے کما سکتے ہیں۔ جیسے آپ نے فریج، ائرکنڈیشن وغیرہ کی مرمت کرنے کی دکان کھول لی۔

۔3 ۔**وکالت:** بعض اوقات وکالت کی بنیاد پر اپنی خدمات فراہم کر سکتے ہیں۔ جیسے آپ مارکیٹ کی صورت حال سے بہتر انداز میں واقف ہیں۔ کسی چیز کی خرید و فروخت کے لیے آپ اپنی خدمات وکالت کی بنیاد پر دیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں جائیداد اور شیئرز کی خرید و فروخت میں اس قسم کا کاروبار عام ہے۔

4۔ **مضاربت:** ہنر مندی کے ذریعے کمانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ ایک ایسے شخص کے ساتھ شراکت داری کر سکتے ہیں جس کے پاس سرمایہ ہو۔ دونوں مل کر کاروبار کریں گے اور اس کے نتیجے میں ہونے والے نفع میں طے شدہ شرح کے مطابق شریک ہوں گے۔ اس معاہدے کو مضاربت کہا جاتا ہے۔

اگر آپ کے پاس سرمایہ موجود ہے تو اس سے کمانے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں: ☆ تجارت: یعنی تیار شدہ چیز کی خرید و فروخت کے ذریعے نفع کمانا۔ اس میں ہول سیل اور ریٹیل بھی دونوں کام کیے جا سکتے ہیں۔

☆ صنعت: کوئی چیز بنانا اور بیچنا۔

☆ سرمایہ کاری: خود کچھ نہ کرنا بلکہ سرمایہ شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر دے دینا اور اس پر نفع کمانا۔

☆ وکالت: ایک صورت یہ ہے سرمایہ دے دینا کہ اس سے کاروبار کرو لیکن تم میرے وکیل ہو، تمہیں تمہاری فیس ملے گی۔ کاروبار بھی میرا ہے اور نفع بھی میرا ہو گا۔

☆ کرایہ داری: ایک صورت یہ بھی ہے کوئی ایسا اثاثہ خرید لیں، جس سے اسے ختم کیے بغیر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اسے کرائے پر دے دیں جیسے گھر یا گاڑی وغیرہ۔

یہ مختلف کمانے کے طریقے تھے ان میں سے تمام طریقے جائز ہیں۔ مختلف احادیث کی روشنی میں علمائے کرام ایسی تجارت کو افضل قرار دیتے ہیں جس میں اپنا کاروبار ہو کسی کی ملازمت نہ ہو۔ لیکن تمام طریقوں میں شریعت کی تعلیمات کا پاس رکھنا بہر حال ضروری ہے۔ کیونکہ بعض اوقات اصولی طور پر معاملہ درست ہوتا ہے، لیکن علم نہ ہونے کی وجہ سے اسے عملاً کرنے میں ایسی غلطی ہو سکتی ہے جس سے وہ معاملہ شرعی اعتبار سے درست نہ رہے۔ لہٰذا ہم معاملات کے حوالے سے علم بھی حاصل کریں اور اپنے معاملات کو شریعت کے مطابق کرنے کی فکر بھی کریں۔ ان شاء اللہ شریعت پر عمل سے ہماری آخرت کی کامیابی تو یقینی ہے لیکن تجربہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کی دنیا بھی خراب نہیں کرتے۔

سود کا مفہوم

سود کو عربی زبان میں ربا کہتے ہیں۔ ربا سے مراد معینہ مدت کے قرض پہ وہ اضافہ ہے جس کا مطالبہ قرض خواہ مقروض سے کرتا ہے اور یہ شرح پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے۔ ذیل میں اس کی وضاحت دی گئی ہے:۔

لغت میں ربا کا معنی زیادتی "بڑھوتری اور بلندی" ہے۔ ابو القاسم الحسین بن محمد اصفہانی کہتے ہیں:۔

الربا الزيادة على رأس المال لكن خصّ في الشرع بالزيادة على وجه دُون وجه۔

اصل مال پر زیادتی کو ربا کہتے ہیں لیکن شریعت میں ہر زیادتی کو ربا نہیں کہتے بلکہ وہ زیادتی جو مشروط ہو، سود ہے۔ شرط کے بغیر اگر مقروض دائن کو خوشی سے کچھ زائد مال دے تو جائز ہے سود نہیں (أصفهاني، المفردات في غريب القرآن، 1: 187، دار المعرفة لبنان)۔

ابو منصور محمد بن احمد الازہری، محمد بن مکرم بن منظور الافریقی اور محمد مرتضیٰ الحسینی الزبیدی فرماتے ہیں:۔

الرِّبا رَبَوان فالحرام كُلّ قَرْض يُؤْخذ به أكثر منه أو تجرُّ به مَنْفعة فحرام والذي ليس بحرام أن يَهبه الانسان يَسْتَدعي به ما هو أكثر أو يُهدي الهدِيّة لِيُهدَى له ما هو أكثر منها۔

زیادتی دو قسم پر ہے، حرام وہ قرض ہے جو زیادتی کے ساتھ وصول کیا جائے یا اس سے فائدہ (بطور شرط) حاصل کیا جائے، وہ حرام ہے اور جو حرام نہیں وہ یہ ہے کہ مقروض مدت مقررہ پر اصل رقم پر بطور ہبہ کچھ اضافی مال قرض خواہ کو غیر مشروط دیدے۔ (الازهري، تهذيب اللغة، 15: 196، دار احياء التراث العربي بيروت۔، ابن منظور، لسان العرب، 14: 304، دار صادر بيروت، الزبيدي، تاج العروس، 38: 118، دار الهداية)۔

ابو السعادات المبارک بن محمد الجزری لکھتے ہیں:۔

هو في الشرع الزيادة على أصل المال من غير عقد تبايع۔

شریعت میں رباء کا مطلب تجارتی سودے کے بغیر اصل مال پر اضافی منافع وصول کرنا۔(ابن الأثير الجزري، النهاية، 2: 192، المكتبة العلمية بیروت)۔

احمد بن علی الرازی الجصاص ابو بکر فرماتے ہیں:۔

هو القرض المشروط فيه الأجل و زيادة مال على المستقرض۔

جس قرض میں مدت متعین کے ساتھ قرض لینے والے کو اضافی رقم دینا مشروط ہو۔(جصاص، أحكام القرآن، 2: 189، دار احياء التراث العربي بیروت)۔

لہٰذا قرض میں دیئے ہوئے اصل مال پر جو اضافی رقم مدت کے مقابلہ میں شرط اور تعیین کے ساتھ لی جائے وہ سود ہے۔

ربوا کی اقسام

ربوا کی دو مشہور قسمیں ہیں:۔

۔1۔ربا النسیۃ

۔2۔ربا الفضل

ربا النسیہ اس سے مراد قرض کے معاملہ میں اصل پر وہ زیادتی ہے جو مہلت یا تاخیر کے عوض شرط معاملہ کے طور پر کی جائے۔

ربا الفضل اس سے مراد معاملہ میں اصل پر زیادتی ہے جو ایک ہی جنس کے مال پر ہو کسی مہلت یا تاخیر کے دست بدست تبادلے کی صورت میں کی جائے۔

سود کی حرمت

سود کی حرمت قرآن وحدیث سے واضح طور پر ثابت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ۔

وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا(سورۃ البقرہ ۲۷۵) اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ۔

یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبَا وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ (سورۃ البقرہ ۲۷۶) اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ جب سود کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو لوگوں کا دوسروں پر جو کچھ بھی سود کا بقایا تھا، اس کو بھی لینے سے منع فرمادیا گیا: ۔

وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبَا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (سورۂ البقرہ ۲۷۸) یعنی سود کا بقایا بھی چھوڑدو اگر تم ایمان والے ہو۔

سود لینے اور دینے والوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا اعلانِ جنگ

سود کو قرآنِ کریم میں اتنا بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے کہ شراب نوشی، خنزیر کھانے اور زناکاری کے لیے قرآن کریم میں وہ لفظ استعمال نہیں کیے گئے جو سود کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے استعمال کیے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَاْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (سورۃ البقرہ ۲۷۸ ۔ ۲۷۹) اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑدو، اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

سود کھانے والوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے اور یہ ایسی سخت وعید ہے جو کسی اور بڑے گناہ، مثلاً زنا کرنے، شراب پینے کے ارتکاب پر نہیں دی گئی۔ مشہور صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو شخص سود چھوڑنے پر تیار نہ ہو تو خلیفۂ وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سے توبہ کرائے اور باز نہ آنے کی صورت میں اس کی گردن اڑادے (تفسیر ابن کثیر)۔

سود کھانے والوں کے لیے قیامت کے دن کی رسوائی وذلّت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سود کھانے والوں کے لیے کل قیامت کے دن جو رسوائی وذلت رکھی ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں کچھ اس طرح فرمایا: ۔

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطَانُ مِنَ الْمَسِّ (سورۃ البقرہ ۲۷۵) جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت میں) اٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنادیا ہو۔

سود کی بعض شکلوں کو جائز قرار دینے والوں کے لیے فرمانِ الٰہی ہے: ۔

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمْ قَالُوا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (سورۂ البقرہ ۲۷۵) یہ ذلت آمیز عذاب اس لیے ہو گا کہ انھوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو سود کی طرح ہوتی ہے؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع یعنی خرید وفروخت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

سود کھانے سے توبہ نہ کرنے والے لوگ جہنم میں جائیں گے

فَمَنْ جَآءَ ہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ فَانْتَہٰی فَلَہٗ مَاسَلَفَ، وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ، وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ، ہُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ (سورۂ البقرہ ۲۷۵) لہٰذا جس شخص کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت آگئی اور وہ (سودی معاملات سے) باز آگیا تو ماضی میں جو کچھ ہوا وہ اسی کا ہے اور اس کی (باطنی کیفیت) کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ ہے۔ اور جس شخص نے لوٹ کر پھر وہی کام کیا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

غرضیکہ سورۂبقرہ کی ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو ہلاک کرنے والے گناہ سے سخت الفاظ کے ساتھ بچنے کی تعلیم دی ہے اور فرمایا کہ سود لینے اور دینے والے اگر توبہ نہیں کرتے ہیں تو وہ اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں، نیز فرمایا کہ سود لینے اور دینے والوں کو کل قیامت کے دن ذلیل ورسوا کیا جائے گا اور وہ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی سود سے بچنے کی بہت تاکید فرمائی ہے اور سود لینے اور دینے والوں کے لیے سخت وعیدیں سنائی ہیں جن میں سے بعض احادیث ذیل میں ذکر کی جارہی ہیں:۔

سود کے متعلق نبی اکرم ﷺ کے ارشادات

حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سود کی حرمت کا اعلان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: (آج کے دن) جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا، اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ ہمارے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سود ہے۔ وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا ہے؛ چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سود کی حرمت سے قبل لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے؛ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ آج کے دن میں اُن کا سود جو دوسرے لوگوں کے ذمہ ہے وہ ختم کرتا ہوں (صحیح مسلم، باب حجۃ النبی)۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! وہ سات بڑے گناہ کونسے ہیں (جو انسانوں کو ہلاک کرنے والے ہیں)؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (۱) شرک کرنا، (۲) جادو کرنا، (۳) کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، (۴) سود کھانا، (۵) یتیم کے مال کو ہڑپنا، (۶) (کفار کے ساتھ جنگ کی صورت میں) میدان سے بھاگنا، (۷) پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا (بخاری ومسلم)۔

حضور اکرم ﷺ نے سود لینے اور دینے والے، سودی حساب لکھنے والے اور سودی شہادت دینے والے سب پر لعنت فرمائی ہے۔ سود لینے اور دینے والے پر حضور اکرم ﷺ کی لعنت کے الفاظ حدیث کی ہر مشہور ومعروف کتاب میں موجود ہیں۔ (مسلم، ترمذی، ابوداود، نسائی)۔

حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: چار شخص ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے لازم کر لیا ہے کہ ان کو جنت میں داخل نہیں کریں گے اور نہ ان کو جنت کی نعمتوں کا ذائقہ چکھائیں گے۔ پہلا شراب کا عادی، دوسرا سود کھانے والا، تیسرا ناحق یتیم کا مال اڑانے والا، چوتھا ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا (کتاب الکبائر للذہبی)۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود کے ۷۰ سے زیادہ درجے ہیں اور ادنی درجہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کرے (رواہ حاکم، البیہقی، طبرانی، مالک)۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔ ”ایک درہم سود کا کھانا چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ ہے“ (رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر)۔

سبق نمبر 11

اسلام کا معاشرتی نظام اور اس کی خصوصیات

اسلام کا معاشرتی انقلاب

پوری دنیا ظہورِ اسلام سے قبل سماجی سطح پر مختلف ناہمواریوں کا شکار تھی۔ کہیں نسلی منافرت اور طبقاتی کش مکش جاری تھی تو کہیں مرد و عورت کے درمیان تشدد اور افراط و تفریط پائی جاتی تھی۔ صنفِ نازک پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے تھے۔ انسان خود انسانوں کے بنائے ہوئے غیر متوازن نظاموں میں جکڑا ہوا تھا۔ عام انسانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ انسان کو انسان شمار نہیں کیا جاتا تھا، عام انسان غلامی اور ظلم کی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ جانوروں کی طرح مجبورِ محض تھے۔

انسانی برادری میں مساوات

اسلام نے سب سے پہلے انسانوں کے درمیان بنی ہوئی اس عدمِ مساوات اور ظلم کی دیوار کو پاش پاش کیا۔ انسانی معاشرے کے درمیان مساوات اور انسانی حقوق میں سب کی شرکت اسلام کا ایک اہم انقلابی تصور تھا، جس نے دنیا کی تصویر بدل ڈالی۔ اسلام سے پہلے کے معاشروں اور تہذیبوں میں جملہ انسانی طبقات کے درمیان مساوات کا فقدان تھا۔

یہود خود کو اللہ کی اولاد اور اشرفُ الناس سمجھتے تھے، جب کہ دوسروں کو پیدائشی ذلیل اور حقیر سمجھتے تھے۔ ان کی مذہبی کتاب "تلمود" کے مطابق یہودی روئے زمین کی سب سے بہتر مخلوق تھے اور دیگر انسانی طبقے خود یہودی نہیں ہو سکتے تھے اور کسی صورت میں ان کے برابر نہیں ہو سکتے تھے۔ اس وقت کی سپر پاور طاقت رومن امپائر نے سماج کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا: ۔

۔۱۔ امراء جنھیں بغاوت کے علاوہ کسی جرم میں سزائے موت نہیں دی جاسکتی تھی۔

۔۲۔ متوسط طبقہ جسے غیر معمولی جرم میں سزائے موت دی جاسکتی ہے۔

۔۳۔ نچلا طبقہ جس کے افراد کو معمولی جرائم میں قتل کر دیا جاتا تھا، زندہ آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔

ایران والے اپنی قومیت کو عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کا تصور تھا کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر نسل پر انھیں برتری حاصل ہے۔ یہ اپنے گرد و پیش کی قوموں کو بڑی حقارت و ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے لیے ایسے نام تجویز کر رکھے تھے، جس میں توہین و تمسخر کا پہلو پایا جاتا تھا۔

ہندوستان میں بھی طبقہ واری امتیاز عروج پر تھا۔ ہندی سماج نے باضابطہ "منوشاستر"، جیسا قانونچہ مرتب کر رکھا تھا، جس کو بہت جلد ملکی قانون اور مذہبی دستاویز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ منوشاستر کے مطابق برہمن، برہما (خدا) کے سر سے پیدا ہوے تھے؛ اس لیے مذہبی پیشوائی اور رہبری ان کا فرض منصبی تھا۔ پھر چھتریوں کا درجہ تھا جو برہما کے سینے سے پیدا ہوے اور اُن کے ذمہ لڑائی اور دفاع کا کام سپرد ہوا۔ تیسرے نمبر پر ویش طبقہ تھا اس کا پیشہ زراعت و تجارت تھا اور یہ برہما کے کمر سے پیدا ہوے تھے۔ سب سے ذلیل شودر تھے جو برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے تھے اور جن کے ذمہ درج بالا تینوں قوموں کی خدمت کا کام سپرد ہوا تھا۔

خود عرب میں قبائلی تعصب اور جتھ بندی بڑی سخت تھی۔ اس عصبیت کی وجہ جاہلی مزاج تھا۔ بعض خاندان دوسرے خاندانوں کے ساتھ رسوم و عادات میں شرکت پسند نہیں کرتے تھے۔ مناسک حج میں قریش عام حجاج سے الگ تھلگ رہتے۔ ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا تھا، ایک طبقہ کم حیثیت لوگوں کا تھا جس سے بیگار لیا جاتا تھا۔

عالمی تاریکی کے اس مہیب ماحول میں مکہ کی سنگلاخ وادیوں سے یہ نوید جانفزا سنائی دی کہ تمام انسان اصل خلقت کے اعتبار سے برابر ہیں۔ اعلان ہوا کہ سارے انسان اللہ کی مخلوق ہیں، سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، کوئی پیدائشی حقیر اور پیدائشی شریف نہیں: ۔

"يَا اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَنِسَآءً"۔

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیں (سورۃ النساء ۴:۱)۔

سارے انسان پیدائشی اعتبار سے برابر ہیں۔ ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں۔ کوئی پاک یا ناپاک نہیں۔ کالے اور گورے، ہندی اور عربی، آرین اور سامی، ایشیائی اور یورپی، مشرقی اور مغربی سب ایک درجہ کے اور ایک طرح کے حقوق رکھنے والے انسان ہیں۔ نسل ورنگ یا وطن وزبان کی بنا پر ان میں کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ ہاں اسلام نے یہ اعلان کیا کہ اگر بڑائی اور برتری کا کوئی معیار ہے تو وہ صرف تقوی اور پرہیز گاری ہے:۔

"يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَاُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ"۔

"اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان کر سکو۔ درحقیقت، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہو۔ یقین رکھو اللہ سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز سے باخبر ہے" (سورۃ الحجرات ۴۹:۱۳)۔

اس آیتِ کریمہ نے مساوات کا یہ عظیم اصول بیان فرمایا ہے کہ کسی کی عزت وشرافت کا معیار اس کی قوم، اس کا قبیلہ یا وطن نہیں ہے؛ بلکہ تقوی ہے۔ سب لوگ ایک مرد وعورت یعنی حضرت آدم وحوا (علیہما السلام) سے پیدا ہوئے ہیں۔ اللہ تعالی نے مختلف قبیلے خاندان یا قومیں اس لیے نہیں بنائیں کہ وہ ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتائیں بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ بے شمار انسانوں میں باہمی پہچان کے لیے کچھ تقسیم ہو جائے۔ اسلام نے ساری انسانیت کی عزت افزائی کی اور بلا تفریق نسل ونسب انسان کو "تکریم" کا تاج عطا کیا۔ ارشاد ہوا:۔

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا"۔

(اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے اور انھیں خشکی اور سمندر دونوں میں سواریاں مہیا کی ہیں اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے (سورۃ الاسراء ۱۷:۷۰)۔

قرآن کی اس آواز پر عربوں کی موروثی نخوت پارہ پارہ ہوگئی۔ پھر عرب کے جنگ جو اور اکھڑ مزاج لوگ باہم شیر وشکر کی طرح گھل مل گئے۔ ان کا سارا نسلی غرور جاتا رہا۔ آگے چل کر انھوں نے مدینہ منورہ میں تاریخی مواخاۃ (بھائی چارہ) قائم کیا جو انسانی تاریخ کا ایسا نقشِ جمیل ہے جو رہتی دنیا تک مساوات واخوت کے علمبرداروں کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھے گا۔

نبی پاک ﷺ نے سارے انسانوں کو اللہ کا کنبہ قرار دیا (الخلقُ عیالُ اللہ: بیہقی، شعب الایمان، حدیث ۴۹۲۱) اور حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ صحابہؓ کی موجودگی میں آپ نے اعلان فرمایا: لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارے باپ بھی ایک ہیں۔ سن لو! کسی عربی کو کسی غیر عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی غیر عربی کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر یا کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت ہے۔ اگر فضیلت کا کوئی معیار ہے تو وہ تقوی اور اللہ کا خوف ہے، اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت اور افضل وہ ہے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو (بیہقی، شعب الایمان، حدیث ۴۹۲۱)۔

انسانی برادری میں مساوات اور عالمگیر اخوت کا نعرہ اسلام نے دیا اور اس کو عملی شکل میں دنیا میں رائج کیا۔ یہی وجہ تھی پوری اسلامی تاریخ میں آزاد کردہ غلاموں نے جو علمی وفکری کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، وہ صرف مسلمانوں کا ہی حصہ ہیں۔ آج جس جمہوریت اور مساوات کا دنیا میں ڈنکا بج رہا ہے وہ سراسر اس ماحول کی دین ہے، جسے اسلام نے دنیا میں پیدا کیا۔ مغربی ممالک کے یہاں طبقاتی اور نسلی تفریق بیسویں صدی تک موجود تھی اور وہ اس سے آزاد نہ ہو پائے۔ ساؤتھ افریقہ میں تو یہ تفریق جو اہلِ یورپ کی طرف سے مسلط کی گئی تھی، ۱۹۹۴ء تک موجود تھی اور آج بھی اس کے آثار وشواہد باقی ہیں، جنھیں دیکھ کر انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ امریکہ جو جمہوریت ومساوات کا علمبردار ہے، وہاں کی بعض ریاستوں میں آج بھی نسلی امتیاز پر مبنی قوانین موجود ہیں اور شہریت کے مختلف درجات ہیں اور اسی اعتبار سے ان کو رعایتیں اور سہولتیں دی جاتی ہیں۔ بعض ریاستوں میں اب بھی گوری اور کالی نسل کے لوگوں کے درمیان شادی نہیں ہو سکتی، اگر کر لی جائے تو یہ شادی غیر معتبر ہوگی اور اس کا ارتکاب کرنے والے سزاؤں کے مستحق ہوتے ہیں۔ امریکہ میں نسلی امتیاز کا خاتمہ قانونی طور پر صرف ۱۹۶۵ء میں ہو سکا۔ اسی طرح امریکہ نے اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود اپنی پوری دو سو سالہ تاریخ میں پہلی بار کسی سیاہ فام کو صدر کی حیثیت سے قبول کیا تھا اور اب تک اس عہدہ پر کوئی عورت فائز نہیں ہو سکی۔ اسی

نسلی امتیاز و تفریق کا نتیجہ ہے کہ امریکہ میں سیاہ فام نسل کی آبادی کے لحاظ سے حکومت کے اہم عہدوں اور ملازمتوں میں ان کا تناسب نہایت ہی کم ہے۔

آج سے چودہ سو سال قبل عرب میں اسلام کی زیر سرپرستی جس عالمی برادری کی تشکیل ہوئی، تب سے آج تک ہر دور اور ہر خطے میں اس عالم گیر اخوت اور مساوات انسانی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مغرب ہزار علم و فن اور تہذیب و تمدن کے بلند بانگ دعووں کے باوجود دلوں سے نسلی امتیاز ختم کرنے میں بری طرح ناکام رہا لیکن اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام نے ایک مختصر مدت میں اس برائی کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔

عورتوں کے ساتھ انصاف

معاشرتی سطح پر اسلام کا دوسرا اہم کارنامہ عورتوں کو ان کا جائز حق دلانا اور معاشرے میں ان کے صحیح کردار کو بحال کرنا ہے۔ ظہور اسلام سے قبل عورتیں معاشرے میں زبوں حالی کا شکار تھیں۔ انسانوں کے خود ساختہ اصولوں نے ہمیشہ ان کے ساتھ بے اعتدالیاں برتیں۔ عرب کے جاہلی معاشرے میں عورت کے ساتھ عمومی بدسلوکی روا رکھی جاتی تھی اور اس کے حقوق پامال کیے جاتے تھے۔ وہ اقرباء و اعزہ کے ترکہ کی حق دار تو کجا، سامان و حیوان کی طرح وراثت میں منتقل ہوتی تھی۔ ہندوستان میں عورتوں کا برا حال تھا۔ بیوہ مستحقِ طعن و تشنیع سمجھی جاتی اور عموماً شوہر کے ساتھ ستی ہونے پر مجبور کی جاتی۔ یونانی تمدن میں بھی صنفِ نازک قانونی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی حقوق سے محروم تھی۔ رومن تہذیب میں عورت زمرۂ انسانیت سے خارج تصور کی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ انگلستان میں کمزور اور بدصورت لڑکیاں سرِ دار چڑھا دی جاتی تھیں۔ ایران میں عورتوں کو باعثِ شرم و ندامت سمجھا جاتا تھا۔ الغرض! ایک ظالمانہ ماحول تھا، صنفِ نازک ظلم و ستم کے بوجھ تلے کراہ رہی تھی، ہر جگہ اس کے اخلاقی و معاشرتی حقوق پامال کیے جاتے تھے۔

ایسے وقت میں اسلام نے انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور عورتوں کو ان کا فطری اور قدرتی حق دلایا۔ قرآن کا اعلان ہوا: عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (عورتوں کے ساتھ بھلے انداز میں زندگی بسر کرو۔ (سورۃ النساء ۴:۱۹) وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ (اور عورتوں کو معروف طریقے کے مطابق وہی حقوق حاصل ہیں، جیسے مردوں کو ان پر حاصل ہیں (سورۃ البقرۃ ۲:۲۲۸)۔

اسلام کی یہی انقلاب انگیز پکار تھی جس نے اقوامِ عالم کو احساس دلایا کہ کسی مخلوق کے ساتھ ظلم سراسر ناجائز ہے۔ اسلام نے عورت کی عزت افزائی کی۔ ایک عورت کے بحیثیت ماں، بیوی، بہن اور بیٹی کے حقوق مقرر کیے۔ ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید باپ کے مقابلے میں زیادہ کی گئی (صحیح بخاری، کتاب الادب، حدیث: ۵۵۱۴) نیک بیوی کو دنیا کے سب سے بہتر سرمایہ سے تعبیر کیا گیا (صحیح مسلم، کتاب الرضاع، حدیث: ۲۶۶۸)۔ بیٹیوں اور بہنوں کی تعلیم و تربیت پر جنت کی بشارت دی گئی (سنن ابی داؤد، کتاب الادب، حدیث: ۴۴۸۱)۔ بالترتیب والد، بھائی اور شوہر کو عورت کے نان و نفقہ کی ذمہ داری سونپی گئی اور اس کے باجود انھیں جائداد میں حصہ دار مقرر کیا گیا (سورۃ النساء ۴:۷)۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ انسانوں میں سب سے بہتر وہ ولوگ ہیں جو عورتوں کے ساتھ بھلائی کے ساتھ پیش آتے ہیں (سنن الترمذی، کتاب الرضاع، حدیث: ۱۰۸۲)۔

حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں جو حقوقِ انسانی کا عظیم الشان منشور سنایا، اس میں عورتوں کے حقوق کا خصوصی ذکر فرماتے ہوئے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید فرمائی اور ان کے حقوق کی یاددہانی کرائی (سنن الترمذی، کتاب الرضاع، حدیث: ۱۰۸۳) حتیٰ کہ رحمتِ عالم ﷺ نے وفات سے قبل اپنی آخری وصیت میں بھی عورتوں کے حقوق کی مکمل ادائیگی کی طرف خصوصی توجہ دلائی (مصنف عبد الرزاق ۵:۴۳۶)۔

اسلام کی اسی روشنی میں غیر اسلامی ممالک میں بھی عورتوں کے حقوق نے ترقی کی، مگر صحیح ربانی تعلیمات کے فقدان اور مذہبی بیزاری کی وجہ مغربی تہذیب نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ مغرب کے کوتاہ نظر نام نہاد دانشوروں نے عورتوں کو ان کے مقام سے زیادہ اوپر اٹھا کر ایک بار پھر انھیں ظلم و ستم کا نشانہ بنادیا ہے۔ مساوات اور آزادیٔ نسواں کے پردے میں ان کے ساتھ فراڈ کیا جارہا ہے۔ ڈھنڈورا یہ پیٹا کہ عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش لانا ہے؛ مگر عملاً یہ ہوا کہ انھیں منظرِ عام پر بازار کا سودا بنادیا گیا۔

مرد و عورت کے باہمی تعلق کی نوعیت

عورت انسانی تاریخ کی وہ مظلوم ہستی ہے جس کے تخلیقی، نفسیاتی اور فطری تقاضوں کی بنیاد پر صحیح حقوق اور ذمہ داریاں انھیں سونپی گئیں۔ عورت کے حقوق و فرائض اور مرد کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کے سلسلے میں دنیا میں انسان کے خود ساختہ نظریات ہمیشہ افراط یا تفریط کا نشانہ بنے رہے اور اس کے نتیجہ میں بیچاری عورت ذات گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتی رہی۔

اسلام سے پہلے عورت اور مرد کے باہمی رشتے میں بڑی بے ہنگمی تھی۔ ساری دنیا فطرت کے خلاف افراط و تفریط کے راستے پر گامزن تھی۔ کوئی مستحکم نظام نہیں تھا، جس کی بنیاد پر ازدواجی رشتہ قائم ہو۔ ایرانی قانون و معاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لیے کسی بھی رشتے کا استثناء نہ تھا۔ ایران کے اس شدید شہوانی رجحان کا ایک غیر فطری اور سخت رد عمل یہ ظاہر ہوا کہ ایک حکمراں مانی نے مرد و عورت کا باہمی اجتماع حرام قرار دے دیا۔ پھر مزدک نے تمام عورتوں کو تمام مردوں کے لیے حلال کر دیا، جس سے پورا ایران جنسی انارکی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا۔ ہندوستانی مذہب و تمدن میں شہوانی جذبات اور جنسی میلان کو ابھارنے والے عناصر چھائے ہوئے تھے۔ معبودوں کی فہرست میں لنگم اور یونی (مرد اور عورت کی شرم گاہ) بھی اہمیت کے ساتھ شامل تھے۔ اس تن پرستی اور نفس پروری کے بالمقابل دوسری طرف نفس کشی اور ریاضت و مجاہدہ (جوگ وتپشیا) کا سلسلہ جاری تھا۔ خود عرب میں زنا کوئی معیوب بات نہیں تھی اور اس کے بہت سے طریقے رائج تھے۔ غرض دنیا شہوت و تجرد کے دونوں سروں میں تقسیم اور اعتدال و توازن سے محروم تھی۔ کچھ افراد نفس کشی اور روحانی ترقی میں مصروف تھے اور عام آبادی شہوانیت اور نفس پرستی کے دھارے میں بہہ رہی تھی۔ ایسے ماحول میں اسلام نے انسانی فطرت کے عین مطابق معاشرتی لائحۂ عمل پیش کیا جس میں بھرپور طریقہ پر انسان کے شہوانی جذبات کی رعایت کے ساتھ اخلاقی و سماجی اقدار پیش کیے گئے۔ اس میں ہر اعتبار سے اعتدال تھا، توازن تھا، جاذبیت تھی اور فطرتِ انسانی سے مکمل مطابقت بھی۔

اسلام کی نگاہ میں مرد و عورت انسانی سماج کے دو لازمی جزہیں۔ اسلام نے مردوں اور عورتوں سے متعلق نہایت متوازن قانون دیا ہے۔ انسانی حقوق میں مردوں اور عورتوں کو مساوی درجہ دیا گیا ہے اور سماجی زندگی میں دونوں کے جسمانی تقاضوں اور صلاحیتوں کے لحاظ سے فرق کیا گیا ہے، بال بچوں کی تربیت کی ذمہ داری عورتوں پر اور کسب معاش کی ذمہ داری مردوں پر رکھی گئی ہے۔ سماجی زندگی کا یہ نہایت ہی زریں اصول ہے جس میں خاندانی نظام کی بقا اور اخلاقی اقدار کی حفاظت اور عورت کو ناقابلِ برداشت مصائب سے بچانا ہے۔

دوسری طرف دنیا میں کچھ ایسے قوانین وضع کیے گئے جن میں عورت کی حیثیت جانور اور پراپرٹی جیسی قرار پائی، نہ وہ کسی جائداد کی مالک ہو سکتی تھی، نہ اس میں تصرف کر سکتی تھی، نہ اس کو اپنے مال پر اختیار حاصل تھا اور نہ اپنی جان پر۔ اس کے مقابل آج کے مغربی معاشرے نے عورتوں کو تمام ذمہ داریوں میں مردوں کے مساوی قرار دے دیا۔ عورتوں کی جسمانی کمزوری، ان کے ساتھ پیش آنے والے قدرتی حالات و عوارض، اور طبیعت و مزاج

اور قوتِ فیصلہ پر ان کے اثرات کو نظر انداز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بظاہر تو عورت کی حمایت سمجھا گیا، لیکن انجام کار اس آزادی نے پورے سماج کو بے حیائی، اخلاقی انارکی، ناقابلِ علاج امراض اور خود عورتوں کو ناقابلِ تحمل فرائض میں جکڑ کر رکھ دیا۔

اسلام میں سماج کی اہمیت

اسلام نے جس طرح فرد کی زندگی کو اہمیت دی ہے، اسے آزادی، مساوات اور عدل وانصاف سے نوازا ہے، وہیں اس نے اس کو معاشرے سے الگ بھی تصور نہیں کیا ہے۔ اسلام نے فرد کے مفادات اور حقوق کے خیال کے ساتھ، اس کو وسیع ترین معاشرے کے ایک ذمہ دار رکن کی حیثیت سے فرائض وواجبات بھی دیئے ہیں۔ مغربی نظام کے برخلاف، اسلام کے معاشرتی نظام میں صالح اجتماعیت اور معاشرہ کا تحفظ وبقا فرد کے تحفظ وبقا کے مقابلے میں کہیں زیادہ ضروری ہے۔ اسلام نے ایسے صالح معاشرہ کی تشکیل کا خاکہ پیش کیا ہے اور اس کو عملی جامہ پہنایا ہے، جس میں خیر اور نیکی کو خوب پنپنے کا موقع ملے اور شر وبرائی کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے۔

اسلام کا عمومی حکم ہے کہ معاشرے میں بھلائی اور خدا ترسی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کی جائے اور گناہ وظلم کے کاموں میں کسی قسم کی کوئی مدد نہ کی جائے۔ (سورۃ المائدۃ ۵:۲) بلکہ مستقل طور پر ایک دوسرے کو نیکی کی تلقین کرتے رہنے اور برائیوں سے روکنے کی ہمت افزائی کی گئی۔ (سورۃ التوبۃ ۹:۷۱) نیز حدیث میں حکم ہوا کہ تم میں جو شخص برائی دیکھے اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو زبان سے، اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے (صحیح مسلم، جلد اول، کتاب الایمان)۔

اسلام نے ان تمام سرچشموں کو بند کر دیا ہے جن سے صنفی برائیاں معاشرہ میں پھیلتی ہیں۔ شرم وحیا کی سخت تاکید کی گئی اور اسے ایمان کا جز قرار دیا گیا۔ (الحیاءُ شعبةٌ مِنَ الایمانِ ، صحیح بخاری جلد اول باب امور الایمان)۔

مردوں اور عورتوں دونوں کو حکم ہوا کہ جب ان کی نظر مقابل صنف پر پڑے تو اپنی نظریں نیچی کر لیں (سورۃ النور ۲۴۔ ۳۰)۔

زنا کو بدترین برائیوں میں شمار کیا گیا اور اس کے خلاف معاشرے میں شدید ترین نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کر دیے گئے اور زنا کے مرتکب افراد کے لیے نہایت سخت سزاؤں کا اعلان کیا گیا۔ (قرآن کریم ۱۷:۳۲ و ۲۴:۳) مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول سخت ممنوع قرار دیا گیا۔ عام حالات میں عورتوں کا دائرۂ کار گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیا گیا اور انھیں بلا ضرورت باہر نکلنے سے روک دیا گیا:۔

وَقَرنَ فِي بُيُوتِكُن ولا تَبرجن تبرجَ الجاهليةِالاولى: (سورۃ الاحزاب ۳۳:۳۳)۔

اسلام نے نکاح کو آسان بنایا اور اس کی خاص تاکید و ترغیب دی۔ بہت ہی قریب کے چند رشتوں کو چھوڑ کر باقی تمام لوگوں سے نکاح جائز قرار دیا گیا۔ اسی طرح ذات پات اور طبقاتی فرق بھی نکاح میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ جوانوں کو مجرد رہنے کو خاص طور پر ناپسند کیا گیا۔ بیوہ عورتوں اور رنڈووں کو پھر سے ازدواجی زندگی اختیار کر لینے کی ہدایت کی گئی۔ اسلام کا حکم ہے کہ لڑکی جب جوانی کی عمر کو پہنچ جائے اور اس کے لیے مناسب رشتہ میسر آجائے تو فوراً اس کا نکاح کر دو۔

اسلام نے فرد کی آزادی، حقوق اور احترامِ نفس کو نہ صرف قبول کیا، بلکہ اسے بڑھاوا دیا۔ لیکن ساتھ ہی معاشرے کو فرد سے زیادہ اہمیت دی، اسی لیے فرد کو ایسے کاموں کی اجازت نہیں دی گئی جس سے معاشرے کے مجموعی اخلاقی و فکری ماحول میں کوئی منفی اثر پیدا ہوتا ہو۔ انھیں اسباب کی بنیاد پر اسلام نے زنا، بے حیائی، بے پردگی اور اخلاق باختگی کو کسی صورت میں برداشت نہیں کیا ہے۔ جب کہ اس کے بالمقابل آج کے مغربی معاشرہ میں فرد کو مرکزیت و اہمیت دینے کی روش سے سماج کو بے شمار اخلاقی و سماجی برائیوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ معاشرہ میں فرد کو ہی اہمیت دینے کا معاملہ ہے کہ مغربی معاشروں میں فرد کو لباس، رہن سہن اور من مانے طرزِ زندگی کو اختیار کرنے میں پوری آزادی دے دی گئی ہے۔ بے پردگی تو کجا، رضامندی کے ساتھ زنا حتی کہ شادی شدہ افراد کا زنا کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ اسی فرد کی آزادی کا کرشمہ ہے کہ ہم جنسی اور غیر فطری شادیاں جائز گردانی جا رہی ہیں اور حتی کہ قتل وغیرہ جیسے سخت ترین جرائم کی سزا کے طور پر ملکی قانون میں قتل بالنفس کا کوئی خانہ نہیں ہے۔

غرض اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد کے ادوار میں انسانی حقوق، انسانی اخوت و مساوات اور معاشرتی اصلاحات کا اگر جائزہ لیا جائے واضح طور پر محسوس ہوگا کہ اسلام کی بادِ بہاری نے اس گلشنِ عالم کو کس طرح اپنی عطر بیز سماجی تعلیمات و اصلاحات کے ذریعہ معطر و منور کیا اور اس اسلامی انقلاب

کی بدولت کس طرح نسل انسانی کو احترامِ نفس، مساوات اور آزادی کی بے بہا دولت ہاتھ آئی۔ اسلامی انقلاب کے زیر اثر تاریخ میں جہاں بھی یہ معاشرتی نظام قائم رہا، وہاں معاشرہ امن و سکون اور روحانیت و اخلاق کی روشنی سے جگمگاتا رہا۔ آج مغرب کی نام نہاد تہذیب نے صالح معاشرے کے اس ڈھانچہ کو بری طرح متاثر کرنا شروع کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں انسانی معاشرہ ایک بار پھر انھیں تاریک ادوار میں واپس جا رہا ہے، جہاں صرف نفس و شیطان کی حکمرانی تھی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے معاشرے کو ربانی ہدایات کے مطابق ڈھالیں، تاکہ پھر وہی خالص اخلاقی و روحانی سکون ہمیں حاصل ہو سکے۔

اسلامی نظامِ معاشرت کے بنیادی اصول اور امتیازات

انسان فطری طور پر اجتماعیت پسند ہے۔ یہی فطری تقاضا اسے اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ جب سے روئے زمین پر انسان کا وجود ہوا ہے وہ دوسرے افراد کے ساتھ مل کر زندگی گزارتا رہا ہے۔ وہ الگ تھلگ تنہا رہ کر زندگی گزار ہی نہیں سکتا۔ تاریخ کے کسی ایسے دور کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی جب اس نے انفرادی زندگی گزاری ہو۔ اسی باہمی ربط تعلق سے انسانی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

انسان کی اجتماعیت پسندی کے اسباب

ماہرینِ سماجیات نے انسان کی اجتماعیت پسندی کے دو اسباب بیان کیے ہیں: ایک سبب خارجی ہے اور دوسرا داخلی۔

انسان کی اجتماعیت پسندی کا خارجی سبب یہ ہے کہ وہ اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے کم زور واقع ہوا ہے۔ دیگر حیوانات کو تو ان کی جسمانی ساخت کے لحاظ سے اس طرح مسلّح کر دیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کے حملوں اور مشکل حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کسی کو کچلیاں عطا کی گئی ہیں تو کسی کو پنجے اور نوکیلی چونچیں، کسی کو بال و پر دیئے گئے ہیں تو کوئی بے پناہ طاقت کا حامل ہے۔ غرض ان خصوصیات اور سہولیات کی بنا پر وہ محفوظ زندگی گزار سکتے ہیں اور گرمی و سردی اور دیگر قدرتی عوامل کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن انسان چوں کہ ان قدرتی ہتھیاروں سے محروم ہے، اس لیے وہ نہ تو تنہا دوسروں کے حملوں کا دفاع کر سکتا ہے نہ قدرتی عوامل کا مقابلہ کرنے پر قادر ہے۔

انسان کی اجتماعیت پسندی کا داخلی سبب یہ ہے کہ اس کے اندر اپنے ابنائے نوع کے ساتھ مل جل کر رہنے کی جبلّی خواہش پائی جاتی ہے۔ وہ انفرادیت اور تنہائی سے گریزاں رہتا ہے۔ اجتماعیت کا حقیقی شعور اس کے خمیر میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجتماعیت پسندی انسان کی ذاتی مجبوری بھی ہے اور فطری خواہش بھی۔ وہ اپنی ضرورتوں اور مجبوریوں کی بنا پر دوسروں کا محتاج رہتا ہے اور اپنی فطری خواہش کی بنا پر ان کا قرب چاہتا ہے۔ گویا جب تک اس کے اندر انسانیت زندہ ہے وہ سماجی زندگی گزارتا رہے گا۔

اسی بات کو مشہور فلسفی ارسطو نے یوں کہا ہے کہ "انسان مدنی الطبع ہے"۔

انسانی اجتماعیت کی ہمہ گیری

اسلام نے اجتماعیت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق تفصیلی احکام دیئے ہیں۔ انسانی اجتماعیت کا سنگِ بنیاد مرد اور عورت کا باہمی تعلق ہے۔ قرآن نے اس کو باعثِ سکون اور اساسِ رحمت و مودّت قرار دیا ہے:۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (الروم:۲۱)۔

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔

مرد اور عورت کے جائز جنسی تعلق کے نتیجے میں خاندان وجود میں آتا ہے، رشتہ داریاں قائم ہوتی ہیں اور نسبی تعلقات اور سسرال بنتے ہیں۔ قرآن میں اس کی طرف ان الفاظ میں ارشاد کیا گیا ہے:۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاء بَشَراً فَجَعَلَهُ نَسَباً وَصِهْراً وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيراً **(سورۃ الفرقان:۵۴)**۔

”اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا، پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ الگ سلسلے چلائے“۔

یہ تعلق رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے ہوتا ہو یا سماج کے تمام افراد کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔ چنانچہ اسلام روئے زمین پر رہنے والے تمام انسانوں کو رحم و کرم، ہمدردی اور مواسات کا مستحق قرار دیتا ہے۔

حضرت جریر بن عبد اللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

”جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ اس پر رحم نہیں فرماتا“ (بخاری:۶۰۱۳، مسلم:۲۳۱۹)۔

ایک دوسری روایت میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:۔

”زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا“ (ترمذی:۱۹۲۴)۔

اسلامی نظامِ معاشرت کے امتیازات

اسلام انسانوں کے باہم میل جول سے پیدا ہونے والی اجتماعیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی نشو و نما میں تعاون کرتا ہے۔ وہ ایسے فطری اصول دیتا ہے جن سے اجتماعیت کو تقویت ملے اور اس کے لیے صالح بنیادیں فراہم کرتا ہے اور ایسے عوامل کو ختم کرتا ہے جو اسے بگاڑ دیں یا محدود اور غیر مفید بنا دیں۔

اسلام کے معاشرتی نظام کے کچھ بنیادی اصول اور امتیازات ہیں۔ ان پر ذیل میں روشنی ڈالی جا رہی ہے:۔

وحدتِ نسلِ انسانی

اسلام نسلِ انسانی کی وحدت کا داعی ہے۔ اس کے نزدیک رنگ، نسل، وطن یا زبان کی بنا پر انسانوں کے درمیان کسی طرح کی تفریق کرنا روا نہیں۔ بلکہ فضیلت کا مدار انسان کے کردار پر ہے۔ قرآن مجید میں اس اصول کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

يَآ يُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوباً وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَٰكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ(سورة الحجرات:١٣)۔

''لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے''۔

اللہ کے رسول ﷺ نے قبیلۂ قریش کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

''اے گروہِ قریش! اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور اس پر فخر کرنے کا خاتمہ کردیا ہے۔ تمام انسان آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔'' (ابن ہشام:۴/۵۸)۔

دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:۔

''نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ اسی طرح نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فضیلت ہے نہ کسی کالے کو کسی گورے پر''(مسند احمد:۵/۴۱۱)۔

قیامِ خیر ورفعِ شر

اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں خیر کا بول بالا ہو اور جو شر سے بالکل پاک ہو، جس کے تمام افراد کے درمیان محبت، اخوت، ہمدردی، مواسات پائی جائے، وہ ایک دوسرے سے حسنِ ظن رکھیں، باہم بدگمانی، تجسّس، حسد وبغض اور غیبت وغیرہ سے دور رہیں، خوش دلی سے ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں''(ابوداؤد:۱۵۰۸)۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:۔

”بدگمانی سے بچو، اس لیے کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ لگو، نہ کسی کے رازوں کو جاننے کی کوشش کرو، نہ ایک دوسرے سے حسد کرو، نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو، نہ ایک دوسرے سے روگردانی کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو“(بخاری:۶۰۶۴، مسلم:۲۵۶۳)۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں صحابہ کرام کی ایک جماعت موجود تھی۔ آپ نے فرمایا:۔

”مجھ سے بیعت کرو اس بات پر کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، چوری نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، کسی پر خود ساختہ بہتان نہ باندھو گے، نیک کام میں نافرمانی نہ کرو گے۔ پس تم میں سے جس شخص نے اس عہد کو پورا کیا اس کا اجر اللہ تعالی کے ذمہ ہے اور جس نے اس کے خلاف کیا اور اسے دنیا میں ہی سزا مل گئی تو یہ سزا اس کا کفارہ ہے اور جس نے اس عہد کے خلاف کیا اور اللہ نے اس کی پردہ پوشی کی تو اس کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے گا تو معاف کر دے گا اور چاہے گا تو سزا دے گا“ (بخاری:۳۸۹۲، مسلم:۱۷۰۹)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

”سات ہلاک کر دینے والی چیزوں سے بچو“۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ کیا ہیں؟ فرمایا:(۱) کسی کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا(۲) جادو کرنا(۳) اس جان کو قتل کرنا جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، مگر حق شرعی کے ساتھ (۴) سود کھانا(۵) یتیم کا مال کھانا(۶) لڑائی کے موقع پر پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا(۷) پاک دامن اور معصوم مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا“(بخاری:۲۷۶۶، مسلم:۸۹)۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک موقع پر صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: جانتے ہو، غیبت کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: ”تیرا اپنے بھائی کے بارے میں ایسی بات کہنا جو اسے ناگوار ہو“۔ صحابہ نے عرض کیا: اگر وہ بات اس شخص میں پائی جاتی ہو؟ تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جو کچھ تم کہتے ہو اگر وہ اس میں موجود ہو یہی تو غیبت ہے۔ اگر وہ اس میں موجود نہ ہو تب تو تم نے اس پر بہتان لگایا“ (مسلم: ۲۵۸۹)۔

اس طرح کی بے شمار احادیث ہیں، جن میں اللہ کے رسول ﷺ نے ان خوبیوں کا تذکرہ فرمایا ہے جو اسلامی معاشرہ میں پائی جانی چاہئیں اور ان برائیوں سے سختی سے روکا ہے جن سے اسلامی معاشرہ کو پاک ہونا چاہیے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

معاشرہ کی پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کچھ لوگ ایسے ضرور رہنے چاہئیں جو دوسروں کو اچھائیوں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں۔

قرآن وحدیث میں اس سے متعلق تفصیلی احکام مذکور ہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّهِ (سورہ آل عمران:۱۱۰)۔

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِوَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (آل عمران:۱۰۴)۔

''تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے''۔

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:۔

''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ ضروری ہے کہ تم نیکی کی طرف بلاؤ اور برائی سے روکو، ورنہ عین ممکن ہے کہ اللہ اپنی طرف سے تم پر عذاب بھیج دے، پھر تم دعا کرو، مگر تمہاری دعا قبول نہ ہو۔''(ترمذی:۲۱۶۹)۔

ہمدردی و مواسات

اسلامی معاشرہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے افراد باہم شیر و شکر ہوتے ہیں۔ وہ اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہمدردی و غم خواری سے پیش آتے ہیں۔ دوسروں کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں ان کے کام آتے ہیں۔ انھیں اپنی جانب سے کسی طرح کی تکلیف نہیں پہنچاتے۔ وقتِ ضرورت ان کی مدد کرتے اور ان کا سہارا بنتے ہیں۔ حدیث میں ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جانوں اور مالوں کے سلسلہ میں مطمئن رہیں''(ترمذی:۲۶۲۷، نسائی:۴۹۹۵)۔

حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:۔

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے''(بخاری:۱۳، مسلم:۴۵)۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا اللہ تعالی اس کی ضرورت پوری کرے گا۔ جو شخص کسی مسلمان سے کوئی تکلیف ہٹائے گا اللہ تعالی روزِ قیامت کی تکلیفوں میں سے ایک تکلیف اس سے دور کر دے گا اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالی روزِ قیامت اس کی پردہ پوشی فرمائے گا''(بخاری:۲۴۴۲، مسلم:۲۵۸۰)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

”بیوہ اور مسکین کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا اللہ کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے والے کی طرح ہے“(راوی کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا) اور وہ رات میں عبادت کرنے والے اس شخص کی طرح ہے جو کبھی ناغہ نہیں کرتا اور اس روزہ دار کی طرح ہے جو مسلسل روزے رکھتا ہے“(بخاری:۶۰۰۷، مسلم:۲۹۸۲)۔

باہمی تعاون

اسلام چاہتا ہے کہ معاشرہ میں رہنے والے تمام افراد اس کی پاکیزگی کو قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ ہر شخص ذاتی طور پر پاکیزہ زندگی گزارے، زندگی کے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو پیش نظر رکھے اور اس کی ناراضی سے بچے، چنانچہ جن کاموں کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے ان پر عمل کرے اور جن کاموں سے روکا ہے ان سے باز رہے۔ اسی طرح اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو اچھے کاموں کی تلقین و تبلیغ کرے اور برے کاموں سے ان کو روکنے کی کوشش کرے۔ معاشرے کے تمام افراد مل کر نیکیوں کو فروغ دیں اور برائیوں سے اس کو پاک کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَتَعَاوَنُواْ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (سورۃ المائدۃ:۲) ۔

”جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں ایک دوسرے کا تعاون کرو اور جو کام گناہ اور زیادتی کے ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو“۔

’بر‘ اور ’اثم‘ اسلام کی جامع اصطلاحات ہیں۔ ’بر‘ نیکی کو کہتے ہیں۔ اس میں ہر طرح کے کارِ خیر شامل ہیں۔ اسی طرح ’اثم‘ برائی کو کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق تمام طرح کے برے کاموں پر ہوتا ہے۔ اس آیت میں اسلام کا ایک جامع قانون بیان کیا گیا ہے۔

قرآن میں دو گروپوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ ایک گروپ منافق مردوں اور عورتوں کا ہے اور دوسرا مومن مردوں اور عورتوں کا۔ منافق مرد اور عورت برائیوں کو پھیلانے اور اچھائیوں سے دوسروں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اہلِ ایمان مرد اور عورت نیکیوں کی اشاعت میں ایک دوسروں کا تعاون کرتے ہیں اور مل جل کر کوشش کرتے ہیں کہ معاشرہ میں برائیاں نہ پھیلیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

الْمُنٰفِقُونَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُم مِّن بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُواْ اللّهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (سورۃ التوبۃ:٦٧)۔

''منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روکے رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انھیں بھلا دیا۔ یقیناً یہ منافق ہی فاسق ہیں''۔

اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے سچے ایمان داروں کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا: ۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآء بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيْمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ (سورۃ التوبۃ:٧١)۔

''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ ایک دوسرے کو بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں''۔

سبق نمبر 12

اسلام اور سیاست

سیاست" (Politics) ساس" سے مشتق ہے جو یونانی زبان کا لفظ ہے، اس کے معانی شہر و شہر نشین کے ہیں۔

اصطلاح میں : فن حکومت اور لوگوں کو اصلاح سے قریب اور فساد سے دور رکھنے کو سیاست کہتے ہیں۔

قرآن میں سیاست کے معنیٰ : حاکم کا لوگوں کے درمیان میں حق کے ساتھ فیصلہ کرنا، معاشرے کو ظلم و ستم سے نجات دینا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا اور رشوت وغیرہ کو ممنوع قرار دینا ہے۔

حدیث میں سیاست کے معنی : عدل و انصاف اور تعلیم و تربیت کے ہیں۔

علماً کی نظر میں : رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت و روش، استعمار سے جنگ، مفاسد سے روکنا، نصیحت کرنا سیاست ہے۔

فلاسفہ کی نظر میں : فلاسفہ کے نزدیک فن حکومت، اجتماعی زندگی کا سلیقہ، صحیح اخلاق کی ترویج وغیرہ سیاست ہے۔

چونکہ انسان خود بخود مندرجہ بالا امور سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، لہٰذا کسی ایسے قانون کی ضرورت ہے جو انسانوں کو بہترین زندگی کا سلیقہ سکھائے، جس کو دین کہتے ہیں۔

سیاست اہلِ اسلام کی اصطلاح میں

اسلام میں سیاست اس فعل کو کہتے ہیں جس کے انجام دینے سے لوگ اصلاح سے قریب اور فساد سے دور ہو جائیں۔ اہل مغرب فن حکومت کو سیاست کہتے ہیں۔ امور مملکت کا نظم ونسق بر قرار رکھنے والوں کو سیاستدان کہا جاتا ہے۔

قرآن میں سیاست کا ذکر

قرآن کریم میں لفظ سیاست تو نہیں البتہ ایسی بہت سی آیتیں موجود ہیں جو سیاست کے مفہوم کو واضح کرتی ہیں، بلکہ قرآن کا بیشتر حصّہ سیاست پر مشتمل ہے، مثلاً عدل و انصاف، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ، مظلوموں سے اظہارِ ہمدردی وحمایت، ظالم اور ظلم سے نفرت اور اس کے علاوہ انبیا اور اولیأ کرام کا اندازِ سیاست بھی قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔

''وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (247)'' سورۂ بقرہ، آیت 247۔

"ان کے پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو حاکم مقرر کیا ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ یہ کس طرح حکومت کریں گے۔ ان کے پاس تو مال کی فراوانی نہیں ہے۔ ان سے زیادہ تو ہم ہی حقدار حکومت ہیں۔ نبی نے جواب دیا کہ انہیں اللہ نے تمہارے لیے منتخب کیا ہے اور علم و جسم میں وسعت عطا فرمائی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا ملک دے دیتا ہے کہ وہ صاحب وسعت بھی ہے اور صاحب علم بھی ۔

"اس آیت سے ان لوگوں کے سیاسی فلسفہ کی نفی ہوتی ہے جو سیاست مدار کے لیے مال کی فراوانی وغیرہ کو معیار قرار دیتے ہیں، سیاست دان کے لیے ذاتی طور پر" غنی "ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اسے" عالم وشجاع" ہونا چاہیے۔

سیاست کے اسلامی اصول

بنیادی ضابطہ

قرآن وسنت کے مطالعے سے جو چیز ایک بنیادی حقیقت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے گی، وہ یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست کی حکومت، دراصل، قانون خداوندی کی پابند ہوتی اور اس میں حقیقی مرجع اطاعت کا مقام صرف پروردگار کائنات اور نبی آخر الزماں محمد ﷺ ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جب حکمران کے لیے حق اطاعت بیان کیا، تو وہیں یہ بات بھی واضح فرمادی کہ ہر حال میں اور بے چون وچرا، اطاعت صرف قرآن وسنت کے ساتھ خاص ہے، ارشاد خداوندی ہے:۔

''اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر تمھارے درمیان، اگر کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو، تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی اچھا ہے'' (النساء۴: ۵۹)۔

دیکھ لیجیے، قرآن مجید کی اس آیۂ کریمہ سے تین باتیں بصراحت سامنے آتی ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ، رسول اکرم اور صاحب امر یعنی حکمران، ان تینوں کی اطاعت ضروری ہے۔ دوسری یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ تنازع اور اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور تیسری یہ کہ حکمران کے ساتھ تنازع اور اختلاف کی صورت پیش آسکتی ہے، مگر اس میں بھی فیصلہ کن حیثیت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی کو حاصل ہے۔

اس اصول پر کسی ریاست کا قیام ہی وہ امتیازی خصوصیت ہے، جو ایک عام ریاست کو اسلامی ریاست بنادیتی ہے، اور اس اصول کی رو سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں، معاملہ قانون کی تدوین کا ہو یا نظام کی تشکیل کا، قرآن وسنت سے کبھی انحراف نہ کیا جائے۔ قرآن مجید نے بڑی صراحت کے ساتھ، اس نوع کے انحراف کو کفر قرار دیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے: ۔

''اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، جسے اللہ نے نازل کیا ہے، وہی کافر ہیں'' (۵: ۴۴) ۔

ریاست کا مقصدِ وجود

ریاست کا وجود انسان کی معاشرت پسندی کا فطری نتیجہ ہے۔ امن و امان، دفاع اور اجتماعی خوش حالی، ہر معاشرے کی بنیادی ضروریات ہیں اور یہ بنیادی ضروریات ایک اجتماعی نظام اپنائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں، چنانچہ ریاست اور اس کے ان لوازم کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے، قرآن مجید نے اسلامی ریاست پر ان سے زائد کچھ خاص ذمہ داریاں بھی عائد کی ہیں، سورۂ حج میں ہے:۔

''یہ اہل ایمان وہ لوگ ہیں کہ) اگر ہم ان کو اس سرزمین میں اقتدار بخشیں گے، تو نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے''(۲۲: ۴۱)۔

جب اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں اسلامی نظام حکومت کی اساسات بیان کیں، تو پہلی ہدایت یہ فرمائی:۔

''اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تو عدل کے ساتھ کرو۔ نہایت عمدہ بات ہے جس کی اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے بے شک، اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے'' (۴: ۵۸)۔

اس ہدایت سے قرآن مجید یہ واضح کر دیتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں حقوق و فرائض کے ادا کرنے میں ''امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو'' کا اصول ملحوظ رکھا جائے گا اور نزاعات کو نمٹانے میں ''فیصلہ عدل کے ساتھ کرو'' کے حکم کو بنیادی قدر کی حیثیت حاصل ہو گی۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ قرآن مجید نے، تمام مسلمانوں پر ایک امت کی حیثیت سے شہادت حق، یعنی ساری دنیا کو دین کا پیغام اس طرح پہنچانے کی ذمہ داری عائد کی ہے کہ تمام عالم انسانی اس دین کا مجسم صورت میں مشاہدہ کر لے۔ وہ دیکھ لے کہ جس دین کو مسلمان مانتے ہیں وہ کیسے انسان پیدا کرتا، کیسا معاشرہ وجود میں لاتا اور انسانیت کو کیسا نظام اجتماعی عطا کرتا ہے، سورۂ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

''تم بہترین امت ہو، جو لوگوں (پر دین کی شہادت) کے لیے برپا کی گئی ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر فی الواقع، ایمان رکھتے ہو'' (۳: ۱۱۰)۔

امتِ مسلمہ یہ ذمہ داری، بتمام و کمال، صرف ایک سیاسی نظام (ریاست ہائے متحدہ اسلامیہ) میں بندھ جانے کے بعد ہی ادا کر سکتی ہے۔ گویا ایک اسلامی ریاست نہ صرف اپنے داخل میں دین کو قائم رکھنے کی ذمہ دار ہے، بلکہ اسے اپنے خارج میں بھی پروردگار کائنات کے دین کی علم بردار کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنا ہے۔

دائرۂ اطاعت

ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی ریاست کے مسلمان شہریوں پر غیر مشروط طور پر صرف اللہ تعالیٰ اور پیغمبر ﷺ ہی کی اطاعت فرض ہے۔ اگرچہ صاحبانِ امر کی اطاعت بھی لازم ہے، لیکن حکمران ہرگز یہ حق نہیں رکھتے کہ کسی ایسے معاملے میں اطاعت کا مطالبہ کریں، جس میں قرآن و سنت کے احکام کی نافرمانی لازم آتی ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے اس اصول کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے، آپ کا ارشاد ہے:۔

''خالق کی نافرمانی میں کوئی اطاعت جائز نہیں۔ اطاعت تو صرف اچھے کاموں میں ہے'' (بخاری، کتاب الاحکام)۔

احادیث سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اگر کسی وقت حکمران صریح کفر کا راستہ اختیار کر لیں تو نہ صرف یہ کہ اطاعت لازم نہیں رہتی، بلکہ اہل ایمان کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ صاحب امر کی اطاعت سے انکار کر دیں اور اگر ممکن ہو تو اسے اس منصب سے معزول کر دینے کی جدوجہد کریں۔

عبادہ بن صامت سے روایت ہے:۔

''نبی ﷺ نے فرمایا: تم ان سے جھگڑا بس اس وقت کر سکتے ہو، جب تم کوئی کھلا کفر ان کی طرف سے دیکھو، جس کے بارے میں تمھارے پاس اللہ تعالیٰ کی حجت موجود ہو'' (مسلم، کتاب الامارہ)۔

اسی بات کو آپ نے ایک دوسرے اسلوب میں بھی واضح فرمایا ہے۔ ام سلمہ سے روایت ہے:۔

''نبی ﷺ نے فرمایا: جلد ہی کچھ دوسرے لوگ تمھارے حکمران ہوں گے، یہ حکمران اچھے کام بھی کریں گے اور برے کام بھی۔ چنانچہ جس نے (برے کام کو) برا سمجھا وہ بری ٹھہرا اور جس نے اسے (علی الاعلان) منکر قرار دیا، وہ سلامتی کی راہ چلا۔ مگر (ان لوگوں کا معاملہ دوسرا ہے) جو اس پر

راضی رہے اور اس کی پیروی کی۔ لوگوں نے پوچھا؟ کیا ہم ان کے خلاف قتال نہ کریں تو آپ نے فرمایا: نہیں، جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں (اس وقت تک نہیں)" (مسلم، باب وجوب الانکار علی الامراء)۔

ان احادیث سے حکمرانوں کی اطاعت، ان کی اصلاح اور ان کی معزولی، ان تینوں صورتوں کے لیے، الگ الگ دائرۂ عمل متعین ہو جاتا ہے، یعنی حکمرانوں کی اس وقت تک اطاعت کی جائے گی، جب تک وہ راہ حق پر قائم رہیں۔ خلافِ حق امور میں ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی اور اس وقت تک اصلاح کی کوششیں جاری رکھی جائیں گی، جب تک نوبت ارتکاب کفر تک نہیں جا پہنچتی۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ دین میں اصلاً یہی مطلوب ہے کہ حتی الامکان، حکمرانوں کی اطاعت اور نظم وضبط کی پاس داری کی جائے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:۔

"آپ ﷺ نے فرمایا: سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تمھارے اوپر ایک چھوٹے سر والے حبشی غلام کو امیر بنا دیا جائے، جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق چلتا رہے" (بخاری، کتاب الاحکام)۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آپ ﷺ نے یہی ہدایت ایک دوسرے اسلوب میں کی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:۔

"جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے حکمران کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی۔ اسی طرح جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے حکمران کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی" (بخاری، کتاب الاحکام)۔

حکومت کی تشکیل

اسلام کے سیاسی قوانین کے مطابق صرف وہی حکومت باضابطہ ہے جو ریاست کے مسلمان شہریوں کے مشورے سے قائم ہوئی ہو۔ قرآن مجید نے اسلامی نظام ریاست کے اس بنیادی اصول کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، سورۂ شوریٰ میں ہے:۔

"مسلمانوں) کا نظام ان کے باہمی مشورے کی بنیاد سے چلتا ہے" (۴۲: ۳۸)۔

ریاست کے سارے معاملات، حکمرانوں کا انتخاب، ان کی معزولی، داخلی اور خارجی حکمت عملی، ہر نوعیت کی قانون سازی اور انھی معاملات کے لیے دین کے منشا کی تعیین و تشریح، غرض تمام اجتماعی امور انجام دینے کے لیے بنیادی اصول متعین کر دیتی ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت کے اسلوب سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہیں اور اس میں کسی بھی شخص کو کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں، اسی طرح اگر سب لوگ کسی ایک بات پر متفق نہ ہو سکیں تو اس حکم کا ایک بدیہی تقاضا یہ بھی ہے کہ اکثریت کی رائے فیصلہ کن ہو گی۔

مشورے کے اصول کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو بھی اسی کو اختیار کرنے کی ہدایت کی۔ سورۂ آل عمران میں ہے:۔

''تو ان سے درگزر کرو، ان کے لیے مغفرت چاہو اور ان سے معاملات میں مشورہ لیتے رہو'' (۳: ۱۵۹)۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کی براہ راست رہنمائی میں کام کر رہے تھے اور اسی کے دین کو دنیا تک، بے کم و کاست، پہنچا دینے پر مامور تھے، اس کے باوجود پسند یہی کیا گیا کہ اجتماعی معاملات صحابہ کے مشورے ہی سے انجام دیے جائیں، البتہ آپ اپنی خصوصی حیثیت کی وجہ سے اجتماعی یا اکثریتی رائے کے پابند نہیں تھے۔ آپ نے دین کا یہ منشا پوری شان کے ساتھ پورا کیا۔

چنانچہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:۔

''میں نے رسول اللہ سے زیادہ کسی شخص کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے والا نہیں پایا'' (ترمذی، کتاب الجہاد)۔

یہ اصول نہ صرف یہ کہ سنت رسول ﷺ میں پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے، بلکہ خلفاے راشدین نے بھی اس روایت کو قائم رکھا۔ چنانچہ آج بھی ہم تاریخ میں اس دور کی مجالس مشورہ اور ان میں کیے گئے اختلاف و اتفاق کی روداد پڑھ سکتے ہیں۔

اصحابِ مشورہ

قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ (سورہ آل عمران آیت نمبر 159) جہاں اسلامی نظام ریاست کا بنیادی اصول دیتی ہے، وہیں اس بات کی طرف اشارہ بھی کر دیتی ہے کہ یہ مشورہ کن لوگوں سے کیا جائے گا۔ یہ آیت یہ نہیں کہتی کہ ان کا نظام مشورے پر چلتا ہے، بلکہ وہ یہ کہتی ہے کہ ان کا نظام ان کے باہمی مشورے پر چلتا ہے۔ چنانچہ ان کے باہمی مشورے کے الفاظ کا تقاضا یہی ہے کہ یہ مشورہ صرف اہل ایمان سے کیا جائے اور اہلِ ایمان کے زمرے میں صرف وہی لوگ شمار ہوں گے، جو سورۂ توبہ میں بیان کی گئی شرائط پوری کرتے ہیں، ارشاد خداوندی ہے:۔

''پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، تو یہ تمھارے دینی بھائی ہیں'' (۹: ۱۱) ۔

یہ آیت مسلمان کی حیثیت سے اسلامی ریاست کا شہری بننے کے لیے لازمی شرائط بیان کرتی ہے۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ تائب ہو جائیں یعنی اسلامی تعلیمات سے روگردانی اور اسلام کی مخالفت کا رویہ چھوڑ دیں، اسلامی عقائد و اعمال اختیار کر لیں اور اسلامی نظام اور قانون کی اطاعت قبول کر لیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ نماز کا اہتمام کرنے لگیں۔

اور تیسری شرط یہ ہے کہ وہ حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے لگیں۔ جو شخص یہ تینوں شرطیں پوری کرتا ہے، اسے اسلامی ریاست کی کامل شہریت حاصل ہو جاتی ہے، بلکہ قرآن مجید کی تعبیر ''دینی بھائی'' سیاسی اور اجتماعی معاملات و حقوق میں اسلام کا برابری اور مساوات کا تصور بڑی خوبی کے ساتھ واضح کرتی ہے۔

مجلسِ شوریٰ

ہر معاملے میں سارے اہلِ ایمان سے مشورہ لینا، عملاً ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ تمام طبقات کے نمائندہ افراد سے مشورہ لیا جائے۔ اس متبادل حل کو خود نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنی زندگی میں اختیار کیا، بخاری میں ہے:۔

''مسلمانوں نے حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق جب ہوازن کے قیدی رہا کرنے کی اجازت دی تو آپ نے فرمایا: میں نہیں جان سکا کہ تم میں سے کس نے اجازت دی ہے اور کس نے نہیں دی، پس تم جاؤ اور اپنے لیڈروں کو بھیجو، تاکہ وہ تمھاری رائے سے ہمیں آگاہ کریں'' (کتاب الاحکام)۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اسی قاعدے کے مطابق مجالس شوریٰ کے اجلاس بلائے۔ قاضی ابو یوسف نے عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مجلس شوریٰ کے انعقاد کا حال لکھا ہے:۔

''لوگوں نے کہا: تو پھر آپ باقاعدہ مشورہ کیجیے، اس پر آپ نے مہاجرین اولین سے مشورہ کیا تو ان کی رایوں میں بھی اختلاف تھا۔ عبد الرحمٰن بن عوف کی رائے تھی کہ ان لوگوں کے حقوق انہیں میں تقسیم کر دینے چاہیں اور عثمان، علی، طلحہ اور ابن عمر رضوان اللہ علیہم، عمر رضی اللہ عنہ سے متفق تھے، پھر آپ نے انصار میں سے دس افراد کو بلایا: پانچ اوس کے اکابر و اشراف میں سے اور پانچ خزرج کے اکابر و اشراف میں سے'' (کتاب الخراج، فصل فی الفئی والخراج)۔

اصحابِ حکومت کے اوصاف

قرآن مجید اور احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کارِ حکومت کے ذمہ دار، خواہ ان کی حیثیت مرکزی حکمران کی ہو، خواہ وہ کہیں عامل ہوں اور خواہ وہ مجلسِ شوریٰ کے ممبر ہوں، انھیں چند متعین اوصاف کا حامل ہونا چاہیے۔ سورۂ نساء میں ان کی ایک بنیادی خصوصیت بیان ہوئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

''اور جب امن یا خطرے کا کوئی معاملہ ان کو پیش آتا ہے تو اسے پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول اور اپنے اولی الامر کے سامنے پیش کرتے تو جو لوگ ان میں استنباط کی صلاحیت رکھنے والے ہیں، وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے'' (۴: ۸۳)۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ حکومت کا اجتماعی معاملات کو سمجھنے، صورتِ حال کا تجزیہ کرنے اور صحیح نتائج تک پہنچنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہونا، ایک بنیادی وصف ہے۔ یہ تو وہ خصوصیت ہے جس کے بغیر کارِ حکومت بطریق احسن انجام ہی نہیں پا سکتا، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی

ضروری ہے کہ یہ لوگ متاعِ کردار بھی رکھتے ہوں۔ ایک اسلامی معاشرے میں وہی لوگ رہنما اور حکمران ہو سکتے ہیں جو نیکی اور اخلاق میں دوسروں سے فائق تر ہوں، جب اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت و شرف کا مقام اہل تقویٰ کو حاصل ہے تو اللہ کے بندوں کے ہاں بھی امارت و قیادت انہی کو حاصل ہونی چاہیے۔

قرآن مجید میں ہے "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" (اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ محترم وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے)۔ یہ آیتِ کریمہ واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلامی معاشرے میں بنیادی قدر کی حیثیت سے کس چیز کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

ایک حدیث میں نبی ﷺ نے اس کی اہمیت ایک دوسرے اسلوب میں واضح فرمائی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:۔

"جب اخلاق و کردار کے لحاظ سے بہترین لوگ تمھارے حکمران ہوں، تمھارے دولت مند سخی ہوں اور تمھارا نظام مشورے پر مبنی ہو تو زمین کی پیٹھ تمھارے لیے اس کے پیٹ سے بہتر ہے اور جب بدترین لوگ تمھارے حکمران ہوں، تمھارے دولت مند بخیل ہوں اور تمھارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو زمین کا پیٹ تمھارے لیے اس کی پیٹھ سے بہتر ہے" (ترمذی، ابواب الفتن)۔

علاوہ ازیں، ان عہدوں کے حریص بھی اسلامی ریاست کے ان مناصب کے لیے نااہل قرار پاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:۔

"خدا کی قسم، ہم کسی ایسے شخص کو اس نظام میں کوئی عہدہ نہ دیں گے، جو اسے مانگے اور اس کا حریص ہو" (مسلم، کتاب الامارۃ)۔

عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے آپ نے اس کی وجہ بھی بیان کی:۔

"عبدالرحمن! امارت کے طالب نہ بنو۔ اگر یہ خواہش کے نتیجے میں دی گئی تو تم اسی کے حوالے کر دیے جاؤ گے اور اگر بغیر خواہش کے حاصل ہوئی تو اللہ کی طرف تمھاری مدد کی جائے گی" (مسلم، کتاب الامارۃ)۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جسے اسلامی حکومت کا سربراہ بننا ہو، اسے ان کے علاوہ بعض دوسری خصوصیات کا بھی حامل ہونا چاہیے۔

قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے لیے حضرت طالوت کے انتخاب کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

"بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے تمھاری سربراہی کے لیے منتخب کیا ہے اور اسے علم اور بدن میں بڑی کشایش دی ہے" (البقرہ ۲: ۲۴۷)۔

یہ آیت بیان کرتی ہے کہ اس شخصیت کو دوسروں سے زیادہ وجیہ، دوسروں سے زیادہ صاحبِ وقار اور علم و دانش میں سب سے ممتاز ہونا چاہیے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ افراد جو مردانہ عزم و حزم سے محروم ہوتے اور جن کی شخصیت میں کر گزرنے کے بجائے سہ جانے، غلبے کے بجائے مغلوب ہونے، متاثر کرنے کے بجائے متاثر ہونے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے، وہ اسلامی ریاست کی سربراہی کے لیے، کسی طرح بھی، موزوں نہیں ہو سکتے، دراں حالیکہ، یہی وہ خصوصیات ہیں جو ایک عورت کو ماں، بہن اور بیوی کی حیثیت میں ایک انتہائی موزوں شخصیت بنا دیتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے، ایک سربراہ مملکت میں یہی خصوصیات اسے اس منصب کے لیے انتہائی ناموزوں بنا دیں گی۔

منصبِ اقتدار کے لیے ضوابط

نبی ﷺ نے مدینے میں منصبِ اقتدار پر فائز ہونے کے بعد، جس سنت کی بنیاد ڈالی اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے جس طرح اس کو قائم رکھا اور بعد میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جیسے اس کا احیا کیا، اس سے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ اسے اصحابِ اقتدار کے لیے ایک خلافت علی منہاج النبوہ کی علامات کی حیثیت حاصل ہے۔ آپ کی اس سنت سے تین ضوابط سامنے آتے ہیں:۔

۔**الف۔ سربراہِ مملکت:** سربراہِ حکومت اور علاقائی حکمرانوں کا رہن سہن عام آدمی کے برابر ہو گا اور یہ چیز انھیں ہر حال میں اختیار کرنا ہو گی خواہ ان کے ذاتی حالات کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفاے راشدین رضوان اللہ عنہم نے، تاریخ گواہ ہے کہ فقر کی یہ زندگی اپنے ارادے سے اختیار فرمائی اور اس وقت بھی اسی پر قائم رہے، جب روم و ایران کے خزانے ان کے قدموں کی ٹھوکر پر تھے۔

۔**ب۔** ان کے لیے کسی حال میں بھی جائز نہیں کہ ان کے اور عامۃ الناس کے مابین کوئی رکاوٹ حائل ہو۔ ضروری ہے کہ ان کے دروازے ریاست کے شہریوں کے لیے اس طرح کھلے رہیں کہ ریاست کا کوئی بھی شہری ہر وقت کسی مشکل کے بغیر ان سے مل سکے۔

۔ج۔ نماز جمعہ مرکزی دارالحکومت میں حکمران کی اقتدا میں ادا کی جائے گی اور اسی طرح علاقائی حکمران اپنے اپنے علاقوں میں جمعے کی نماز کی امامت کرائیں گے۔ یہی وہ ضابطہ ہے جو ایوانِ اقتدار کو مسجد سے متعلق کرتا اور دین و دنیا کی دوئی کا ریاست کی سطح پر بھی خاتمہ کر دیتا ہے۔

شہریوں کے حقوق

اسلامی ریاست کی مکمل شہریت صرف انہی افراد کو حاصل ہوتی ہے، جو خلافِ دین اعمال و عقائد کو چھوڑ دیں، نماز کا اہتمام کرنے لگیں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں۔ شہریت کی یہ شرائط سورۂ توبہ کی جس آیت میں بیان ہوئی ہیں، وہی آیت شہریوں کے حقوق بھی بیان کرتی ہے۔ یہ آیت اس سورہ میں دو مرتبہ آئی ہے۔ ایک مرتبہ اس آیت کا اختتام "تو ان کی راہ چھوڑ دو" اور دوسری مرتبہ "تو یہ تمھارے بھائی ہیں" کے جملے پر ہوا ہے۔ قرآن مجید نے اپنے اعجاز بلاغت سے ان دو مختصر جملوں سے شہریوں کے تمام تر حقوق کا احاطہ کر لیا ہے، بلکہ یہ آیت اسلامی ریاست کے شہریوں کو وہ حقوق بھی دیتی ہے جن کا موجودہ دور کی جدید ترین ریاست ابھی تصور بھی نہیں کر سکی۔

سورۂ توبہ کی یہ آیت واضح کرتی ہے:۔

۔ا۔ اسلامی حکومت دین کے عقائد و اعمال کی خلاف ورزی پر اپنے ان شہریوں کے خلاف تادیبی کارروائی کر سکتی ہے۔

"اگر وہ توبہ کر لیں... تو ان کی راہ چھوڑ دو" کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں جو چیزیں ممنوع ہیں، ان کے ارتکاب پر اسلامی حکومت ریاست کے مسلمان شہریوں کو پکڑ سکتی اور انھیں ان کے جرم کی سزا دے سکتی ہے۔ اسی طرح اپنے شہریوں کو دوسروں کے جان و مال، عزت و آبرو اور انھیں حاصل شہری حقوق کے خلاف اقدام سے روک سکتی اور اس نوع کے اقدام پر سزا دے سکتی ہے اور ایسی قانون سازی بھی کر سکتی ہے، جس کے نتیجے میں اس طرح کے جرائم کا سدِباب ہو سکے۔

۔۲۔ اسلامی حکومت اپنے مسلمان شہریوں کو نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ، قانونی طور پر کسی چیز پر عمل کا پابند نہیں کر سکتی۔

''اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگ جائیں تو ان کی راہ چھوڑ دو'' کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے شہریوں پر ان دو کے علاوہ جبری طور پر کوئی عمل لازم قرار دے دے۔ یہاں تک کہ وہ دین کے دوسرے فرائض بھی قانون کی طاقت سے ادا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

یہ اصول آزادی رائے، آزادی فکر، آزادی اظہار اور آزادی عمل کا پروانہ ہے۔ اس سے زندگی کے ہر میدان میں تجارت، خرید و فروخت، صنعت و حرفت اور ذاتی امور میں کامل آزادی اختیار و عمل حاصل ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آزادی کا ایک ایسا نوشتہ ہے، جسے جاری کرنے کا فخر صرف انبیا اور ان کے متبعین کو حاصل ہے۔ اور کسی دوسرے فکر کے حاملین کے ہاں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ موجودہ جمہوریت بھی اس باب میں ابھی اسلام سے بہت پیچھے ہے۔

۳۔ جو افراد ان شرائط کو پورا کرتے ہیں، شہری حقوق کے حوالے سے، وہ سب برابر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی بھی شخص کو کسی بھی وجہ سے کوئی امتیازی حقوق حاصل نہیں ہو سکتے۔ ''تو وہ تمھارے بھائی ہیں'' سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان اربابِ اقتدار ہوں یا عامۃ الناس، ان کا باہمی رشتہ بھائیوں کا رشتہ ہے۔ قانونی حقوق کی نسبت سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ اسلام میں کسی تفریق و امتیاز کی کوئی گنجائش ہے۔

غیر مسلموں کے حقوق

غیر مسلم کسی اسلامی ریاست کے شہری دو ہی اعتبار سے ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ انھوں نے کسی معاہدے کی بنا پر اسلامی ریاست کا حصہ بننا قبول کر لیا ہو اور دوسرے یہ کہ اسلامی فوج بزور بازو ان کا علاقہ فتح کر کے، اسے اسلامی ریاست میں شامل کر دے۔

پہلی صورت میں یہ معاہد ہیں اور ان کے حقوق اس معاہدے میں جو کچھ طے ہو جائیں گے، وہ انھیں بے کم و کاست حاصل رہیں گے، مسلمان اس معاملے میں قرآن و سنت کی ہدایات کی رو سے پابند ہیں کہ وہ عہد معاہدے سے سر مو انحراف نہ کریں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

''اور عہد کو پورا کرو، اس لیے کہ عہد کے بارے میں، لاریب، قیامت کے دن تم سے پوچھا جائے گا'' (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴)۔

خاص ان کے حوالے سے آپ ﷺ نے فرمایا:۔

''خبر دار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالے گا یا اس کی رضامندی کے بغیر کوئی چیز اس سے لے گا، اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود استغاثہ کروں گا'' (ابو داؤد، کتاب الجہاد)۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر کوئی ریاست کسی معاہدے کے تحت غیر مسلموں کو ایسے حقوق بھی دے دے جو صرف مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ جیسا کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتیں تقسیم کے معاہدے کے تحت بہت سے حقوق رکھتی ہیں۔

مفتوح علاقوں کے غیر مسلم، جنہیں ذمی کہتے ہیں، اگر جزیہ دے کر اسلامی حکومت کی اطاعت اختیار کر لیں، تو انھیں وہ تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے جو عدل و انصاف کا تقاضا ہیں۔ عدل و انصاف کی پاسداری مسلمانوں سے ہر حال میں مطلوب ہے، خواہ معاملہ دشمن ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

''اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو۔ یہی تقویٰ کے قریب تر ہے'' (المائدہ ۵: ۸)۔

اور ذمی تو اسلامی ریاست کی اطاعت قبول کر چکے ہیں، ان کے ساتھ تو بدرجۂ اتم عدل و انصاف ہی کا معاملہ ہونا چاہیے۔ ان کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت اس طرح کی جائے گی کہ نہ اسلامی حکومت کے اہل کار اس معاملے میں خود کوئی تجاوز کریں، نہ کسی دوسرے شہری کو کرنے دیں۔ ان پر جزیہ تو عائد ہو گا، لیکن اس کی مقدار اتنی ہر گز نہ ہو گی کہ ان کے لیے اسے ادا کرنا مشکل ہو جائے۔ علاوہ ازیں، یہ جزیہ صرف ان سے لیا جائے گا جو جنگ و قتال کی اہلیت رکھتے ہیں اور بچے، عورتیں ذہنی اور جسمانی لحاظ سے معذور، دنیا سے بے تعلق راہب اور درویش اور معاشی جدوجہد سے الگ بوڑھے اور بیمار جزیہ ادا نہیں کریں گے۔ بنیادی ضرورتوں کے ضمن میں، ان میں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ ان کے عقیدہ و مذہب میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کی جائے گی اور ان کی عبادت گاہیں قائم رہیں گی۔ وہ اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے میں آزاد ہوں گے اور شخصی معاملات میں انھیں ریاست کے قانون سے استثنا بھی دیا جائے گا۔ اسی طرح انھیں اجازت ہو گی کہ وہ اپنا مذہبی نقطۂ نظر مناسب طریقے سے دوسروں کے سامنے رکھ سکیں۔

حکمران پارٹی

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ ہر معاشرہ ایک بڑی وحدت ہونے کے ساتھ ساتھ اندرونی طور پر چند گروہوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اور یہ گروہ بالعموم ملک کے سیاسی معاملات میں بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور عام طور پر انہی میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہوتی ہے، چنانچہ سیاسی نظام کی تشکیل میں اس سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے کہ ملک کی زمامِ اقتدار کس گروہ کے ہاتھ میں دی جائے گی۔ ہم جب رسول اللہ ﷺ کی سنت کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سوال کا جواب، متعین طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے جانشین کا انتخاب ایک اہم ترین مسئلہ تھا۔ اس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر نبی اکرم ﷺ نے اپنی زندگی ہی میں اس کی طرف توجہ دی اور قرآن میں بیان کردہ "امرھم شوریٰ بینھم" کے اصول کی روشنی میں یہ طے کر دیا کہ آیندہ کس گروہ کو اقتدار میں آنا ہے، معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:۔

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ ہمارا یہ اقتدار قریش میں رہے گا۔ اس معاملے میں جو بھی ان کی مخالفت کرے گا، اسے اللہ اوندھے منہ آگ میں ڈال دے گا۔ جب تک کہ وہ (یعنی قریش) دین پر قائم رہیں" (بخاری، کتاب الاحکام)۔

اپنے اس فیصلے کی وجہ آپ نے یہ بیان کی:۔

"لوگ اس معاملے میں قریش کے تابع ہیں، عرب کے مومن ان کے مومنوں کے پیرو ہیں اور ان کے کافر ان کے کافروں کے" (مسلم، کتاب الامارہ)۔

قریش کے حق میں جیسا کہ روایات سے واضح ہے، اس فیصلے کا سبب یہ تھا کہ انھیں پورے عرب میں مضبوط سیاسی عصبیت اور اکثریت کی سیاسی حمایت حاصل تھی۔ سیاسی عوامل پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ اکثریت کی سیاسی حمایت کے بغیر کوئی مستحکم حکومت قائم نہیں کی جا سکتی۔ حضور ﷺ نے اس اہم سیاسی اصول کو نگاہ میں رکھتے ہوئے جب عرب کے حالات کا جائزہ لیا تو آپ نے یہ جان لیا کہ اقتدار کے معاملے میں قریش ہی کو عرب میں

اکثریت کی تائید حاصل ہے، چنانچہ آپ نے واضح الفاظ میں قریش کو نامزد کر دیا، تاکہ آپ کے بعد انتقالِ اقتدار کا مرحلہ بغیر کسی نزاع کے گزر جائے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس وقت مسلمانوں میں قریش (مہاجرین) اور اوس و خزرج (انصار) دین کے ساتھ وابستگی، دینی خدمات اور دین کے لیے ایثار و قربانی کے لحاظ سے کم و بیش برابر سرابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ لہٰذا فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آپ کے بعد اسلامی ریاست پر حکومت کا حق کس گروہ کو حاصل ہو گا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے بعد ثقیفہ بنی ساعدہ میں یہی سوال سامنے آیا اور آپ ہی کا کیا ہوا فیصلہ امن و امان کے ساتھ آپ کے جانشین کے انتخاب کا ذریعہ بنا۔ آپ کی طرف سے یہ اقدام اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس زمانے میں اکثریتی گروہ کے تعین کے لیے عوامی رائے معلوم کرنے کی نہ کوئی تدبیر تھی اور نہ ایسی سہولتیں موجود تھیں کہ کوئی طریقہ اختیار کیا جاتا۔

سبق نمبر 13

اسلام اور سائنس

اِسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے ساتھ ساتھ دینِ فطرت بھی ہے جو اُن تمام اَحوال و تغیرات پر نظر رکھتا ہے جن کا تعلق اِنسان اور کائنات کے باطنی اور خارجی وُجود کے ظہور سے ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اِسلام نے یونانی فلسفے کے گرداب میں بھٹکنے والی اِنسانیت کو نورِ علم سے منوّر کرتے ہوئے جدید سائنس کی بنیادیں فراہم کیں۔ قرآنِ مجید کا بنیادی موضوع ''اِنسان'' ہے، جسے سینکڑوں بار اِس اَمر کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش وُقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات اور حوادثِ عالم سے باخبر رہنے کے لئے غور و فکر اور تدبر و تفکر سے کام لے اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ شعور اور قوتِ مُشاہدہ کو بروئے کار لائے تاکہ کائنات کے مخفی و سربستہ راز اُس پر آشکار ہو سکیں۔

قرآنِ مجید نے بندۂ مومن کی بنیادی صفات و شرائط کے ضمن میں جو اَوصاف ذِکر کئے ہیں اُن میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں تفکر (علمِ تخلیقیات (Cosmology) کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

قرآنِ حکیم نے آئیڈیل مسلمان کے اَوصاف بیان کرتے ہوئے اِرشاد فرمایا:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُوْلِي الْأَلْبَابِOالَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِO(آل عمران، 3 : 190، 191)۔

بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب و روز کی گردِش میں عقلِ سلیم والوں کیلئے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیںo یہ وہ لوگ ہیں جو (سراپا نیاز بن کر) کھڑے اور (سراپا ادب بن کر) بیٹھے اور (ہجر میں تڑپتے ہوئے) اپنی کروٹوں پر (بھی) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق (میں کارفرما اُس کی عظمت اور حسن کے جلوؤں) میں فکر کرتے رہتے ہیں۔ (پھر اُس کی معرفت سے لذّت آشنا ہو کر پکار اُٹھتے ہیں) اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا۔ تو (سب کوتاہیوں اور مجبوریوں سے) پاک ہے، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالےo

اِن آیاتِ طیبات میں بندۂ مومن کی جو شرائط پیش کی گئی ہیں اُن میں جہاں کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہوئے زِندگی کے ہر حال میں اپنے مولا کی یاد اور اُس کے حضور حاضری کے تصوّر کو جاگزیں کرنا مطلوب ہے، وہاں اِس برابر کی دُوسری شرط یہ رکھی گئی ہے کہ بندۂ مومن آسمانوں اور زمین کی خِلقت کے باب میں غور و فکر کرے اور یہ جاننے میں کوشاں ہو کہ اِس وُسعتِ اَفلاک کا نظام کن اُصول و ضوابط کے تحت کارفرما ہے اور پھر پلٹ کر اپنی بے وُقعتی کا اَندازہ کرے۔ جب وہ اِس وسیع و عریض کائنات میں اپنے مقام و مرتبہ کا تعین کرلے گا تو خود ہی پکار اُٹھے گا: ''اے میرے ربّ! تو ہی میرا مولا ہے اور تو بے عیب ہے۔ حق یہی ہے کہ اِس وُسعتِ کائنات کو تیری ہی قوت وُجود بخشے ہوئے ہے۔ اور تو نے یہ عالم بے تدبیر نہیں بنایا''۔

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ کے پہلے حصہ میں ''خالق'' اور دُوسرے حصے میں '' خَلق'' کی بات کی گئی ہے، یعنی پہلے حصے کا تعلق مذہب سے ہے اور دُوسرے کا براہِ راست سائنس اور خاص طور پر علمِ تخلیقیات (cosmology) سے ہے۔

مذہب اور سائنس میں تعلق

آج کا دَور سائنسی علوم کی معراج کا دَور ہے۔ سائنس کو بجا طور پر عصری علم (contemporary knowledge) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا دَورِ حاضر میں دِین کی صحیح اور نتیجہ خیز اِشاعت کا کام جدید سائنسی بنیادوں پر ہی بہتر طور پر سرانجام دِیا جاسکتا ہے۔ بناءبریں اِس دَور میں اِس اَمر کی ضرورت گزشتہ صدیوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے کہ مُسلم معاشروں میں جدید سائنسی علوم کی ترویج کو فروغ دیا جائے اور دِینی تعلیم کو سائنسی تعلیم سے مربوط کرتے ہوئے حقانیتِ اِسلام کا بول بالا کیا جائے۔ چنانچہ آج کے مسلمان طالبِ علم کے لئے مذہب اور سائنس کے باہمی تعلق کو قرآن و سنت کی روشنی میں سمجھنا ازبس ضروری ہے۔

مذہب ''خالق'' (Creator) سے بحث کرتا ہے اور سائنس اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ''خَلق'' (creation) سے۔ دُوسرے لفظوں میں سائنس کا موضوع ''خَلق'' اور مذہب کا موضوع ''خالق'' ہے۔ یہ ایک قرینِ فہم و دانش حقیقت ہے کہ اگر مخلوق پر تدبر و تفکر اور سوچ بچار مثبت اور دُرست انداز میں کی جائے تو اُس مثبت تحقیق کے کمال کو پہنچنے پر لامحالہ اِنسان کو خالق کی معرفت نصیب ہو گی اور وہ بے اِختیار پکار اُٹھے گا:۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلاً.(آل عمران،3 : 191)۔

اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا۔

بندۂ مومن کو سائنسی علوم کی ترغیب کے ضمن میں اللہ ربّ العزت نے کلامِ مجید میں ایک اور مقام پر یوں اِرشاد فرمایا:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حم السجدہ،41 : 53)۔

ہم عنقریب اُنہیں کائنات میں اور اُن کے اپنے (وُجود کے) اندر اپنی نشانیاں دِکھائیں گے، یہاں تک کہ وہ جان لیں گے کہ وُہی حق ہے۔

اِس آیتِ کریمہ میں باری تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ہم اِنسان کو اُس کے وُجود کے اندر موجود داخلی نشانیاں(internal signs) بھی دِکھادیں گے اور کائنات میں جابجا بکھری خارجی نشانیاں(external signs) بھی دِکھادیں گے، جنہیں دیکھ لینے کے بعد بندہ خود بخود بے تاب ہو کر پکار اُٹھے گا کہ حق صرف اللہ ہی ہے۔

دَورِ حاضر کا المیہ

قرآنِ مجید میں کم و بیش ہر جگہ مذہب اور سائنس کا اِکٹھا ذِکر ہے، مگر یہ ہمارے دَور کا اَلمیہ ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں کی سیادت و سربراہی ایک دُوسرے سے ناآشنا اَفراد کے ہاتھوں میں ہے۔ چنانچہ دونوں گروہ اپنے مدِّمقابل دُوسرے علم سے دُوری کے باعث اُسے اپنا مخالف اور متضاد تصوّر کرنے لگے ہیں۔ جس سے عامۃُ الناس کم علمی اور کم فہمی کی وجہ سے مذہب اور سائنس میں تضاد اور تخالف(contradiction&conflict) سمجھنے لگتے ہیں، جبکہ حقیقت اِس کے بالکل برعکس ہے۔

مغربی تحقیقات اِس امر کا مسلّمہ طور پر اِقرار کرچکی ہیں کہ جدید سائنس کی تمامتر ترقی کا اِنحصار قرونِ وُسطیٰ کے مسلمان سائنسدانوں کی فراہم کردہ بنیادوں پر ہے۔ مسلمان سائنسدانوں کو سائنسی نہج پر کام کی ترغیب قرآن و سنت کی اُن تعلیمات نے دی تھی جن میں سے کچھ کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔ اِسی منشائے ربانی کی تکمیل میں مسلم سائنسدانوں نے ہر شعبۂ علم کو ترقی دی اور آج اَغیار کے ہاتھوں وہ علوم اپنے نکتۂ کمال کو پہنچ چکے

ہیں۔ شومئ قسمت کہ جن سائنسی علوم وفنون کی تشکیل اور اُن کے فروغ کا حکم قرآن وحدیث میں جابجا موجود ہے اور جن کی اِمامت کا فریضہ ایک ہزار برس تک خود بغداد، رے، دِمشق، اسکندریہ اور اندلس کے مسلمان سائنسدان سرانجام دیتے چلے آئے ہیں، آج قرآن وسنت کے نام لیوا طبقِ ارضی پر بکھرے اَرب بھر مسلمانوں میں سے ایک بڑی تِعداد اُسے اِسلام سے جدا سمجھ کر اپنی ''تجدّد پسندی'' کا ثبوت دیتے نہیں شرماتی۔ سائنسی علوم کا وہ پودا جسے ہمارے ہی اَجداد نے قرآنی علوم کی روشنی میں پروان چڑھایا تھا، آج اَغیار اُس کے پھل سے محظوظ ہو رہے ہیں اور ہم اپنی اصل تعلیمات سے رُوگرداں ہو کر دیارِ مغرب سے اُنہی علوم کی بھیک مانگ رہے ہیں۔

آج ایک طبقہ اگر اِسلام سے اِس حد تک رُوگرداں ہے تو دُوسرا نام نہاد ''مذہبی طبقہ'' سائنسی علوم کو اَجنبی نظریات کی پیداوار قرار دے کر اُن کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ بنا ہوا ہے۔ مذہبی وسائنسی علوم میں مغایرت کا یہ تصوّر قوم کو دو واضح حصوں میں تقسیم کر چکا ہے۔ نسلِ نو اپنے اَجداد کے سائنسی کارہائے نمایاں کی پیروِی کرنے یا کم از کم اُن پر فخر کرنے کی بجائے زوال ومسکنت کے باعث اپنے علمی، تاریخی اور سائنسی وِرثے سے اِس قدر لاتعلق ہو گئی ہے کہ خود اُنہی کو اِسلام اور سائنس میں عدم مغایرت پر قائل کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔

مذہب اور سائنس میں عدمِ تضاد

سائنس اور اِسلام میں تضاد کیونکر ممکن ہے جبکہ اِسلام خود سائنس کی ترغیب دے رہا ہے! بنابریں اِسلامی علوم کل ہیں اور سائنسی علوم محض اُن کا ایک جزو۔ جزو اور کل میں مغایرت (conflict) ناممکن ہے۔ مذہب اور سائنس پر اپنی اپنی سطح پر تحقیقات کرنے والے دُنیا بھر کے محققین کے لئے یہ ایک عالمگیر چیلنج ہے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مذہب اور سائنس میں تضاد ہے تو اُس کے ساتھ دو میں سے یقیناً ایک بات ہو گی، ایک اِمکان تو یہ ہے کہ وہ مذہب کی صحیح سمجھ سے عاری ہو گا بصورتِ دیگر اُس نے سائنس کو صحیح طور پر نہیں سمجھا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس نکتے پر اُسے تضاد نظر آ رہا ہو مطالعہ میں کمی کے باعث وہ نکتہ اُس پر صحیح طور پر واضح نہ ہو سکا ہو۔ اگر کسی معاملے کو صحیح طور پر ہر پہلو سے جانچ پرکھ کر سمجھ لیا جائے تو بندہ از خود یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ اِسلام کی رُو سے مذہب اور سائنس دونوں دینِ مبین کا حصہ ہیں۔

سائنس کا دائرۂ کار مُشاہداتی اور تجرباتی علوم پر منحصر ہے جبکہ مذہب اَخلاقی ورُوحانی اور مابعد الطبیعیاتی اُمور سے متعلق ہے۔ اَب ہم مذہب اور سائنس میں عدمِ تضاد کے حوالے سے تین اہم دلائل ذِکر کرتے ہیں:۔

۔1۔ بنیاد میں فرق

مذہب اور سائنس میں عدمِ تضاد کی بڑی اہم وجہ یہ ہے کہ دونوں کی بنیادیں ہی جدا جدا ہیں۔ دَر حقیقت سائنس کا موضوع ''علم'' ہے جبکہ مذہب کا موضوع ''ایمان'' ہے۔ علم ایک ظنّی شے ہے، اِسی بناء پر اُس میں غلطی کا اِمکان پایا جاتا ہے، بلکہ سائنس کی تمام پیش رفت ہی اِقدام وخطاء (error&trial) کی طوِیل جِدّوجُہد سے عبارت ہے۔ جبکہ دُوسری طرف اِیمان کی بنیاد ظن کی بجائے یقین پر ہے۔ اِس لئے اُس میں خطا کا کوئی اِمکان موجود نہیں۔

اِیمان کے ضمن میں سورۂ بقرہ میں اِرشادِ ربانی ہے:۔

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ.(البقرہ،2 : 3)۔

جو غیب پر اِیمان لاتے ہیں۔

گویا اِیمان جو کہ مذہب کی بنیاد ہے، مُشاہدے اور تجربے کی بناء پر نہیں بلکہ وہ بغیر مُشاہدہ کے نصیب ہوتا ہے۔ اِیمان ہے ہی اُن حقائق کو قبول کرنے کا نام جو مُشاہدے میں نہیں آتے اور پردۂ غیب میں رہتے ہیں۔ وہ ہمیں اپنے خود ساختہ ذرائعِ علم سے معلوم نہیں ہوسکتے بلکہ اُنہیں مشاہدے اور تجربے کے بغیر محض اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتانے سے مانا جاتا ہے، مذہب کی بنیاد اِن حقائق پر ہے۔ اِس کے مقابلے میں جو چیزیں ہمیں نظر آرہی ہیں، جن کے بارے میں حقائق اور مُشاہدات آئے دِن ہمارے تجربے میں آتے رہتے ہیں، اُن حقائق کا علم سائنس کہلاتا ہے۔ چنانچہ سائنس اِنسانی اِستعداد سے تشکیل پانے والا علم (human acquired wisdom) ہے، جبکہ مذہب خدا کی طرف سے عطا کردہ علم (God-gifted wisdom) ہے۔ اِسی لئے سائنس کا سارا علم اِمکانات پر مبنی ہے، جبکہ مذہب میں کوئی اِمکانات نہیں بلکہ وہ سراسر قطعیات پر مبنی ہے۔

مذہب کے تمام حقائق وُثوق اور حتمیت (finality&certainty) پر مبنی ہیں، یعنی مذہب کی ہر بات حتمی اور اَمرِ واجب ہے، جبکہ سائنس کی بنیاد اور نکتۂ آغاز ہی مفروضوں (hypothesis) پر ہے۔ اِسی لئے سائنس میں درجۂ اِمکان (degree of probability) بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مفروضہ، مشاہدہ اور تجربہ کے مختلف مراحل میں سے گزر کر کوئی چیز قانون (law) بنتی ہے اور تب جا کر اُس کا علم "حقیقت" کے زُمرے میں آتا ہے، سائنسی تحقیقات کی جملہ پیش رفت میں حقیقی صورتحال یہ ہے کہ جن حقائق کو ہم بارہا اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد سائنسی قوانین قرار دیتے ہیں اُن میں بھی اکثر ردّوبدل ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اِس بہت بڑے فرق کی بنیاد پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مذہب اور سائنس میں ٹکراؤ کا اِمکان ہی خارجِ اَز بحث ہے۔

۔2۔ دائرۂ کار میں فرق

مذہب اور سائنس میں کسی قسم کے تضاد کے نہ پائے جانے کا دُوسرا بڑا سبب دونوں کے دائرۂ کار کا مختلف ہونا ہے، جس کے باعث دونوں میں تصادُم اور ٹکراؤ کا کوئی اِمکان کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اِس کی مثال یوں ہے جیسے ایک ہی سڑک پر چلنے والی دو کاریں آمنے سامنے آ رہی ہوں تو وہ آپس میں ٹکرا سکتی ہیں، اِسی طرح عین ممکن ہے کہ سٹیشن ماسٹر کی غلطی سے دو ریل گاڑیاں آپس میں ٹکرا جائیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ کار اور ہوائی جہاز یا کار اور بحری جہاز آپس میں ٹکرا جائیں۔ اَیسا اِس لئے ممکن نہیں کہ دونوں کے سفر کے راستے الگ الگ ہیں۔ کار نے سڑک پر چلنا ہے، بحری جہاز نے سمندر میں اور ہوائی جہاز نے ہوا میں۔ جس طرح سڑک اور سمندر میں چلنے والی سواریاں کبھی آپس میں ٹکرا نہیں سکتیں اِسی طرح مذہب اور سائنس میں بھی کسی قسم کا ٹکراؤ ممکن نہیں، کیونکہ سائنس کا تعلق طبیعیاتی کائنات (physical world) سے ہے جبکہ مذہب کا تعلق مابعد الطبیعیات (meta physical world) سے ہے۔ اِس بات کو دُوسرے لفظوں میں یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ سائنس فطرت (nature) سے بحث کرتی ہے جبکہ مذہب کی بحث مافوق الفطرت (supernature) دُنیا سے ہے۔ لہٰذا اِن دونوں میں سکوپ کے اِختلاف کی بناء پر اِن میں کسی صورت بھی تضاد ممکن نہیں ہے۔

۔3۔ اِقدام و خطاء کا فرق

اِس ضمن میں تیسری دلیل بھی نہایت اہم ہے، اور وہ یہ کہ خالقِ کائنات نے اِس کائناتِ ہست وبُود میں کئی نظام بنائے ہیں، جو اپنے اپنے طور پر اپنی خصوصیات کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ مثلاً اِنسانی کائنات، حیوانی کائنات، جماداتی کائنات، نباتاتی کائنات، ماحولیاتی کائنات، فضائی کائنات اور آسمانی کائنات وغیرہ۔ اِن تمام نظاموں کے بارے میں ممکن الحصول حقائق جمع کرنا سائنس کا مطمحِ نظر ہے۔ دُوسری طرف مذہب یہ بتاتا ہے کہ یہ ساری اشیاء اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں۔ چنانچہ سائنس کی یہ ذِمہ داری ہے کہ اللہ ربّ العزت کے پیدا کردہ عوالم اور اُن کے اندر جاری وساری عوامل (functions) کا بنظرِ غائر مطالعہ کرے اور کائنات میں پوشیدہ مختلف سائنسی حقائق کو بنی نوع اِنسان کی فلاح کے لئے سامنے لائے۔

اللہ ربّ العزت کی تخلیق کردہ اِس کائنات میں غور وفکر کے دَوران ایک سائنسدان کو بارہا اِقدام وخطاء (error&trial) کی حالت سے گزرنا پڑتا ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کی تحقیق سے کسی چیز کو سائنسی اِصطلاح میں ''حقیقت'' کا نام دے دِیا جاتا ہے مگر مزید تحقیق سے پہلی تحقیق میں واقع خطا ظاہر ہونے پر اُسے ردّ کرتے ہوئے نئی تحقیق کو ایک وقت تک کیلئے حتمی قرار دے دیا جاتا ہے۔ سائنسی طریقِ کار میں اگرچہ ایک ''مفروضے'' کو مسلّمہ نظریئے تک کا درجہ دے دیا جاتا ہے، تاہم سائنسی طریقِ تحقیق میں کسی نظریئے کو بھی ہمیشہ کیلئے حقیقت کی حتمی شکل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ سائنس کی دُنیا میں کوئی نظریہ جامد (unchangeable) اور مطلق (absolute) نہیں ہوتا، ممکنہ تبدیلیوں کا اِمکان بہر حال موجود رہتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ نئے تجربات کی روشنی میں صدیوں سے مسلّمہ کسی نظریئے کو مکمل طور پر مسترد کر دیا جائے۔

مذہب اِقدام وخطاء سے مکمل طور پر آزاد ہے کیونکہ اُس کا تعلق اللہ ربّ العزت کے عطا کردہ علم سے ہوتا ہے، جو حتمی قطعی اور غیر متبدّل ہے اور اُس میں خطاء کا کلیتاً کوئی اِمکان نہیں ہوتا۔ جبکہ سائنسی علوم کی تمام تر تحقیقات اِقدام وخطا (error&trial) کے اُصول کے مطابق جاری ہیں۔ ایک وقت تک جو اشیاء حقائق کا درجہ رکھتی تھیں موجودہ سائنس اُنہیں کلی طور پر باطل قرار دے کر نئے حقائق منظرِ عام پر لا رہی ہے۔ یہ الگ بات کہ حقائق تک پہنچنے کی اِس کوشش میں بعض اَوقات سائنس غلطی کا شکار بھی ہو جاتی ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس کی بنیاد ہی سعی اور خطاء (error&trial) پر ہے جو مختلف مُشاہدات اور تجربات کے ذرِیعے حقائق تک رسائی کی کوشش کرتی ہے۔

مذہب مابعدُالطبیعیاتی(metaphysical) حقائق سے آگہی کے ساتھ ساتھ ہمیں اِس مادّی کائنات سے متعلق بھی بہت سی معلومات فراہم کرتا ہے، جن کی روشنی میں ہم سائنسی علوم کے تحت اِس کائنات کو اپنے لئے بہتر اِستعمال میں لاسکتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (الجاثیہ،45 : 13)۔

اور اُس (اللہ) نے سماوِی کائنات اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔

جہاں تک مذہب کا معاملہ تھا اُس نے تو ہمیں اِس حقیقت سے آگاہ کر دِیا کہ زمین و آسمان میں جتنی کائنات بکھری ہوئی ہے سب اِنسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہے۔ اَب یہ اِنسان کا کام ہے کہ وہ سائنسی علوم کی بدولت کائنات کی ہر شے کو اِنسانی فلاح کے نکتۂ نظر سے اپنے لئے بہتر سے بہتر اِستعمال میں لائے۔ اِسی طرح ایک طرف ہمیں مذہب یہ بتاتا ہے کہ جملہ مخلوقات کی خِلقت پانی سے عمل میں آئی ہے تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ذِمہ داری یہ رہنمائی کرنا ہے کہ بنی نوعِ اِنسان کو پانی سے کس قدر فوائد بہم پہنچائے جاسکتے ہیں اور اُس کا طریقِ کار کیا ہو۔ چنانچہ اِس ساری بحث سے ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سائنس اور مذہب کہیں بھی اور کسی درجے میں بھی ایک دُوسرے سے متصادِم نہیں ہیں۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو حصول علم پر زور دیتا ہے اور اس کا آغاز بھی حصول علم کے حکم سے ہوا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِيْ خَلَقَo(العلق،96 : 1)۔

"(اے حبیب!) اپنے رب کے نام سے (آغاز کرتے ہوئے) پڑھئے جس نے (ہر چیز کو) پیدا فرمایاo"۔

جبکہ سائنس وہ شعبہ علم ہے جو تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے اب اسلام ہی وہ دین ہے جس نے انسانیت کو تجربے اور مشاہدہ سے متعارف کرایا۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِo۔

''بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب و روز کی گردش میں عقلِ سلیم والوں کے لئے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیںo'' آل عمران، 3: 190۔

قرآن حکیم نے سائنسی شعور عطا کرتے ہوئے کائنات کی تسخیر کرنے کی تعلیم دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ، 45 : 13)۔

''اور اُس نے تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کو اپنی طرف سے (نظام کے تحت) مسخر کر دیا ہے۔''

اسلام ہمیں اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ ہم فطرت کے اسرار کو سمجھیں اور اس کی تسخیر کریں۔ ایسے ہی بقیہ مذاہب کی طرح سائنس اور اسلام کے مابین کوئی تضاد یا تعارض نہیں ہے بلکہ اسلام ہی کا عطا کردہ ایک رویہ ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت دنیا میں ہونے والی سائنسی ترقی کی بنیاد مسلمانوں ہی کی مرہون منت ہے۔

اسلام کا نقطۂ نظر

انسانی زندگی کے کچھ خواص ہیں اور ان خواص کے اعتبار سے کچھ لوازم بھی۔ انسانی زندگی کا مادّی وجود جہاں اس سے بہت سی چیزوں کا تقاضا کرتا ہے، اسی طرح اس کا ایک روحانی وجود بھی ہے، جو اس سے ''مذہب'' مانگتا ہے۔ انسان مادّی اعتبار سے خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے، اس کا روحانی وجود اسے سکونِ قلب کی طلب پیدا کر کے اسے اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ بلکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ مادّیت کی دوڑ میں انسان جس قدر آگے بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی اس کی روحانی تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے، یہ پیاس ہی مذہب کے وجود کی سب سے بڑی، سب سے وقیع، سب سے وزنی اور عالمگیر دلیل ہے۔

سائنس دورِ جدید کے انسان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔ یہ بات بھی درست ہو گی کہ سائنس سے سائنسی ایجادات مراد لی جائیں، لیکن سائنس بذاتِ خود ایک طرزِ فکر کا نام ہے، جو گذشتہ زمانے میں بدقسمتی سے، چند خارجی و داخلی وجود کے سبب اور ابتدائی سطح پر ملنے والی کامیابیوں سے

حاصل ہونے والی سرخوشی کے زعم میں مذہب اور خدا کے وجود سے ٹکرا گئی تھی۔ لیکن اب ہر سطح پر اس کا احساس پیدا ہو چلا ہے کہ سائنس کا میدان اور ہے اور مذہب کے فرائض اور۔ سائنس کا مذہبی اُمور میں کوئی دخل نہیں ہے، البتہ مذہب کا سائنسی معاملات میں دخل ضرور ہے جو کہ برس ہا برس کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن یہ دخل تعمیری اور مثبت نوعیت کا ہے، منفی اور تخریبی نہیں۔ لہٰذا دونوں میں ٹکراؤ اور تضاد کی کیفیت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا جب دونوں کے مفادات مشترک ہوتے اور جب دونوں کا میدانِ عمل ایک ہوتا۔ منطق کی زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں کے مابین "عموم و خصوص مطلق" کی نسبت ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی حوالے سے اسلام کی تعلیمات کے تناظر میں گفتگو کی گئی ہے اور مقصد اس غلط فہمی کا ازالہ ہے کہ کیا مذہب سائنس کا مخالف ہے؟ یا اہل مذہب اور اہل سائنس میں حقیقتاً کسی ٹکراؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے؟

سائنس اور مذہب کے باہمی تعلق کی اہمیت / پس منظر

سائنس اور مذہب کے باہمی تعلق کو سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ اس سوال کے دونوں ہی جز انسانی زندگی اور خصوصاً عصر حاضر میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں، ایسی اہمیت جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں کہ دونوں ہی چیزیں، مذہب اور سائنس آج کے ہر انسان کے لئے ناگزیر ہیں اور اگر کوئی اس حقیقت سے واقف نہیں یا کسی سبب سے اس بدیہی حقیقت کو قبول کرنے سے صرفِ نظر کرتا ہے تو وہ خود اپنی زندگی کو نامکمل بنانے اور ناقص رکھنے کی سعیِ نامشکور کرتا ہے، خواہ اسے خود اس کا علم تک نہ ہو۔

سائنس اور مذہب کا یہ ٹکراؤ اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کی پیداوار ہے اور یہی وہ دور ہے جب جدید سائنس کا ظہور ہوا اور دنیا نے اسے کسی علم بلکہ مکتبِ فکر کے طور پر پہچانا۔ سائنسی دریافتوں میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لئے بڑی کشش تھی، پھر اس کا دارومدار مکمل طور پر مشاہدے اور تجربے پر تھا۔ یہ چیزیں انسانی شعور اور عقل کو براہِ راست متاثر کرتی ہیں اور انسان ظاہر میں نظر آنے والی چیزوں کا اثر زیادہ تیزی سے اور شدت کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

پھر ایک اور بات بھی ہے، عربی محاورے "کل جدید لذیذ "کے مطابق ہر نئی چیز لذیذ ہوتی ہے۔ سائنس مذہب کے مقابلے میں ایک نئی چیز تھی، ان اسباب وعوامل کی بنا پر لوگوں کا اس کے اثرات تیزی سے قبول کرنا ایک فطری عمل تھا، مگر خرابی یہاں سے شروع ہوئی کہ سائنسی دریافتوں سے جو ماحول بنا، اس میں لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب خدا کی کوئی ضرورت نہیں رہی اور مذہب ایک فرسودہ روایت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ ان کے نزدیک خدا کو ماننا اس لئے ضروری تھا کہ اس کو مانے بغیر کائنات کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی، اب جدید سائنس نے یہ عقدہ حل کر دیا ہے۔ اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کائنات اور اس میں واقع ہونے والا ہر امر ایک سبب کی وجہ سے ہے اور وہ سبب معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ یہ سب کچھ قانون فطری ہے، Law of Nature کے لگے بندھے اُصولوں کے تحت وقوع پذیر ہو رہا ہے۔

دوسری جانب یوں ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں جو وحی الٰہی پر مبنی تھیں، وقت کے ساتھ ساتھ تغیر اور تحریف نے جگہ پکڑ لی اور یونانی فلسفے نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا اور رفتہ رفتہ فلسفیانہ مباحث مذہب کا جز بن کر تقدس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ فلسفہ بہت سے زمینی حقائق اور معروضی حالات کے خلاف تھا اور اس میں خیالی اور تصوراتی مفروضوں کی بہتات تھی۔ جب سائنس کی مشاہدے اور تجربات پر مشتمل دریافتیں اور انکشافات سامنے آنا شروع ہوئے تو مذہب کا حصہ بن جانے والے ان مفروضوں میں دراڑیں پڑنے لگیں، جس سے اہل مذہب (کلیسا) نے اپنے وجود کو خطرہ سمجھا اور یوں اہل سائنس اور اہل مذہب (عیسائیت) کے مابین ایک کشمکش کا آغاز ہو گیا، جس کے نتیجے میں پوپ کے خاص حکم کے تحت احتساب عدالت قائم ہوئی، جس میں تقریباً تین لاکھ افراد کو حاضری دینا پڑی۔ ان کو سخت سزائیں دی گئیں، اور تقریباً ۳۰ ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان سزا یافتگان میں گلیلیو اور برونو جیسے افراد بھی شامل تھے، یہ مذہب اور سائنس کی علیحدگی اور ان کے مابین چپقلش کا نقطہ عروج تھا اور یہیں سے وہ جنگ شروع ہوئی جو بالآخر علم اور مذہب کی جنگ بن گئی (مولانا وحید الدین خان، اسلام اور عصر حاضر، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۳)۔

جن باتوں نے مذہب (عیسائیت) اور سائنس کے مابین ان سنگین اختلافات کو جنم دیا، ان میں سے بات کو سمجھنے کے لئے صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ ارسطو نے مرکزیتِ زمین کا نقطہ نظر پیش کیا تھا۔ یہ خالصتاً یونانی فکر تھی جس کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں تھا، مگر چونکہ یہ نظریہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مسیحی مذہب کا حصہ بن چکا تھا، اس لئے جب کوپرنیکس (۱۴۷۳ء تا ۱۵۴۳ء) نے مرکزیتِ آفتاب کا تصور

پیش کیا تو عیسائی پیشواؤں کے ہاں کھلبلی سی مچ گئی اور انہوں نے کوپرنیکس کی زبان بندی کر دی۔ کیونکہ یورپ میں اس وقت مسیحی پیشواؤں کو اقتدار حاصل تھا، جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ (نفس مصدر، ص ۱۱۲، سائنس اور مذہب میں مفاہمت، حفیظ الرحمن صدیقی، مشمولہ سہ اشاعتی آیات، مدیر ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی، مرکز الدراسات العلمیہ، علی گڑھ، ج سوم، ش اوّل، جنوری تا اپریل ۱۹۹۲ء ص ۳۷)۔

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ کوپرنیکس کے نظریے کے بعد گلیلیو (۱۶۲۴ء تا ۱۵۶۲ء) نے بھی اس کی تائید کر دی اور یوں ان کے ہاں ایک تقدس پا جانے والا نظریہ غلط ٹھہرا۔ اس کی یہ تغلیط خالصتاً ایک علمی بحث تھی جیسا کہ آگے چل کر بیان ہو گا کہ مسلم دنیا نے اسے ایک علمی بحث کے طور پر ہی لیا۔ مگر ایک غلط نظریے کی تغلیط بدقسمتی سے عیسائیت کی تغلیط سمجھ لی گئی، جس کے نتیجے میں بعد میں افسوسناک واقعات رونما ہوئے)۔

اس "جنگ" اور محاذ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ مشاہداتی علم (سائنس) اور مذہب دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک کی ترقی دوسرے کے لئے موت کا درجہ رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ خیال واضح طور پر سراسر غلط تھا اور اسلام کے نقطہ نظر کے صریح خلاف بھی، وہ تو یہ کہتا ہے:۔

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِن عِبَادِهِ الْعُلَمَاؤُا...۲۸﴾

"بلاشبہ اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں" (القرآن، سورۂ فاطر، آیت ۲۸)۔

مگر ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم (سائنس) لوگوں کو خدا اور مذہب سے دور کرنے والا بن گیا۔ سائنس اور مذہب کا یورپ میں ہونے والا یہ تصادم کوئی دو صدی تک جاری رہا، حتیٰ کہ ۱۸۵۹ء میں ڈارون نے اپنی کتاب Origin of species شائع کی۔ چرچ کی جانب سے اس کی بھرپور مخالفت کی گئی، مگر اب چرچ کی طاقت کمزور پڑ چکی تھی۔ اس لئے رفتہ رفتہ صلح کے امکانات پیدا ہونے لگے اور بالآخر دونوں کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا، جو دراصل سیکولرازم (Secularism) کی صورت میں تھا۔ اب مذہب اور سائنس کے درمیان حدود کار متعین کر دی گئیں اور دونوں کے دائرے الگ الگ ہو گئے (اسلام اور عصر حاضر، ص ۱۱۴)۔

یوں کلیسا اور اہل سائنس کے مابین جاری جنگ کا تو خاتمہ ہو گیا، مگر در حقیقت مذہب اور سائنس دونوں نے وہ راستہ اختیار کیا جو فطرت کے سراسر خلاف تھا، اس لئے رفتہ رفتہ حالات سدھرنے کی بجائے مائل بانحطاط ہوتے چلے گئے اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ مذہب اور خدا ہر اعتبار سے (بزعم خود و بزعم غلط) ان کی زندگیوں سے نکل گیا۔ لیکن یہ ایک غیر فطری رویہ تھا، نتیجۃً خدا پھر بھی موجود رہا اور مذہب کی ضرورت پھر بھی باقی رہی۔ آخر کمرے میں اپنے آپ کو بند کر کے اور روشنی کی گزر گاہوں کو ختم کر کے، دن کے وقت میں انسان اپنے آپ کو رات ہو جانے کا تو غلط اطمینان دلا سکتا ہے، مگر سورج کی موجودگی کو تو ختم نہیں کر سکتا۔ یہ تھا سائنس اور مذہب کے اختلافات کا اصل پس منظر اور جب ہم سائنس، مذہب تعلقات کی بات کرتے ہیں تو اس پسِ منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

انکارِ مذہب کا سبب

اب تک کی بحث سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کے وجود کا انکار قطعاً سائنس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ مذہب اور مذہبی تعلیمات سے روگردانی اور ان سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ لیکن آج کے دور میں انکارِ مذہب کا ایک اہم سبب اور بھی ہے اور اسے بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ سبب مغرب کے ہاں پھیلتا اور بڑھتا ہوا تصورِ آزادی ہے۔ جس کو ہم "مادر پدر آزادی" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ آزادی رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے اب اس مقام انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ اب ان کو ہر اس معقول چیز سے بھی خوف آنے لگا ہے، جو ان کی اس خود ساختہ آزادی کو ذرا بھی قدغن لگاتی ہو۔ خدا اور مذہب کے انکار کے پیچھے بھی یہی تصور کار فرما ہے، یہی وہ بنیادی خوف ہے، جو انہیں انکارِ مذہب کے لایعنی فعل پر اکسا رہا ہے۔ ایک امریکی ماہر طبیعات جارج ہاربرٹ (George Herbert Blovnt) ان چند لوگوں میں سے ہیں، جنہیں اس امر کا اعتراف ہے، وہ کہتے ہیں: ۔

"مذہب (خدا پرستی) کو ماننے کی معقولیت، اور خدا سے انکار کی غیر معقولیت بذاتِ خود ایک آدمی کے لئے عملاً خدا پرستی اختیار کرنے کا سبب نہیں بن سکتی۔ لوگوں کے دلوں میں یہ خوف چھپا ہوا ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا، وہ اہل علم جو ذہنی آزادی کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں، ان کے لئے اس آزادی میں کمی یا محدودیت کا کوئی بھی تصور بڑا تشویشناک ہے۔" (Georee Herbert Blount, The Evidence of God, p.130)۔

کیونکہ اللہ کا پیغام کسی نہ کسی نبی ہی کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے، اور اس نبی کا پیغام تسلیم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی بات کو خدا کی بات تسلیم کیا جائے، اس لئے جب وہ کوئی بات کہے تو تمام لوگوں کیلئے اس کو تسلیم کرنا ضروری ہو گا اور یہ بات ان لوگوں کیلئے قابل قبول نہیں ہو سکتی، جو عقل کو بلکہ صرف اپنی ہی عقل کو سب کچھ تصور کر کے اس کی پیروی کو ضروری سمجھتے ہیں۔

سائنس اور مذہب؛ اختلافِ عمل

جب تک اس امر کی وضاحت نہ ہو جائے کہ سائنس اور مذہب کے درمیان کس نوع کا اختلاف ہے؟ اس وقت تک ہمارا یہ دعویٰ صحیح صورت میں سامنے نہیں آسکتا کہ سائنس اور مذہب کے مابین دراصل میدانوں کا فرق ہے۔ دونوں کے میدان الگ الگ ہیں، اس لئے ان دونوں کی خدمات کو گڈمڈ نہیں کیا جاسکتا اور جو خرابی بھی پیدا ہوئی ہے، اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ہم نے دونوں کے دائرہ کار کو باہم گڈمڈ کر دیا ہے۔ اگر یہ بات واضح ہو جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ سائنس کو مانتے ہوئے، اس پر عمل کرتے ہوئے اور اس سے متمتع ہوتے ہوئے بھی مذہب کو خصوصاً مذہبِ اسلام کو تسلیم کیا جاسکتا ہے، اور اس کے مطالبات پورے کئے جاسکتے ہیں، دونوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہ اختلاف اس وقت پیدا ہوا، جب اہل سائنس نے یہ جان لیا کہ دنیا کا نظام قانونِ فطرت پر چل رہا ہے اور کائنات میں پیش آنے والے واقعات ایک متعین قانونِ فطرت کے مطابق رونما ہو رہے ہیں، اس لئے ان کی توجیہ کرنے کے لئے کسی نامعلوم اور غیر موجود خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ضرورت اس وقت تھی، جب تک ان واقعات کی توجیہ ہمارے سامنے نہیں آئی تھی۔ حالانکہ ذرا سا غور و فکر کرنے والے پر بھی اس استدلال کی غیر معروضیت اور سطحیت واضح ہو سکتی ہے۔ سوال تو یہ تھا کہ اس کائنات کے نظام کو برقرار اور مثبت طریقوں پر قائم رکھنے والی ایک اتھارٹی ناگزیر ہے اور اس ذات کی ناگزیریت اب بھی علی حالہٖ قائم ہے، کیونکہ اب تک کی تگ و دو سے سائنس نے جو کچھ معلوم کیا ہے، وہ قانونِ فطرت کی صورت میں صرف اس سوال کا جواب ہے کہ یہ کائنات کیا ہے؟ مگر مذہب جس سوال کا جواب دے رہا ہے، وہ یہ ہے کہ جو کچھ اس طرح طے شدہ پروگرام اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ اپنے اپنے مقررہ وقت اور مدت پر پیش آرہا ہے، وہ کیوں ہو رہا ہے؟

مذہب ان واقعات کے اصل اسباب و محرکات پر گفتگو کرتا ہے، لہٰذا سائنس کی دریافتوں کے باوجود مذہب کی ضرورت موجود و برقرار ہے، بلکہ اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے، جب سائنسی توجیہات پر غور و فکر کرنے والا شخص ڈور کا اصل سرا نہیں پاتا اور یوں اسے اپنی زندگی میں خلا محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایک امریکی ماہر حیاتیات سی سیل بوائس ہمن (Cecilboyce Hamann) اس بارے میں کہتا ہے:

"غذا ہضم ہونے اور اس کے جزوِ بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، اب جدید مشاہدے میں وہ کیمیائی ردّ عمل کا نتیجہ نظر آتا ہے، مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہو گئی؟ آخر وہ کون سی طاقت ہے، جس نے کیمیائی اجزا کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردّ عمل ظاہر کریں، غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب و غریب خود کار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آ گیا، حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدے کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعے عمل کرتا ہے، جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔" (Cecil Boyce Hamann,The Evidence of God in an Expanding Universe. p.221)۔

درحقیقت سائنسی تگ و دو نے ہمیں واقعے کی صحیح تصویر تو دکھا دی ہے، مگر یہ واقعہ درست طور پر کیونکر پیش آتا ہے؟ اس تک سائنس رسائی حاصل نہیں کر سکتی، قوانین فطرت کیسے وجود پذیر ہوئے؟ ان کو درست نہج پر کس نے استوار کیا؟ اور پوری کائنات کا یہ ڈھانچہ، جس سے یہ کائنات متمتع ہو رہی ہے، کس طرح اس قدر صحت و توازن کے ساتھ قائم ہے کہ اس کو دیکھ کر سائنسی قوانین اَخذ و ترتیب دیئے جا رہے ہیں؟ ان سوالات کا جواب سائنس نہیں دے سکتی اور اس لئے نہیں دے سکتی کہ یہ اس کے دائرہ اختیار میں ہی نہیں آتے، اس کے لئے مذہب کی جانب رجوع کرنا ہو گا اور یہی وہ ذریعہ ہے جو انسان کی تشنگی بجھا سکتا ہے۔

سائنس اور مذہب؛ مفاہمت کا طریقہ کار

سائنس اور مذہب کے مابین مفاہمت کا درست اور قابلِ عمل طریقہ کار یہی ہے کہ اس ضمن میں پھیلی ہوئی غلط آرا، غلط خیالات و تصورات اور فضا کو پراگندہ کرنے والی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، خصوصاً اسلام کے حوالے سے یہ بات واضح کر دی جائے کہ سائنسی ایجادات اور اسلامی تعلیمات میں کوئی

تباین نہیں، کوئی تضاد نہیں ہے۔ اور اگر کسی مقام پر ایسا نظر بھی آتا ہے، تو وہ عارضی ہے، اور اسلامی تعلیمات کی کنہ اور حقیقت تک رسائی حاصل نہ ہوسکنے کا نتیجہ ہے یا سائنسی تجربے اور مشاہدے کا نقص ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ "سائنس علت و معلول کی ہر کڑی میں غایت (Purpose) کو ضرور شامل کرے، اگر اس نے سلسلہ واقعات کی ہر کڑی میں غایت کو تسلیم کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نے خدا کے وجود کو تسلیم کر لیا، اس کے ضابطہ اخلاق کو تسلیم کر لیا۔ یومِ حساب کو تسلیم کر لیا، اور سائنس کی سرکشی نے خدا کے وجود کے آگے ہتھیار ڈال دیئے (حفیظ الرحمن صدیقی، سائنس اور مذہب میں مفاہمت، مشمولہ سہ اشاعتی آیات، مدیر ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی، مرکز الدراسات العلمیہ، علی گڑھ، ج سوم، ش اوّل، جنوری، اپریل ۱۹۹۲ئ، ص ۴۱)۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ شرط کوئی نئی نہیں، نہ پہلی بار پیش کی گئی ہے، نہ سائنس اس سے ناآشنا ہے، بلکہ اس شرط کے ذریعے سائنس کو اس کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد کرایا جا رہا ہے اور اسے اس بات کی دعوت دی جا رہی ہے جس پر وہ اس سے پہلے خود قائم تھی۔ برٹرینڈ رسل کہتا ہے

"سائنس کے دائرۂ کار میں یہ بات پہلے بھی شامل رہی ہے، لامذہبیت اختیار کرنے سے پہلے تک سائنس واقعات کے ہر سلسلے کو مذہب کی طرح علت، معلول اور غایت پر منحصر سمجھا کرتی تھی۔" (Bertrand Rusel, The Impact of Science on Society, London, 1952, P.18-19)۔

پھر اہم بات یہ ہے کہ غایت کو اگر سائنس میں شامل کر لیا جائے تو مطالعہ سائنس میں زیادہ معنویت پیدا ہو سکتی ہے، ایک فاضل محقق کے بقول:

"غایت کو سائنس میں شامل کر لینے سے ہر مضمون میں علت اور معلول کی حکمتوں تک انسان کی رسائی ہو سکے گی، اس کے بعد سائنس کا مطالعہ زیادہ بامعنی ہو جائے گا۔ اس کام میں مسلمان سائنس دانوں پر بہت اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم اس اُصولِ مفاہمت کے مذہبی سطح پر پہلے ہی سے قائل ہیں، اس لئے ہمیں چاہئے کہ اس اُصول کو سائنس کی آئیڈیالوجی بنائیں اور اس آئیڈیالوجی سے عالمی سائنس کو روشناس کرائیں۔" (سائنس اور مذہب میں مفاہمت، حفیظ الرحمن صدیقی، مشمولہ سہ اشاعتی آیات، مدیر ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی، مرکز الدراسات العلمیہ، علی گڑھ، ج سوم، ش اوّل، جنوری تا اپریل ۱۹۹۲ء ص ۳۷)۔

سائنس کی ایک اہم ضرورت : یہ گفتگو اس اعتبار سے تھی کہ سائنس مذہب کا انکار کر کے جن خطرات سے دوچار ہو رہی ہے، ان سے بچنے کا محفوظ طریقہ مذہب کے زیر سایہ آجانے کے سوا کچھ نہیں ہے، یہی فطرت کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن ایک اور پہلو سے بھی سائنس کو مذہب کی چھتری درکار ہے، سائنس نے انکشافات و اکتشافات کے میدان میں تو یقیناً بے حد ترقی کر لی ہے، مگر وہ اخلاقیات اور نفسیات کے میدان میں بہت پیچھے ہے، ان میدانوں میں اس کے انحطاط پر یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ سائنس جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، اخلاقیات کے میدان میں اس کا تنزل اور انحطاط اسی رفتار سے زیادہ ہو رہا ہے ('مغرب کا سائنسی و نفسیاتی زاویۂ فکر، تدریج وارتقا، سہ ماہی منہاج، مدیر حافظ سعد اللہ، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، ستمبر ۲۰۰۲ء)۔

ان حالات میں خصوصاً کسی ایسی رکاوٹ کی ضرورت ہے، جو سائنس کو ان تنزلیوں کا شکار ہونے سے روک سکے اور اسے ایک ایسا مربی درکار ہے، جو اسے بتا سکے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کن اُمور سے اپنے آپ کو باز رکھنا ہے؟ مختصر لفظوں میں یہ کہ اس کی حدودِ کار کیا ہیں؟ جدید سائنسی تحقیقات و ایجادات کے بعد اس کی ضرورت یوں بھی بڑھ گئی ہے کہ ان کے نتیجے میں ایسے عوامل سامنے آرہے ہیں، جن کی موجودگی پوری انسانیت کے لئے خطرہ بن رہی ہے۔ ان کی مثال میں دو چیزوں: مہلک ایٹمی و جراثیمی ہتھیار اور سائنسی ایجادات سے متاثر ہونے والے عالمی ماحول کو پیش کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے پوری دنیا میں موجود امن پسند اور دردِ دل رکھنے والے اصحابِ علم اور اصحابِ فکر و نظر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

اس خطرے کو بھی مذہب اور بالخصوص اسلام ہی ٹال سکتا ہے جو اس سمت میں بھی واضح اور دوٹوک رہنمائی کرتا ہے۔ اس کا سادہ اور واضح اُصول یہ ہے کہ جو چیزیں انسانیت کے لئے مفید ہیں، وہ اختیار کرنا ضروری ہیں اور جن سے انسانوں بلکہ کائنات کو کسی بھی قسم کے ضرر پہنچنے کا خدشہ ہو تو اس سے احتراز ضروری ہے اور اگر اس سے فوائد بھی وابستہ ہوں تو ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے اس کی مضرت ختم ہو جائے۔

خلاصہ!

یہ صورتِ حال عرصے سے اہل علم کو مضطرب کئے ہوئے ہے اور اس کا احساس غیر مسلم مفکرین کو بھی ہے، اور غور و فکر کے بعد وہ بھی اِسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس مشکل سے نکلنے کا واحد حل مذہب ہے۔

ریان ایپل یارڈ (Reyenaple Yard) اپنی کتاب عصر حاضر کی تفہیم (Understanding the Present) میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے: "سائنس کی کوئی اخلاقیات یا ایمان نہیں ہے، اور وہ ہمیں ہماری حیات کے معنی، مقصد اور اہمیت کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی، لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ سائنس کی فیضاتی کارکردگی ثابت کرتی ہے کہ وہ سب چیزیں مہیا کر سکتی ہے۔ لوگوں میں اس غلط خیال کو مستحکم کرنے میں سائنسی لٹریچر پیدا کرنے والوں کا بڑا ہاتھ ہے، جو عموماً ناقص بلند آہنگ اور اکثر غلط ملط مقبولِ عام لٹریچر لکھتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کو واپس کھینچ کر ثقافت و تہذیب کے دائرے میں لایا جائے، تاکہ اس کے بدترین استعمالات اور بھیانک دعوؤں کو لگام دی جاسکے۔"(سائنس اور آج کی دنیا، ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، دسمبر ۱۹۹۴ء)۔

ایک اور دانشور جو خود بھی فزکس کے پروفیسر ہیں، فرٹ جوف کیپر نے سائنس کے فروغ اور سائنسی رجحانات میں اضافے سے پیدا ہونے والی صورتحال پر تبصرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: "ہماری صدی، یعنی بیسویں صدی کے گذشتہ دو دہے کے آغاز میں ہم اپنے آپ کو گہرے عالمگیر بحران کی حالت میں پاتے ہیں، یہ مختلف الجہات بحرانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے اثرات ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں یعنی صحت اور سامان زندگی، ماحول کی کیفیت، سماجی تعلقات، معیشت، صنعت اور سیاست کو چھوتے ہیں۔ یہ بحران، ذہنی، اخلاقی اور روحانی سمت کا ہے۔ یہ بحران ہے میزان اور ضرورت کا، جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، پہلی مرتبہ ہمیں نسل انسانی اور اس کے کرۂ ارض کے تمام جانداروں کو ہلاکت کی حقیقی دھمکی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔"(فرٹ جوف کیپر کی کتاب ٹرننگ پوائنٹ(The Turning Poing, p.21)۔

آگے چل کر کیپر، نیوٹن کے نظریۂ حرکت کے طبیعاتی دنیا میں انقلابی اثرات پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"مطلق عالمگیر مشین کی اس تصویر میں ایک خارجی خالق مضمر ہے، یعنی ایک شہنشاہ خدا، جس نے دنیا میں اپنے آسمانی قوانین کے نفاذ کے ذریعے حکومت کی ہے، طبیعاتی مظاہر کو کسی بھی معنی میں بجائے خود آسمانی نہیں سمجھا گیا، اور سائنس نے ایسے کسی خدا پر یقین کو زیادہ سے زیادہ مشکل بنا دیا اور

تقدس سائنس کے عالمی نظریے سے مکمل طور پر غائب ہو گیا، جس کے نتیجے میں روحانی خلا پیدا ہوا، جو ہمارے تہذیبی دھارے کی خصوصیت بن گیا ہے۔"(فرٹ جوف کیپر کی کتاب ٹرننگ پوائنٹ(The Turning Poing, p.21) ۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دو وجوہ کی بنا پر، جن میں پہلی وجہ سائنس کے فروغ سے روحانی دنیا میں پیدا ہونے والا خلا ہے، اور دوسری وجہ اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی بحران ہے، سائنس کے لئے مذہب کو قبول کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

پھر اہم بات یہ ہے کہ اسلام سائنس کو نہ صرف قبول کرتا ہے، بلکہ وہ خود تجربے اور مشاہدے نیز غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، البتہ اس کا مدعا اس سے یہ ہوتا ہے کہ انسان اس تدبر اور غور و فکر کے ذریعے اس کائنات کے ربّ تک پہنچ سکے، اور پھر بعد کے اقدام کے طور پر وہ اس کے احکامات کی بھی بجا آوری کر سکے، یہی انسانیت کی معراج ہے اور یہی اسلام کا مطالبہ ہے!۔

قرآن اور سائنس

قرآنِ حکیم کتابِ حکمت اور صحیفہ ہدایت ہے۔ اس کے پیش نظر انسانیت کی رہنمائی ہے، تاکہ شاہراہِ زیست پر سفر کرتے ہوئے اسے کسی قسم کی دقت اور پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآنِ حکیم کا یہ بھی اعجاز ہے کہ اس میں دیگر علوم و فنون کی جانب بھی رہنمائی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے شواہد موجود ہیں، ابو بکر ابن العربیؒ کے بقول "قرآنِ حکیم ستتر ہزار چار سو پچاس علوم پر مشتمل ہے۔ یہ عدد قرآنی کلمات کو چار سے ضرب دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے ہر کلمے کی چار حالتیں ہیں: ایک اس کا ظاہر و باطن ہے، اور ایک حد و مطلع۔ یہ اس صورت میں ہے جب قرآن کے کلمات کو انفرادی اعتبار سے ترکیب کے بغیر دیکھا جائے، اگر کتاب کی تراکیب وغیرہ پر غور و فکر کیا جائے تو اس کی (حالتوں اور اسی اعتبار سے اس کے علوم و فنون کی) تعداد شمار و حساب سے باہر ہو جاتی ہے۔"(جلال الدین سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۳۲۹ھ، ج ۲، ص ۱۳۸)۔

ابن العربیؒ (مصنف عارضۃ الاحوذی) کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں: "کتابِ خداوندی ہر چیز کی جامع ہے، کوئی علم اور مسئلہ ایسا نہیں جس کی اصل واساس قرآنِ کریم میں موجود نہ ہو، قرآن میں عجائب المخلوقات، آسمان وزمین کی سلطنت اور عالم علوی وسفلی سے متعلق ہر شے کی تفصیلات موجود ہیں، جن کی شرح وتفصیل کے لئے کئی جلدیں درکار ہیں" (جلال الدین سیوطی، ج ۲، ص ۱۳۰)۔

اسی اعتبار سے قرآنِ حکیم میں سائنسی علوم کی جانب بھی راہنمائی ملتی ہے، اگرچہ یہ چیز قرآن نقطہ نظر سے مطلوبِ اوّل نہیں ہے۔ ذیل میں ایسی چند آیات پیش کی جاتی ہیں: ۔

قرآنِ حکیم انسان کے جنین کے ارتقائی مراحل ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

﴿وَلَقَد خَلَقنَا الإِنسـٰنَ مِن سُلـٰلَةٍ مِن طينٍ ١٢ ثُمَّ جَعَلنـٰهُ نُطفَةً فى قَرارٍ مَكينٍ ١٣ ثُمَّ خَلَقنَا النُّطفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقنَا العَلَقَةَ مُضغَةً فَخَلَقنَا المُضغَةَ عِظـٰمًا فَكَسَونَا العِظـٰمَ لَحمًا ثُمَّ أَنشَأنـٰهُ خَلقًا ءاخَرَ ۚ فَتَبارَكَ اللَّهُ أَحسَنُ الخـٰلِقينَ ١٤﴾" اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے (جوہر) سے بنایا، پھر ہم ہی نے اس کو حفاظت کی جگہ (رحم مادر) میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم نے اس نطفے کو خون کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم ہی نے اس لوتھڑے سے گوشت کی بوٹی بنائی، پھر ہم ہی نے اس بوٹی سے ہڈیاں بنائیں، پھر ہم ہی نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم ہی نے اس کو ایک نئی صورت میں (انسان بنا کر) اُٹھا کھڑا کیا تو اللہ بڑا ہی برکت والا، سب سے بہتر بنانے والا ہے۔" (القرآن، سورہ المؤمنون، آیت ۱۴، ۱۳، ۱۲)۔

قرآن حکیم میں پہاڑوں کو 'میخیں' کہا گیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

﴿أَلَم نَجعَلِ الأَرضَ مِهـٰدًا ٦ وَالجِبالَ أَوتادًا ٧﴾ ... سورۃ النباء "کیا ہم نے تمہارے لئے زمین کو فرش، اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟ (القرآن، سورۃ النباء، آیت ۷-۶)۔

سمندر یا دریا کے دو مختلف الاقسام پانیوں کے بارے میں قرآنِ حکیم میں فرمایا:۔

﴿وَهُوَ الَّذى مَرَجَ البَحرَينِ هـٰذا عَذبٌ فُراتٌ وَهـٰذا مِلحٌ أُجاجٌ وَجَعَلَ بَينَهُما بَرزَخًا وَحِجرًا مَحجورًا ٥٣﴾ (سورۃ الفرقان: 53)۔

"اور (اللہ) وہی ہے، جس نے دو دریاؤں کو چلایا، ایک میٹھا پیاس بجھانے والا، اور ایک کھارا کڑوا، اور دونوں کے درمیان ایک رکاوٹ اور آڑ بنادی۔"

بادلوں اور اولوں کے بارے میں قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:۔

﴿أَلَم تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُزجى سَحابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَينَهُ ثُمَّ يَجعَلُهُ رُكامًا فَتَرَى الوَدقَ يَخرُجُ مِن خِلٰلِهِ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّماءِ مِن جِبالٍ فيها مِن بَرَدٍ فَيُصيبُ بِهِ مَن يَشاءُ وَيَصرِفُهُ عَن مَن يَشاءُ ۖ يَكادُ سَنا بَرقِهِ يَذهَبُ بِالأَبصٰرِ ٤٣﴾(سورۃ النور:43)۔

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو چلاتا ہے، پھر وہ ان کو ملا دیتا ہے، پھر وہ ان کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ ان کے درمیان سے مینہ برستا ہے، وہی اللہ آسمان میں پہاڑ جیسے بادلوں میں سے اَولے برساتا ہے، پھر جس پر چاہتا ہے ان (اَولوں) کو گرا دیتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ اس کی بجلی کی چمک ایسی ہے کہ گویا آنکھوں کی بینائی لے جائے"۔

انسانی جلد کی حسی کیفیات اور حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قرآن حکیم فرماتا ہے:۔

﴿إِنَّ الَّذينَ كَفَروا بِـٔايٰتِنا سَوفَ نُصليهِم نارًا كُلَّما نَضِجَت جُلودُهُم بَدَّلنٰهُم جُلودًا غَيرَها لِيَذوقُوا العَذابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كانَ عَزيزًا حَكيمًا ٥٦﴾(سورۃ النساء:56)" بلاشبہ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا، ہم بہت جلد ان کو آگ میں ڈالیں گے، جب ان کی کھالیں جل جائیں گی، تو ہم ان کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ خوب عذاب چکھیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے"۔

قرآن حکیم کی ان کئی سو آیات میں سے، جن میں سائنسی حقائق کی جانب اشارہ موجود ہے، یہاں صرف چند آیات نقل کی گئیں، تاکہ یہ امر واضح ہو سکے کہ اسلام اور سائنس باہم متعارض حقیقتوں کے نام نہیں، بلکہ جدید سائنس خود اسلام اور اسلامی تعلیمات کا اثبات کر رہی ہے، اور ایسے کتنے ہی مسائل ہیں، جن کے بارے میں جب اسلام نے حکم دیا تھا تو لوگوں کے سامنے اس کی علت اور سبب نہیں تھا، مگر لوگ امر تعبدی قرار دے کر اسے بجا لاتے تھے، لیکن آج ان کے حقائق سامنے آچکے ہیں، اور یہ امر واضح ہو گیا ہے، ان احکامات میں بھی ہماری ہی فلاح اور بہبود مضمر تھی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ سائنس کے جدید انکشافات و اکتشافات نے اسلام کے بیان کردہ اُصولوں کا اثبات اور ان کی تائید کی ہے، اس لئے اسلام کو سائنس کی جانب سے کوئی چیلنج درپیش نہیں ہے، بلکہ جب مذہب اور سائنس کا باہم ٹکراؤ شروع ہوا، جس کا سرسری سا تذکرہ ان سطور کے آغاز میں

گزر چکا ہے، تب بھی چونکہ وہ مسئلہ عیسائیت کی محرف روایات کا تھا، نہ کہ اسلام کا، اس لئے مسلمان اس وقت بھی کسی ذہنی اُلجھن کا شکار نہیں ہوئے، اور جب مرکزیتِ آفتاب کا نقطہ نظر سامنے آیا، تو مسلم سائنس دانوں نے اسے زیادہ معقول اور مدلل پا کر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے قبول کر لیا، پروفیسر ایڈورڈ میک برنس لکھتے ہیں: "مسلمان ماہرین فلکیات و ریاضیات، طبیعات، کیمیا، اور طب میں نہایت باکمال عالم تھے، ارسطو کے احترام کے باوجود انہوں نے اس میں ذرا تامل نہیں کیا کہ وہ اس کے اس نظریے پر تنقید کریں کہ زمین مرکز ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے بلکہ انہوں نے اس اِمکان کو تسلیم کیا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی سورج کے گرد گردش کر رہی ہے۔" (Edward Mc Burns/ Western Civilizations/ W.W. Narton Companying Ny. p.264)۔

ذیل میں ہم چند سائنسی مظاہر اور نئی معلومات پیش کرتے ہیں جو قرآنِ حکیم کی تائید کر رہی ہے، یہ ان ہی آیات کے بارے میں ہیں، جن کا ذکر ہم ابھی ما قبل کر آئے ہیں: ۔

قرآنِ حکیم اور انسانی جنین کا ارتقا : ۔ قرآن حکیم میں انسانی جنین کے بارے میں کئی ایک مقامات پر تفصیل سے معلومات دی گئی ہیں۔ یہ وہ معلومات ہیں جو ۱۴۰۰ سو سال سے پڑھی جا رہی ہیں، مگر اس صدی میں جا کر سائنس نے بھی اس امر کی تائید کر دی ہے کہ یہ معلومات نہ صرف حرف بہ حرف درست ہیں، بلکہ چونکہ یہ معلومات اس وقت پیش کی گئی ہیں، جب یہ باتیں کسی کے علم میں نہیں تھیں، اس لئے قرآن حکیم اور اسلام کے آسمانی مذہب ہونے اور مبنی بر حق ہونے کی بین دلیل بھی ہیں، قرآن حکیم کی ایک آیت اس سے قبل (آیت نمبر ۱) پیش کی جا چکی ہے۔ (القرآن، سورہ المؤمنون، آیت ۱۴، ۱۳، ۱۲) جس میں تفصیل کے ساتھ انسانی جنین کی تشکیل کے مراحل بیان ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر کیتھ ایل مور (Khith L Moore) جینیات کے ایک معروف سائنس دان ہیں، انہوں نے ایک بار اس بارے میں اپنے ایک مقالے میں کہا: "یہ بات مجھ پر عیاں ہو چکی ہے کہ یہ بیانات (انسانی نشو و نما سے متعلق) محمد ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، کیونکہ یہ تمام معلومات چند صدیاں پہلے تک منکشف ہی نہیں ہوئی تھیں۔ اس سے یہ بات مجھ پر ثابت ہو جاتی ہے کہ (محمد ﷺ) اللہ کے پیغمبر ہیں۔ ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری، سائنسی انکشافات، دارالاشاعت، کراچی ۲۰۰۰ء، ص ۷۶)۔

انسانی جنین کی تشکیل اور ارتقا کے بارے میں سائنسی انکشافات اور توجیہات پر بہت سی کتب میں معلومات سامنے آگئی ہیں، جہاں سے یہ معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

پہاڑوں کے بارے میں قرآنی بیان:۔ پہاڑوں کے بارے مین قرآنِ حکیم کا یہ بیان گزر چکا ہے (آیت نمبر ۲) کہ ہم نے پہاڑوں کو میخیں بنایا ہے۔ اب جدید سائنس نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ پہاڑ سطح زمین کے نیچے گہری تہیں رکھتے ہیں (The Geological Concept of Movntain in the Quran. p.5) اور یہ کہ یہ پہاڑ زمین کی تہ کو مضبوطی سے جمانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سمندر اور دریاؤں کے طبعی خواص اور قرآنِ کریم:۔ سمندر اور دریا انسان کی اہم ضرورت ہیں۔ دونوں کے پانی بھی طرح طرح کے خواص رکھتے ہیں، جس میں سے ایک کی خصوصیت یہ ہے کہ بعض مقامات پر میٹھے اور کھارے پانی یکساں چلتے ہیں، مگر باہم نہیں ملتے، اس حقیقت کو قرآن نے چودہ صدیوں قبل بیان کیا تھا اور اس کا ذکر سطورِ بالا (آیت نمبر ۳) میں گزر چکا ہے۔ اب جدید سائنس نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ جہاں میٹھے اور کھارے پانی باہم ملتے ہیں، وہاں ان کے درمیان، ایک گاڑھے پانی کا حجاب ہوتا ہے جو تازہ پانی اور کھارے پانی کی پرتوں کو باہم ملنے نہیں دیتا (سائنسی انکشافات، ص ۱۵۰)۔

بادلوں اور اَولوں کے بارے میں تفصیلات اور قرآنِ کریم:۔ بادلوں اور اَولوں کے بارے میں قرآنِ حکیم نے جو بیان ذکر کیا تھا (آیت نمبر ۴) آج وہی تفصیل سائنس بیان کر رہی ہے، مثلاً سائنس دان غور و فکر اور مشاہدے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بارش کے بادل ان مراحل سے گزرتے ہیں، (1) ہوا کا بادلوں کو دھکیلنا، (2) چھوٹے بڑے بادلوں کا ملاپ، (3) بادلوں کا انبار، جب بادل اکٹھے ہو جاتے ہیں تو یہ ہوا کی حرکت سے اَنبار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہاں سے یہ فضا کے ٹھنڈے علاقوں تک پھیل جاتے ہیں۔

انسانی جلد کی حسی خصوصیات اور قرآن حکیم:۔ قرآنِ حکیم میں بیان کیا گیا ہے (آیت نمبر ۵) کہ کافروں کو جب عذاب ہو گا تو ان کی جلد تلف ہو جائے گی، اس کے بعد فوراً انہیں دوسری جلد دی جائے گی تاکہ وہ مسلسل عذاب کا مزا چکھتے رہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں جلد ہی تکلیف محسوس کرتی ہے۔ اب سائنس نے بھی یہ بات دریافت کر لی ہے کہ تمام تکالیف جلد ہی پر ہوتی ہیں، اور اعصاب جو درد کا اِدراک کرتے ہیں، وہ فقط جلد

ہی میں پائے جاتے ہیں، مثلاً اگر جسم کے کسی حصے میں سوئی چبھوائی جائے تو درد صرف جلد میں ہو گا اور سوئی کو جلد سے آگے گزار دیا جائے، تب بھی فی الواقع درد جلد تک محدود رہے گا، آگے گوشت میں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔

ان سطور میں قرآنی بیانات کی سائنس سے تائید دینے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنا یہ دعویٰ ثابت کر دیا جائے کہ سائنس کے بارے میں اسلام کا رویہ معاندانہ نہیں ہے، نہ مخالفانہ ہے، بلکہ وہ اسے زندگی کی دیگر دوسری ضرورتوں اور لوازم کی طرح باور کرتا ہے، اور جدید سائنس بھی قدم بہ قدم اس کے بیانات ہی کو آگے بڑھا رہی ہے۔ قرآن کریم میں پیش کردہ رہنمائی کو پیش نظر رکھ کر اگر سائنس قدم آگے بڑھائے، تو اس کے لئے حقائق تک جلد پہنچنا ممکن ہو گا۔ اس کی تائید ان چند بیانات سے ہوتی ہے، جس کی جھلکیاں اوپر پیش کی گئیں، وقت کی قلت اور مقالے کی محدود گنجائش کے سبب اس جانب چند اشارے ہی کئے جا سکے ہیں، مگر ان سطور کا مقصد اس سے ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔

اعترافِ حقیقت

یہ بات باشعور اور علم رکھنے والے مفکرین سے بھی پوشیدہ نہیں، بلکہ سبھی اس حقیقت کو تسلیم کر رہے ہیں کہ اسلام اور سائنس دونوں آج کی زندہ ضرورتیں ہیں، جن سے اِعراض ممکن نہیں، معروف نو مسلم فرانسیسی مصنف موریس بوکائے لکھتے ہیں: "قرآن ہمیں جہاں جدید سائنس کو ترقی دینے کی دعوت دیتا ہے، وہاں خود اس میں قدرتی حوادث سے متعلق بہت سے مشاہدات و شواہد ملتے ہیں، اور اس میں ایسی تشریحی تفصیلات موجود ہیں جو جدید سائنسی مواد سے کلی طور پر مطابقت رکھتی ہیں، یہودی، عیسائی تنزیل میں ایسی کوئی بات نہیں۔" (موریس بوکائے، بائبل، قرآن اور سائنس، ترجمہ ثناء الحق صدیقی، ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۹۹۳ئ، ص ۱۸۷)

دوسرے مقام پر مزید لکھتے ہیں: "قرآنِ کریم میں، مقدس بائبل سے کہیں زیادہ سائنسی دلچسپی کے مضامین زیر بحث آئے ہیں، بائبل میں یہ بیانات محدود تعداد میں ہیں، لیکن سائنس سے متباین ہیں۔ اس کے برخلاف قرآن میں بکثرت مضامین سائنسی نوعیت کے ہیں، اسلئے دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں، موئخر الذکر (قرآن) میں کوئی بیان بھی ایسا نہیں، جو سائنسی نقطہ نظر سے متصادم ہوتا ہو۔ یہ وہ بنیادی حقیقت ہے، جو ہمارے جائزہ لینے سے اُبھر کر سامنے آتی ہے۔" (۳۳۔ ایضاً، ص ۲۱)

اور ڈاکٹر کیتھ مور جن کا اس سے قبل بھی ایک بیان گزر چکا ہے، ان کا ایک اور بیان ملاحظہ کیجئے: ۔"۱۳ سو سالہ قدیم قرآن میں جنینی ارتقا کے بارے میں اس قدر درست بیانات موجود ہیں کہ مسلمان معقول طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اُتاری ہوئی آیتیں ہیں" (ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری، قرآن، سائنس اور تہذیب و تمدن، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۹۹ئ، ص ۶)۔

سائنسی علوم کا فروغ

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالی نے انسانیت کو وہ ضابطہ حیات عطا فرمایا جو بنی نوع انسان کو فلاح دارین کا راستہ عطا کرتا ہے۔ لہٰذا جہاں وہ اُخروی زندگی میں فلاح و نجات کی تدبیریں سکھاتا ہے وہیں انہیں اپنی دنیوی زندگی کو بنانے، سنوارنے کی بھی تعلیم دیتا ہے کیونکہ اسلامی تصور زندگی میں ان دونوں زندگیوں میں کوئی منافاۃ یا تضاد نہیں بلکہ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے" (عسقلانی، فتح الباری، 11: 230 ۔) اور دنیوی زندگی کی اصلاح و ترقی "تمتع بالکائنات" کا دوسرا نام ہے جس کی قرآن بار بار ہدایت کرتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا. البقرة، 2: 29 ۔

"وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا" ۔

اسی تسخیر کائنات کے حکم خداوندی کی بجا آوری کا جذبہ اسلامی فکر میں مختلف علوم و فنون کے پیدا ہونے کا سب سے قوی عامل ہے۔ یہی نہیں بلکہ قرآن تفصیل کے ساتھ فطرت کے مختلف مظاہر کے مطالعہ کی تاکید کرتا ہے۔ تمام علوم طبیعی کا سنگ بنیاد مطالعہ فطرت ہے اور قرآن حکیم بار بار اس پر زور دیتا ہے۔ وہ ایجابی طور پر اپنے متبعین کو مامور کرتا ہے کہ وہ مظاہر کائنات کا مشاہدہ کریں، کیوں کہ ان میں سوچنے اور سمجھنے والوں کی رہنمائی کے لیے نشانیاں ظاہر ہیں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَo یونس، 10: 101 ۔

”فرمادیجئے: تم لوگ دیکھو تو (سہی) آسمانوں اور زمین (کی اس وسیع کائنات) میں قدرتِ الٰہیہ کی کیا کیا نشانیاں ہیں، اور (یہ) نشانیاں اور (عذابِ الٰہی سے) ڈرانے والے (پیغمبر) ایسے لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے جو ایمان لانا ہی نہیں چاہتےo“ ۔

یہی نہیں بلکہ وہ اس فریضے سے پہلو تہی کرنے والوں کو زجر و توبیخ کرتا ہے: ۔

أَوَلَمْ يَنظُرُواْ فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّهُ مِن شَيْءٍ وَأَنْ عَسَى أَن يَكُونَ قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ.الأعراف، 7: 185 ۔

”کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں اور (علاوہ ان کے) جو کوئی چیز بھی اللہ نے پیدا فرمائی ہے (اس میں) نگاہ نہیں ڈالی (اور غور نہیں کیا) اور اس میں کہ کیا عجب ہے ان کی مدت (موت) قریب آچکی ہو، پھر اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گےo“ ۔

اسلام کے نظریہ حیات میں تکمیل ایمان ”**ایمان بالآخرۃ**“ پر موقوف ہے اور اس کے حاصل کرنے کے لیے تخلیقِ کائنات کا مطالعہ اور اس مطالعے کے لیے سیر و سیاحت ضروری ہے۔ قرآن کہتا ہے: ۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ.العنکبوت، 29: 20 ۔

”فرمادیجئے: تم زمین میں (کائناتی زندگی کے مطالعہ کے لئے) چلو پھرو، پھر دیکھو (یعنی غور و تحقیق کرو) کہ اس نے مخلوق کی (زندگی کی) ابتداء کیسے فرمائی پھر وہ دوسری زندگی کو کس طرح اٹھا کر (ارتقاء کے مراحل سے گزارتا ہوا) نشو و نما دیتا ہے۔ بیشک اللہ ہر شے پر بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔“ اور اس فریضے کی بجا آوری میں کوتاہی کرنے والوں سے وہ باز پرس کرتا ہے: ۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهُ انَّ ذٰلِکَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌoالعنکبوت،29: 19 ۔

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا (یعنی غور نہیں کیا) کہ اللہ کس طرح تخلیق کی ابتداء فرماتا ہے پھر (اسی طرح) اس کا اعادہ فرماتا ہے۔ بیشک یہ (کام) اللہ پر آسان ہےo“ ۔

اس لیے قرآن خصوصیت سے اجرام فلکی کے مشاہدے کی ترغیب دیتا ہے کیونکہ یہ مطالعہ انسان ہی کے فائدے کے لیے ہے: ۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُواْ عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّهُ ذَلِكَ إِلاَّ بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ. یونس،10: 5 ۔

"وہی ہے جس نے سورج کو روشنی (کا منبع) بنایا اور چاند کو (اس سے) روشن (کیا) اور اس کے لئے (کم و بیش دکھائی دینے کی) منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور (اوقات کا) حساب معلوم کر سکو اور اللہ نے یہ (سب کچھ) نہیں پیدا فرمایا مگر درست تدبیر کے ساتھ، وہ (ان کائناتی حقیقتوں کے ذریعے اپنی خالقیت، وحدانیت اور قدرت کی) نشانیاں ان لوگوں کے لئے تفصیل سے واضح فرماتا ہے جو علم رکھتے ہیںo" چنانچہ جب آیت کریمہ **اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِo"** ۔

بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب و روز کی گردش میں عقلِ سلیم والوں کے لئے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیںo"-کا نزول ہوا تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ۔

ویل لمن لاکھا بین لحیتیه ولم یتفکر فیه. آل عمران،3: 190 ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم،1: 441 "تباہی ہے اس کے لیے جو اس آیت کریمہ کی منہ سے تلاوت کرتا ہے مگر اس کے معانی و مفہوم پر غور نہیں کرتا" ۔

اور یہ رجحان علمائے دین میں آخر تک قائم رہا، چنانچہ امام غزالی کا ارشاد ہے: ۔

من لم یعرف الهیئة والتشریح فهو عنین فی معرفة الله تعالٰی. (امام الدین الریاضی، التصریح فی شرح التشریح: 20)۔

"جو شخص علم الہیئت اور علم التشریح نہیں جانتا وہ معرفتِ باری تعالیٰ میں ناقص ہے" ۔

امام غزالی کے معاصر مقدم حکیم ابوالحسن الزبیری تھے جو مشہور فلسفی عمر خیام کے استاد تھے۔ ایک دن وہ عمر خیام کو ہیئت کی مشہور کتاب "المجسطی" پڑھا رہے تھے۔ ایک فقیہ وہاں سے گزرے اور استاد سے پوچھا: کیا پڑھا رہے ہو؟ حکیم ابوالحسن نے جواب دیا: آیہ کریمہ **اَفَلَمْ يَنْظُرُوا اِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُم كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ** کی تفسیر بیان کر رہا ہوں (سورہ ق،50: 6) ۔

لہٰذا انسان کو "تمتع بالکائنات" کے ساتھ اس عملِ الٰہی پر بھی نظر رکھنی چاہیے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ۔

فَلْيَنْظُرِ الإِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهِo عبس،80: 24 "پس انسان کو چاہیے کہ اپنی غذا کی طرف دیکھے (اور غور کرے)o" ۔

وہ مظاہر کائنات کے ساتھ حیاتِ حیوانی کے مطالعے پر بھی زور دیتا ہے کیونکہ یہی اسلام کے مقصد بعثت کی تکمیل کا صحیح راستہ ہے اور اسی کی مدد سے ایمان تک رسائی ہوتی ہے۔ **اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْo** الغاشیہ،88: 17 ۔

"(منکرین تعجب کرتے ہیں کہ جنت میں یہ سب کچھ کیسے بن جائے گا تو) کیا یہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح (عجیب ساخت پر) بنایا گیا ہے؟" اسی طرح وہ تاریخ طبیعی (Natural History) اور حیوانیات (Zoology) کے مطالعے پر آمادہ کرتا ہے: ۔

وَاللهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهِ ج وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ج وَمِنْهُمْ مَّن يَّمْشِيْ عَلٰى اَرْبَعٍ يَخْلُقُ اللهُ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌo النور،24: 45۔

"اور اللہ نے ہر چلنے پھرنے والے (جاندار) کی پیدائش (کی کیمیائی ابتداء) پانی سے فرمائی، پھر ان میں سے بعض وہ ہوئے جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں اور ان میں سے بعض وہ ہوئے جو دو پاؤں پر چلتے ہیں، اور ان میں سے بعض وہ ہوئے جو چار (پیروں) پر چلتے ہیں، اللہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا رہتا ہے، بیشک اللہ ہر چیز پر بڑا قادر ہےo" ۔

ایک اور مقام پر وہ حیوانات کے عضویاتی (Physiological) مطالعے کی ہمت افزائی کرتا ہے: ۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِمَّا فِى بُطُوْنِهِ مِنْ م بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشَّارِبِيْنَo النحل،16: 66 ۔

''اور بیشک تمہارے لئے مویشیوں میں (بھی) مقامِ غور ہے، ہم ان کے جسموں کے اندر کی اس چیز سے جو آنتوں کے (بعض) مشمولات اور خون کے اختلاط سے (وجود میں آتی ہے) خالص دودھ نکال کر تمہیں پلاتے ہیں (جو) پینے والوں کے لئے فرحت بخش ہوتا ہےo''۔

دوسری جگہ وہ اڑنے والی مخلوق کے تحقیقی مطالعہ کی ترغیب دیتا ہے:۔

اَوَلَمْ يَرَوا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيْرٌo الملک، 67: 19 ۔

''کیا اُنہوں نے پرندوں کو اپنے اُوپر پر پھیلائے ہوئے اور (کبھی) پر سمیٹے ہوئے نہیں دیکھا؟ اُنہیں (فضا میں گرنے سے) کوئی نہیں روک سکتا سوائے رحمان کے (بنائے ہوئے قانون کے)، بے شک وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہےo'' ۔

طبیعی علوم کے ساتھ قرآن عقلی علوم کی تحصیل کا بھی حکم دیتا ہے اور علم کلام اور مناظرہ و مباحثہ کی رغبت دلاتا ہے: ۔

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ. النحل، 16: 125 ۔

''اور اُن سے بحث (بھی) ایسے انداز سے کیجئے جو نہایت حسین ہو'' ۔

فلسفے کے لیے وہ ''حکمت'' کو زندگی کی قدر اعلیٰ (خیر کثیر) کا مصداق بتاتا ہے: ۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِo البقرہ، 2: 269 ۔

''اور جسے (حکمت و) دانائی عطا کی گئی اسے بہت بڑی بھلائی نصیب ہو گئی اور صرف وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو صاحبِ عقل و دانش ہیںo''۔

تجرباتی سائنس کا آغاز

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت عیسائیت، رہبانیت کی اور افلاطونیت عیش و عشرت کی تعلیم دے رہی تھی۔ اگر یہ دونوں رجحان اسی طرح پنپتے رہتے تو سائنس اور علم کا خاتمہ ہو جاتا۔ لیکن اسلام نے ان رجحانات کی سمت تبدیل کر دی اور حصولِ علم اور انسانی قوتِ مشاہدہ کو

بروئے کار لانے پر زور دیتے ہوئے موجودہ تجرباتی سائنس کی بنیاد رکھی۔ مناظرِ فطرت کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی اور اولادِ آدم کو بیرونی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں تلاش کرنے کی طرف راغب کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَo البقرة، 2 : 164 ۔

''بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کی گردش میں اور ان جہازوں (اور کشتیوں) میں جو سمندر میں لوگوں کو نفع پہنچانے والی چیزیں اٹھا کر چلتی ہیں اور اس (بارش) کے پانی میں جسے اللہ آسمان کی طرف سے اتارتا ہے پھر اس کے ذریعے زمین کو مُردہ ہو جانے کے بعد زندہ کرتا ہے (وہ زمین) جس میں اس نے ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے ہیں اور ہواؤں کے رُخ بدلنے میں اور اس بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان (حکمِ الٰہی کا) پابند (ہو کر چلتا) ہے (ان میں) عقلمندوں کے لئے (قدرتِ الٰہی کی بہت سی) نشانیاں ہیں'' ۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سائنس سمیت ہر قسم کے علوم وفنون کے حصول پر زور دیتے ہوئے فرمایا: ۔

الحكمة ضالة المؤمن فحيث وجدها فهو أحق بها. (ترمذی، السنن، کتاب العلم، باب ماجاء في فضل الفقه علی العبادة، 5 : 51، رقم: 2687)۔

''حکمت (یعنی علم) مومن کی گم شدہ میراث ہے جہاں اسے پائے وہ اس کا دوسروں کی نسبت زیادہ حق دار ہے'' ۔

طلب العلم فريضة على كل مسلم. (ابن ماجہ، السنن، المقدمۃ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، 1 : 81، رقم: 2024)۔

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے۔'' ان حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نے جدید سائنس اور انقلابات پر کس طرح گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

خلاصہ بحث

سائنس اور مذہب کے باہمی تعلقات اور ان کے مابین مفاہمت کے بارے میں درج بالا بیانات اور سطور پر غور و فکر کرنے سے انسان دو باتیں بہت سہولت کے ساتھ اَخذ کر سکتا ہے۔ ایک یہ کہ انسان کسی بھی ذریعے سے کائنات اور اس کی اشیا کے بارے میں وہ باتیں نہ جان سکا تھا، جو قرآنِ مجید نے بتائی ہیں۔ دوسری بات یہ اَخذ کی جاسکتی ہے کہ اس کائنات کی مادّی دنیا میں جو کچھ اب تک ہو چکا ہے، جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے، وہ صرف خدا کے حکم سے ہو رہا ہے اور اس کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا، بہ الفاظ دیگر ہر کام میں علت (Cause) اور معلول (Effect) کے علاوہ غایت (Purpose) بھی لازماً کار فرما ہے، اور کائنات کی ہر شئے اور اس کا ہر قدم اسی سہ رکنی عمل کا نتیجہ ہے (حفیظ الرحمن صدیقی: ص ۳۹)۔

اس لئے ہمیں باہمی مشترک قدروں کو اَپناتے ہوئے اور تمام مادّی وسائل بروئے کار لاتے ہوئے، انسانی زندگی کے دونوں اہم پہلوؤں اور انسانی زندگی کی دونوں اہم ضرورتوں کو، ان کی ضرورت، حق اور حیثیت کے مطابق ان کا حق دینا ہو گا۔ نہ تو مذہب کے فرضی اور دیومالائی مفروضات اختیار کر کے ہم سائنس سے دور رہ سکتے ہیں، نہ سائنس کو خدا کا درجہ دے کر خالق حقیقی سے اپنی زندگیوں کو خالی رکھ سکتے ہیں اور اگر بالفرض ایسا کریں گے بھی تو کامیابی کی راہ سے دور ہوتے چلے جائیں گے اور فلاح کی جگہ ناکامی ہمارا مقدر بنے گی۔

۔14۔حوالہ جاتی کتب

1. القرآن الکریم
2. الخیر الکثیر فی مقدمۃ التفسیر
3. صحیح بخاری
4. مسند احمد
5. الکتابي
6. تدوینِ قرآن
7. الاتقان في علوم القرآن
8. فتح الباری
9. مناہل العرفان
10. تاریخ القرآن
11. علوم القرآن
12. جامع البيان في تأويل القرآن
13. الإنصاف في بيان أسباب
32. خلق افعال العباد
33. سنن ابوداؤد
34. صحاح
35. مصطلح الحدیث
36. جامع ترمذی
37. صحیح مسلم
38. سنن ابن ماجہ
39. مسند شافعی
40. صحیفہ ہمام بن منبہ
41. سنن دارمی
42. الطبقات الکبری
43.غاية المريد شرح كتاب التوحيد
44.مشکوٰۃ المصابیح
64. فواتح الرحموت
65. البحر الرائق
66. مقدمہ ابن خلدون
67. شامی
68. تذکرۃ الفنون
69. نظام الحکومۃ النبویہ
70. فقہ اسلامی اصول، خدمات اور تقاضے
71. امام ابوحنیفہؒ عہد وحیات
72. تاریخ علم فقہ
73. الانتقاء
74. الخیرات الحسان
75. مناقب ابوحنیفہ

الاختلاف	**45.المعجم الكبير**	76. تذکرۃ الفنون
14. المستدرک علی الصحیحین	46. تاریخ طبری	77. مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم
15. فیض القدیر شرح جامع الصغیر	47. البدایہ والنہایہ	78. فقہ اسلامی
16. شرح معاني الآثار	48. سیرۃ المصطفیٰ	79. تدوین قانونِ اسلامی
17. کنز العمال	49. سیرت ابن ہشام	80. نقشِ دوام
18. مجمع الزوائد	50. مناقب شہر آشوب	81. تہذیب الکمال
19. الفردوس بمأثور الخطاب	51. عہد نبوی میں نظام حکمرانی	82. اخبار ابی حنیفہ واصحابہ
20. الترغیب والترھیب	52. الطبقات الکبریٰ	83. ردُ المختار علی الدر المختار
21. الجامع لأحکام القرآن	53. طبقات ابن سعد	84. اسلامی قانون کی تدوین
22. المفردات في غریب القرآن	54. موطا امام مالک	85. شعب الایمان
23. تاج العروس	55. الرحیق المختوم	86. مصنف عبد الرزاق
24. النھایۃ	56. زاد المعاد	87. اسلام اور عصر حاضر
25. أحکام القرآن	57. حضرت ابو بکر صدیق	88. سائنس اور مذہب میں مفاہمت
26. قرآن، سائنس اور تہذیب وتمدن	58. تاریخ مشائخ نقشبندیہ	89. The Evidence of God
27. The Geological	59. سیرۃ خلیفۃ الرسول سیدنا حضرت	90. The Impact of Science

Concept of Movntain in the Quran 28. قرآن اور سائنس 29. معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ 30. لسان العرب 31. تحفۃ الالمعی	ابو بکر صدیق 60. سیرت سیدنا حضرت ابو بکر صدیق 61. اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ 62. سائنسی انکشافات 63. المنثور	on Society 91. مغرب کا سائنسی و نفسیاتی زاویۂ فکر 92. The Turning Poing